اسلام کا پیغام
بھارت کے
مسلمانوں کے نام

(اندھیرے سے اجالے کی طرف ایک پرعزم پیش قدمی)

عہد حاضر کے حالات اور مسائل کی روشنی میں
اسلام اور سیرت رسولؐ کا ایک معروضی اور اطلاقی مطالعہ

ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب	:	اسلام کا پیغام بھارت کے مسلمانوں کے نام
مصنف	:	ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین
اشاعت	:	2022
تعداد	:	500
صفحات	:	۴۱۶
قیمت	:	450 روپے
کمپوزنگ	:	محمد آصف اقبال قاسمی زکریا کالونی، مظفر پور
پبلیشر	:	بلیسنگ ہاؤس پبلی کیشنز
پریس	:	اچ۔اس۔ پرنٹرس غازی آباد، یوپی

BLESSING HOUSE PUBLICATIONE

Blessing Kanal Lane Azad Road

Chandwara Muzaffarpur 842001

Email: dr.abuzarkamaluddin@gmail.com

Website: abuzarkamaluddin.com

Mobile: 9934700848

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

۳۰۷۔ دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی۔110025

اردو بک ریویو

1739/3 (ذیلی منزل) نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی

فہرست مضامین

باب سوم ۳۶۵

سانحہ کربلا: ایک مطالعہ ۳۶۵

بسم الله الرحمن الرحیم

حرف آغاز

ملک کے ایک مشہور دانش ور، تاریخ داں اور ہندی کے مہان کوی جن کو راشٹر کوی کا خطاب حاصل ہے رام دھاری سنگھ دنکر اپنی مشہور کتاب ''سنسکرتی کے چار ادھیائے (1956) میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بارے میں چند اہم باتیں کہیں ہیں جو قابل توجہ ہیں۔انہوں نے مانو یندر ناتھ رائے کے حوالے سے لکھا ہے کہ'' دنیا کی کوئی بھی قوم اسلام کی تاریخ سے اتنی ناواقف نہیں ہے جتنے ہندو ہیں اور دنیا کی کوئی بھی قوم اسلام کو اتنی نفرت کی نظر سے بھی نہیں دیکھتی جتنی نفرت سے ہندو دیکھتے ہیں۔''

دنکر آگے لکھتے ہیں کہ ام۔ان۔رائے نے جو بات لکھی ہے'' وہ ایک حد تک بھارت کے مسلمانوں پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ اس دیش کے مسلمانوں میں بھی اسلام کی بنیادی فطرت، خوبی اور اس کی تاریخی اہمیت کا علم بہت سطحی ہے۔

تیسری اہم بات جس کی طرف دنکر نے توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ'' ہندو اسلام کے اسی روپ کو جانتے ہیں جس سے انہیں پالا پڑا ہے۔ وہ اسلام کی ان خوبیوں سے بہت کم متعارف ہیں جن وجوہات کی بنا پر یہ دین انقلابی سمجھا جاتا تھا۔لیکن بھارت کے مسلمانوں کی ناواقفیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔'' ص۱۹۹)

اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں ہر دو جانب غلط فہمی اور تعصب کی دبیز چادر پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے دونوں ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو نہ تو ٹھیک سے دیکھ پارہے ہیں اور نہ سمجھ پارہے ہیں۔

وقت کی سیاست نے ان دونوں کے درمیان ایسی چوڑی اور گہری کھائی کھود رکھی ہے جن کو عبور کر پانا دونوں کے لئے مشکل ہو رہا ہے ۔ لہذا معلومات کی فروانی Information (boom) کے باوجود دونوں قومیں ایک دوسرے سے اس طرح ناواقف ہیں اور اس قدر غلط فہمیوں کی شکار ہیں جیسے ایک چین کا باشندہ وا اور دوسرا اسائبیریا کی برفیلی وادیوں کا رہنے والا ہے۔

اس بے حد معلوماتی دور میں جہاں کسی بھی چیز کی معلومات بہت آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ دونوں قوموں کے درمیان جو ذہنی دوری ہے اس کے سبب دونوں کے اندر ژولیدہ ذہنی تضاد، غلط معلومات، غلط تصورات، غلط ترسیل اور تجاہل عارفانہ کی وجہ سے تعصب اور تنگ نظری نے چین کی موٹی اور لمبی دیوار کھڑی کردی ہے کہ کوئی ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ایماندارانہ کوشش کرنے کے لئے تیار نہیں ہے دونوں طرف ایک دوسرے کو مکروہ اور سیاہ رنگ میں رنگ کر حظ اٹھانے کا جذبہ اس قدر شدید ہے کہ وہ اس کی تباہکاریوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہیں۔

ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا فطری گھر ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی فطری مسکن ہے اب یہ ہمالیہ، وندھیاچل،، گنگا، جمنا اور سرسوتی کی طرح ہندوستان کی پہچان اور اس کی اٹوٹ اکائی ہے۔ دونوں کو اسی ملک، اسی ماحول اور سماج میں رہنا ہے۔ اس لئے دونوں کی بھلائی اس میں ہے کہ اپنی ماضی کی غلطیوں سے سبق لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائی اور دوست کی طرح رہنا سیکھیں۔ یہ دونوں کے حق میں اور اس سے زیادہ ملک کے حق میں ہے اور بھارت کی ترقی اور عالمی برادری میں سربلندی کے لئے لازمی ہے۔

مجھے نہیں معلوم لوگ میری ان باتوں پر کتنا توجہ دیں گے لیکن میری نظر میں یہ ہندو اور مسلمان نیز بھارت کی ترقی، بقا اور استحکام کے لئے لازمی قدم ہوگا۔ بلی کے خطرے سے بچنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ گھنٹی باندھے گا کون۔؟ خطرہ چاہے جتنا بڑا ہو لیکن علاج یہی ہے تو لامحالہ یہ پہل مسلمانوں کو کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی عددی قوت کی وجہ سے اس کی بہت زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اس کو لگتا ہے اقلیت کے اندر ڈر پیدا کر کے اور ان کے اندر گھیٹو منٹیلیٹی پیدا کر کے اور ان کو مین اسٹریم سے الگ رکھ کر نفسیاتی طور پر اتنا ڈیمولرائز کر دیا جائے کہ وہ سماج میں بالکل اچھوت بن کر رہ جائیں اس کو کئی مین اسٹریم پولیٹیکل پارٹیوں نے اپنے مخصوص ایجنڈا کے طور پر اپنانا بھی شروع کر دیا ہے ایسی صورت میں افہام وتفہیم کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے تو یہ خودکشی ہوگی۔ لوگ ہم سے کٹ سکتے ہیں لیکن ہم لوگوں سے نہیں کٹ سکتے۔ ہمیں تو جڑنا ہے اور جڑ کر رہنا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مقالات کا بنیادی مقصد ان ٹوٹی کڑیوں کو جوڑ کر ترسیل افکار کے

ذریعہ ایک رابطہ پیدا کرنا ہے۔ یہ مقالات ہندی، انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے بجائے اردو میں لکھنے کی بنیادی غرض یہ ہے کہ پورے نارتھ ویسٹ اور ساوتھ انڈیا میں اردو کی بڑی آبادی رہتی ہے ان کو عصری تناظر میں اسلام کے نظری اور اطلاقی پہلوؤں سے واقف کرا کر ایک تعمیری گفتگو کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔

ان مقالات کا مرکزی موضوع اسلام، ہندوستان اور مسلمان ہے یعنی موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سوچنے کا نہج کیا ہونا چاہئے اور اپنی تعمیر و اصلاح کن خطوط پر کرنی چاہئے۔ اسلام ہے کیا۔ اس کے تعارف کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور موجودہ ماحول، حالات اور مسائل کو سمجھتے ہوئے ہمیں کیا نقطہ نظر اور طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ان مقالات کی زبان سادہ، استدلالی اور استفہامی ہے اور طریق گفتگو منطقی اور تجزیاتی ہے۔ اس کا مقصد ترسیل ہے نہ تو کسی کو قائل کرنا یا کسی پر اپنی بات تھوپنا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ان مقالات کے مطالعہ سے ایک مثبت فکر پیدا ہوگی جو قاری کو ان امور پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دے گی اور افہام و تفہیم کا ایک ماحول پیدا ہوگا۔

ہماری سماجی اور سیاسی تاریخ بہت سی محرفات اور مکدرات سے پُر ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اسلام کے اصلی ماخذ یعنی قرآن و سنت پوری طرح مامون و محفوظ ہیں جس کے ذریعہ ہم اپنی تاریخ اور معاشرت میں کہاں، کب۔ کیسے اور کس کے ذریعہ کیا انحراف ہوا اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اگر اصلاح کی سچی طلب ہو تو اپنے ماخذ اور مصدر سے رجوع کر کے اپنی حقیقت اور اصلیت جان سکتے ہیں۔

اسلام ایک عالمی دین ہے اور مسلمان ایک عالمی امت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں یکسانیت اور امتزاج پایا جاتا ہے بلکہ چونکہ اس میں دنیا بھر کی نسلوں اور قوموں کا اشتراک رہا ہے اس لئے اس میں تنوع اور تضاد فطری ہے کیونکہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مخلوط امت ہے جس کو عقیدے کے ڈور نے باندھ رکھا ہے۔ اس لئے مسلمان سماج کو یک رنگ سمجھنا ایک غلط نظریہ ہے جس نے بہت سی غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ صحیح ہے ان کا مرجع ایک ہے اور ان کے اندر فکر و عقیدے کی بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے مگر نسلی، لونی، لسانی اور جغرافیائی اعتبار سے یہ اس طرح بٹے ہوئے ہیں جیسے دنیا کی اور قومیں ہیں۔ اس طرح عالمی امت

مسلمہ کا تصور ایک سراب ہے جس کا حقیقی دنیا اور حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ یہ کل تھا اور نہ آج ہے۔ ہر ملک اور قوم الگ شناخت رکھتی ہے اور ہم عقیدہ اور ہم مسلک ہونے کے باوجود ایک مخصوص جغرافیائی حدود کی وجہ سے اسی خطہ سے معنون اور منسوب مانی جاتی ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس اصول عام سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

مسلمانوں نے اپنی طویل تاریخ حکمرانی میں جہاں کچھ اچھی مثالیں اور نادر نمونے پیش کئے ہیں وہیں ان کی تاریخ و معاشرت ایسے واقعات اور حادثات سے بھی داغدار ہے جو شرمناک اور افسوسناک ہیں۔ اقتدار کی منطق الگ ہوتی ہے اور زوال و پستی کا فلسفہ الگ ہوتا ہے جب کوئی حکمراں بغیر کسی تاریخی شعور کے اپنے رویہ کا تعین کرتا ہے تو اس کے اندر بے اعتدالی اور ظلم کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ غلبہ اور اقتدار اسے وقتی نفع نقصان سے آگے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی اور وہ غلط سمت میں سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ ہم نے ماضی بعید اور ماضی قریب میں کئی مثالیں دیکھی ہیں جس کے برے نتائج و عواقب سے اس وقت ہم دوچار ہیں۔

ظاہر سی بات ہے وہ ہماری تاریخ و معاشرت ہے۔ نہ ہم اس سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اس سے بھاگ کر کہیں اور جا سکتے ہیں ہمارے لئے صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اصل کی طرف مراجعت کریں اور ایک نئے عزم کے ساتھ ایک نیا سفر شروع کریں۔

اس مجموعہ میں شامل مقالات اسی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ اس وقت ملک وملت کے حالات بہت نازک اور سخت ہیں۔ فسطائیت ملک کی جمہوریت کو نگلنے کے لئے تیار بیٹھی ہے کمزوروں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کئے جارہے ہیں۔ نفرت آمیز جھوٹے پروپیگنڈے کا بازار گرم ہے ملک کی تمام اقلیتیں بالخصوص مسلمان شدید نفسیاتی دباؤ میں ہیں۔ ان کی تاریخ کے کردہ ناکردہ گناہوں کا حساب موجودہ نسل سے سود در سود وصولنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ملک کی آزادی کا سورج ستر سال پہلے طلوع ہو چکا ہے مگر مسلمانوں کو اب بھی ان کے حصے کی روشنی سے محروم رکھا جارہا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا صحیح طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔؟ میرے خیال سے انہیں اپنی نظریاتی اساس کا صحیح علم ہونا ضروری ہے۔ پھر اس سے جڑنے اور اس پر جمنے کی ضرورت ہے

اوراپنی نفس اورمعاشرے کی اصلاح کرتے ہوئے لارجر کمیونیٹی سے افہام وتفہیم کے ساتھ ربط وتعاون پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔خوف کی نفسیات ، انفعالیت ،مایوسی ،عدم ربطگی وگوشہ نشینی اوراحساس کمتری پیدا کرتی ہے جس سے زوال ذہنی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے اورایک فردوقوم ایک ایسے چکرویوہ(vicious circle.) میں گرفتار ہوجاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتا ہے۔اس وقت ہندوستان کے مسلمان سماج کا ذرا قریب سے جائزہ لیاجائے تو آپ کو یہ ساری کیفیت نمایاں طور پر نظر آئے گی۔

قرآن نے کہا فتنہ قتل سے شدید تر ہے اسی طرح مایوسی موت سے بدتر ہے۔یہ وقت مایوس ہونے کا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام تر ٹوٹے پھوٹے وسائل کو جوڑ کر ایک مثبت اوررجائی فکر کے ساتھ جہد وعمل کا ہے۔ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ سب ہم کھوچکے ہیں۔اب ہمارے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں ہے اور پانے کو ایک جہان ہے۔ہم اس خوف اورکم ہمتی سے باہر نکلیں اوراپنی نسلوں کی تعلیم ،اخلاقی ،تربیت پر زور دیں اوران کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کا اہتمام کریں اوراپنے اندر ایسی اہلیت اوراستعداد پیدا کریں جس کی دنیا کو اس وقت ضرورت ہے تاکہ دنیا کو ہماری افادیت واہمیت کا اندازہ ہوسکے اوردنیا ہماری طرف احسان مندی کے جذبے سے رجوع کرے۔ ہمارے پاس جو نرم قوت (soft power) ہے اس کو فروغ دیں۔اگر کالی رات مسلط ہے تو چند گھنٹوں میں سحر ضرور ہوگی،اس لئے اس وقت ماتم کرنے اوردوسروں کو کوسنے میں نہ گذاریں بلکہ اپنے اندر کی جوہری صلاحیتوں کو ابھارنے پر صرف کریں۔قومیں اس طرح اپنی بگڑی سنوارتی ہیں۔یہ دنیا آزمائش اورعمل کی جگہ ہے اورمسابقت للخیر کے لئے ہروقت ہاتف غیب آواز لگا رہا ہے۔

اس مجموعہ میں کل چودہ مقالات ہیں جنہیں آسانی کی غرض سے تین ابواب میں منقسم کیا گیا ہے پہلے باب میں پانچ مضامین ہیں۔چار مضامین میں بھارت میں اسلام کے مثبت رول ۔اس کی دعوت شہادت اورمعتقدات سے بحث کی گئی ہے۔اس حصہ میں عقیدۂ آخرت کا قرآن کی روشنی میں ایک مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔یہ حصہ اسلام کے نظریات کو سمجھنے میں مفید ہوگا۔دوسرے باب میں کل چھ مقالات ہیں اور یہ سارے مقالات سیرت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں سیرت رسوؐل فکروعمل کا ایک لافانی مخزن ہے۔حضور کا اسوہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔یہ ہر جگہ

ہر حال میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔بس ضرورت ہے رسولؐ سے چمٹ جانے کی۔آپؐ کی محبت اور اطاعت کو اپنی زندگی کا چلن بنانے کی ہماری ساری مشکل آسان ہوجائے گی۔ ہماری دنیا بھی سنور جائے گی اور ہماری آخرت بھی۔حضور کی سیرت ہم کو مایوسی سے نکلنے کا راستہ بھی دکھائے گی اور ہمارے اندر چھپی ہوئی جوہری صلاحیتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بھی بنے گی۔اس باب میں جو مطالعات سیرت کے حوالے سے پیش کئے گئے ہیں اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ ایک اطلاقی مطالعہ (Applied study) ہے جس کا ہمارے ملک اور ماحول سے سیدھا تعلق ہے لہذا یہ ہماری صحیح سمت میں رہنمائی کرتی ہے۔باب سوم میں کل تین مقالات ہیں جن میں پہلا مقالہ سانحہ کربلا کا ایک مطالعہ ہے جس میں اس سانحہ کا پیش منظر اور پس منظر پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو ہمارے لئے عبرت آموز تو ہے ہی ساتھ ہی سبق آموز بھی ہے۔ایک بات اچھی طرح جانئے امام حسین کی شہادت تو ہوگئی ہے مگر کربلا کی جنگ باقی ہے اور یہ جنگ ہمیں بیرونی نہیں اندرونی محاذ پر لڑنی ہوگی۔دوسرے مقالہ میں ہندو قوم کے سماجی روایات ونفسیات سے بحث کی گئی ہے۔یہ ایک معلوماتی مضمون ہے جس سے ہندو سماج روایات ونفسیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔اور تیسرے مختصر مقالے میں مسلم معاشرے میں ترسیل کے جو ذرائع مہیا ہیں اس کا کس طرح بہتر استعمال کر کے ہم عام لوگوں میں اسلام کی صحیح معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں اس پر زور دیا گیا ہے۔

ان مقالات کا وقفہ اوقات (Time period) چار دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ان چار دہائیوں میں لیل ونہار کی نہ معلوم کتنی گردشیں ہوچکی ہیں۔مگر ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک مقام پر ٹھہر سے گئے ہیں اس لئے ہم اور ہمارے آس پاس کا منظر نامہ جیسا تھا ابھی بھی ویسا ہی ہے بلکہ تغیر حالات نے اس میں ابتری ہی پیدا کی ہے۔ہمارے ہاتھ میں اعتماد کے ساتھ سعی وعمل کا ایک نسخہ کیمیا ہے جس سے ہماری بگڑی سنور سکتی ہے۔تو پھر انتظار کس بات کی ہے۔آیئے کوشش شروع کرتے ہیں اور اللہ سے اچھی امید رکھتے ہیں۔ہمیں ابھی ایک آزمائش کی دریا سے گذرنا ہے۔دریا کے اس پار فتح ونصرت ہمارا انتظا کر رہی ہے۔خدا کا نام لیجئے اور آگے بڑھئے۔ان مقالات کا ماحصل یہی ہے۔اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے اور ملت کے سوچنے سمجھنے والے نوجوان کو ہمت وحوصلہ دے کہ وہ آگے آئیں اور وقت کی زمام تھام کر چلنے کے لئے تیار ہوجائیں۔

تصنیف وتالیف کا کام بہت جانکاہی ، دقت طلب اور گہرے غور ومطالعہ کا متقاضی ہوتا ہے جس کے لئے اپنی بہت سی مصروفیات اور دیگر کاموں کو تجنا پڑتا ہے۔انسان ایک سماجی مخلوق ہے لہذا گھر ،دفتر اورسماج سب کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں لیکن مطالعہ وتصنیف قربانی کا طالب ہوتا ہے جس میں گھر والوں کا تعاون بہت ضروری ہے ورنہ کوئی علمی کام کرنا ممکن نہیں ہوگا۔سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے یہ موقع ،صحت اور صلاحیت بخشی کے میں اس کام کو کرسکا ۔ اس کے بعد میں اپنی اہلیہ محترمہ راشدہ ناہید (ایم۔اے ۔بی ایڈ) کا شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ رکھا جس کی وجہ سے میں اپنا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گذارتا ہوں۔میں اپنے بیٹے خالد کمال رومی (ام۔بی۔اے۔آئی۔آئی۔ام) اور اپنی پیاری سی بہو سیدہ ذوفشاں زریں ظفیر (ام۔بی۔اے۔آئی۔آئی۔ام) اور اپنی پیاری بیٹی ڈاکٹر ایمن کمال (ام بی بی اس) اپنے داماد ڈاکٹر اکرم عیاض (ارتھو پیڈک سرجن) اور اپنے پیارے نواسے عزیزی ایان اکرم عیاض اور پیارے سے پوتے سید شاذ خالد ان سب کا شکر گذار ہوں جن لوگوں کی ہمت افزائی ہمیشہ ہمارے شامل حال رہتی ہے۔الحمد اللہ میرا یہ چھوٹا سا خاندان اللہ کی خاص عنایتوں کا مظہر ہے۔اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے اس چمن کو محفوظ اور شاداب رکھے اور اسے ملک وملت کے لئے خیر وصلاح کا منبیٰ بنائے (آمین)

میں اس کتاب کے کمپوزر جناب مولانا محمد آصف اقبال قاسمی اور پبلشر کا بھی شکر گذار ہوں جن کی محنت اور حسن کارکردگی کی وجہ سے یہ کتاب اتنی جاذب اور خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں اور اس کتاب میں آپ کو کہیں فکری کجی اور علمی غلطی نظر آتی ہو تو ضرور مطلع کریں۔انشاء اللہ آپ ہمیں ہمیشہ اپنی اصلاح کرنے والا پائیں گے۔آیئے ایک اچھے مستقبل کی امید کے ساتھ آگے بڑھیں۔

ابوذر کمال الدین

20/03/2022

موبائل نمبر:9934700848

انتساب

اپنی والدہ محترمہ مرحومہ

بی بی مہر النساء معروف بہ رقیہ خاتون

اور

اپنے والد محترم مرحوم

ڈاکٹر سید ابوالفضل طہیر الدین معروف بہ ڈاکٹر اس۔ اے۔ فضل کے نام

جن کی دعاؤں نے مجھے اس لائق بنایا۔

اللہ تعالیٰ ان کے سیئات کو ان سے دور فرمائے

ان کے حسنات کو قبول فرمائے

اور انہیں اپنی رضا اور نعمتوں بھری جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

باب اوّل

کیا بھارت کو اسلام کی ضرورت ہے؟

اسلام اس ملک کے لئے نیا نہیں ہے بلکہ چودہ سو سالوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بھارت کے طول وعرض میں گونج رہی ہیں۔ لیکن بعض تاریخی اور سیاسی عوامل نیز مسلمانوں کی علمی، عملی اور اخلاقی کوتاہیوں نیز ان کی عدم توجہی غربت، جہالت اور انتشار کی وجہ سے اس کی حقانیت اہل ملک پر پوری طرح واضح نہیں ہوسکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو اس کے اصولی اور اصلی رنگ میں اہل ملک کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ حق کی متلاشی سعید روحوں کو زندگی کا صحیح نصب العین حاصل ہو اور وہ خسران سے بچ کر نجات وفلاح کی ازلی اور ابدی راہ پر گامزن ہوسکیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کیا ہے، وہ کس چیز کا علم بردار ہے اور بھارت کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس مضمون میں انہیں نکات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اسلام کی حقیقت

اسلام کے سلسلے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی عظیم اکثریت شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ اس کی ابتداء حضرت محمد ﷺ سے ہوئی اور یہ مسلمانوں کا دین ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام کی ابتداء حضرت محمد ﷺ سے نہیں ہوئی بلکہ آپ کے ذریعہ اس دین کی تکمیل ہوئی ہے۔ آپ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس دین کی ابتداء تو حضرت آدم سے ہوئی جو توراۃ زبور انجیل اور قرآن اور تمام دیگر صحفِ آسمانی کی رو سے زمین پر پہلے انسان اور پہلے نبی تھے۔ دراصل اسلام اللہ کا دین ہے جس کی ہدایت اس نے ابتدائے آفرینش سے کی ہے اور آخری اور مکمل شکل میں محمد رسول اللہؐ پر نازل کر کے ساری دنیا کو بلا امتیاز مذہب وملت رنگ ونسل زبان وعلاقہ زمان ومکان قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس لحاظ سے اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانیت عظمی کا ازلی اور ابدی دین ہے۔ یہ تمام انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کا دین نہیں بلکہ دین کا

ئنات ہے۔قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات مندرجہ بالاحقائق پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔

۱۔ اسلام پوری کائنات کا دین ہے۔

قرآن حکیم کاارشاد ہے:

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں حالانکہ زمین اورآسمان کی ساری چیزیں چارونا چاراللہ کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اوراسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔(آل عمران۔۸۳)

۲۔ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے:

اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں اورتم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا۔ امید ہے کہ اس طرح تم (دنیاوآخرت میں ناکامیوں سے) بچ سکو گے۔جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایااورآسمان کی چھت بنائی اورآسمان سے پانی برسایااوراس سے تمہارے لئے پھلوں کارزق پیدا کیا۔توتم خدا کی بندگی میں کسی کوشریک نہ ٹھہراؤ۔تم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو!(البقرہ۔۲۱)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''تم اپنا رخ یکسو ہوکراللہ کے دین کے لئے سیدھا کرلو یہ دین اللہ کی فطرت ہے۔ جس پراس نے (تمام)انسانوں کو پیدا کیا ہے''(الروم۔۳۰)

۳۔ حضرت آدم سے لے کر یہ دین آج تک پوری انسانیت کا واحد مستند دین ہے۔اس کی تشریح قرآن پاک نے متعدد جگہوں پراس طرح کی ہے۔حضرت آدم اوران کی بیوی حضرت حوا کو دنیامیں بھیجتے وقت یہ حکم دیا گیا:

''تم سب زمین پراتر جاؤاگر ہماری طرف سے ہدایت آئے تو جس نے اس کی پیروی کی اس کے لئے کسی رنج اورخوف کا موقع نہیں اور جولوگ کفرکریں گےاور ہماری آیات کوجھٹلائیں گےان کے لئے جہنم کا عذاب ہےجس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''(البقرہ۔۱۰۴)

دین ایک وحدت کا نام ہے جوایک تسلسل کےساتھ مختلف ادوارمیں اقوامِ عالم پرنازل

ہوتا رہا اور الگ الگ زمانوں، ملکوں اور زبانوں میں ایک ہی حقیقت الگ الگ ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے جب کہ اس کی جوہری سچائی اور دعوت ہمیشہ سے ایک رہی ہے قرآن اس کی وضاحت کرتے ہوئے آگے کہتا ہے۔

''اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چارونا چار اللہ کی تابع فرمان ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔ (اے نبیؐ) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور ان تعلیمات پر بھی جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی تھیں اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔ اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا'' (آل عمران ۸۳۔۸۶)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ مشرکین کو سخت ناگوار ہے وہ بات جس کی طرف تم اس کو دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے''

(الشوریٰ۔۱۳)

یہ انبیاء ہر ملک، ہر قوم، ہر خطہ، ہر زبان اور ہر زمانے میں آئے۔ قرآن کا ارشاد ہے لکلِ قومٍ ھا د۔ ہم نے ہر قوم میں رہنمائی کرنے والا بھیجا ہے۔ (الرعد۔۷)

مشتے از نمونہ خر دارے، کے طور پر چند کے نام گنائے ہیں باقی کے بارے میں ارشاد ہے:

''(اے نبیؐ)! تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے'' (المومن۔۷۸)

''ہم نے ہر قوم میں نبی بھیجا کہا اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو'' (النحل۔۳۶)

اس طرح اسلام نہ صرف ازلی اور ابدی دین ہے بلکہ انسانیت عظمیٰ یعنی تمام انسان اور پوری کائنات کا مشترکہ دین اور مشترکہ ورثہ ہے۔

حضورؐ کا امتیازی وصف

ان تمام انبیاء میں نبی کریمؐ کو جو امتیازی وصف حاصل ہے وہ یہ ہے کہ:

(الف) آپ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔

(لوگو)! محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

(سورہ الاحزاب۔۴۰)

(ب) آپؐ کا دوسرا وصف یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت تمام انسانوں کے لئے ہے۔

(اے محمدؐ) کہو اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں زندگی وہی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی کرو اس کی، امید ہے تم راہِ راست پالو گے۔ (الاعراف۔۱۵۸)

''اور اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔'' (سبا۔۲۸)

(ج) آپؐ کا تیسرا وصف یہ ہے کہ آپ نبی رحمت ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ''ہم نے آپ کو سارے جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے!'' (سورۃ الانبیاء۔۱۰۷)

اور آپ جو چیز لائے ہیں وہ سارے جہان والوں کے لئے نصیحت ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ قرآن تو سارے جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔

(د) آپ کا چوتھا وصف یہ ہے کہ آپ پر یہ دین مکمل ہو گیا اور ساری انسانیت کے لئے اسلام ہی واحد مستند دین قرار پایا:

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔''
(المائدہ۔۳)

مزید فرمایا:

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے۔ اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ (آلِ عمران ۱۹)

مندرجہ بالا آیات وتشریحات سے واضح ہے کہ دنیا کی فلاح وخسران اب صرف اور صرف اس دین سے وابستہ ہے جو مانے گا کامیاب وکامران ہوگا اور جو نہ مانے گا وہ فرد ہو یا سماج خود گھاٹے میں رہے گا۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (سورۃ العصر ا۔۳)

ترجمہ: زمانے کی قسم، انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کی اور حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

اسلام کس چیز کا علمبر دار ہے؟

اب آیئے ایک نظر اس بات پر ڈالتے چلیں کہ اسلام کس چیز کا علمبر دار ہے؟ پھر اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ کیا بھارت کو اسلام کی ضرورت ہے نیز بھارت کے لئے اسلام کا پیغام کیا ہے؟

وحدتِ الٰہ

اسلام نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ وحدت الٰہ ہے۔ یعنی اس کائنات کا ایک ہی خالق ایک ہی مالک اور ایک ہی فرماں روا ہے۔ اس کے صفات واختیارات میں کوئی کسی طرح سے شریک نہیں ہے۔ وہ خدا کے علاوہ کسی انسان، فرشتہ، دیوی دیوتا پتھر اور پہاڑ کو بندگی کا مستحق نہیں سمجھتا، لہذا اسلامی تعلیمات کی رو سے عبادت واطاعت خالص اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ اس کے دائرہ اختیار میں محض فیضان روحانی نہیں ہے بلکہ تمام تمدنی، سیاسی اور سماجی معاملات شامل ہیں جس کی تہذیب وتنظیم اس کے احکام کے مطابق ہونی چاہئے۔ ان تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ہی اس زمین وآسمان کا جائز، حقیقی مالک اور فرماں روا ہے۔ لہذا انسانی زندگی کو عدل وتوازن کے ساتھ قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح اس کی مرضی آسمان میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی ہونی چاہئے۔

وحدتِ آدم

اسلام نے وحدت الہٰ کے بعد جس چیز پر زور دیا ہے وہ وحدت آدم ہے۔ جدید دور کی تعلیمات اپنی انتہائی عروج کے باجود اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکی ہے۔ اس لئے انسانیت افراد سے لے کر قوموں تک خود ساختہ تقسیموں میں بٹی ہوئی ہے۔ دورجدید اگر چہ انسانی شرف کا قائل ہے۔ لیکن انسانوں کو محض انسان کی سطح پر رکھ کر برابری کا مقام نہیں دیا گیا ہے۔ آج زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہوسکا ہے وہ جمعیت اقوام ہے۔ جو اسلامی تصور جمعیت آدم سے بہت فروتر ہے اور جب تک جمعیت آدم کا تصور پوری طرح رچ بس نہیں جاتا دنیا میں پائیدار امن کی آرزو ایک خوبصورت خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہوں یا سکھ اور عیسائی ہوں یا مسلمان یا چینی ہوں یا جاپانی اور امریکی ہوں یا روسی یا مصری ہوں، یا برہمن ہوں یا شودر ہوں، کالے ہوں یا گورے، انگریزی بولتے ہوں یا عربی، دولت مند ہوں یا غریب، کسی اصول و مسلک کے ماننے والے ہوں اور کسی خطۂ ارض کے رہنے والے ہوں اور ان کی کوئی بھی جنس اور نسل ہو!

قوموں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف اور پہچان کے لئے ہے۔ برادری اور خاندان کسی شرف اور امتیاز کی ضمانت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی شرف اور امتیاز کا مطالبہ ایک جہالت اور عصبیت ہے۔ اسلام کے نزدیک سارے انسان برابر ہیں اور یکساں حقوق و اختیارات کے مالک ہیں۔ کوئی آدمی دولت اور حسب و نسب کے زور پر کسی کو دبا نہیں سکتا ہے۔ کوئی انسان پیدائشی طور پر ذلیل اور پیدائشی طور پر معصوم اور معزز نہیں ہوتا۔ تمام انسان پیدائشی طور پر معزز اور یکساں حقوق و احترام کے مستحق ہیں۔ کسی شخص کا دوسرے شخص کو حقیر سمجھنا اللہ کے نزدیک انتہائی برا ہے اور یہ چیز اس شخص کو خدا کی نگاہ میں گرا دیتی ہے۔ اسلام نے شرف و امتیاز کا صرف ایک ہی پہلو تسلیم کیا اور وہ یہ ہے کہ کون خدا سے کتنا ڈرنے والا ہے۔ جو خدا سے جتنا ڈرنے والا ہے ظاہر ہے وہ خدا کے احکام کا اتنا ہی پابند ہوگا۔ انسان اور انسان میں فرق نہیں کرے گا۔ تمام لوگوں کے حقوق عدل کے ساتھ ادا کرے گا۔ اور انسانیت کی خدمت بجالانا اپنی زندگی کا مقصد اولین سمجھے گا۔ ظاہر سی بات ہے ایسا شخص خلق اور خدا دونوں کے نزدیک قابل عزت قرار پائے گا۔ اس طرح اسلام انسانی شرف اور برابری کا علم بردار ہے۔ عمومی اور عوامی قدروں کا پاسدار ہے جو سچی آزادی اور جمہوریت کی روح ہے۔

وحدتِ دین

اسلام کا تیسرا امتیازی وصف وحدتِ دین ہے۔ اسلام کی رو سے دینِ حق بہت سے نہیں ہیں۔ بلکہ دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ جب خدا ایک ہے، اور انسان ایک ہے تو انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ضابطۂ حیات بھی ایک ہونا چاہئے۔ ایک سے زیادہ دین کا تصور دو باتوں کو مستلزم کرتا ہے۔

۱۔ دینِ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ انسانی ذہن کی اپج ہے اور

۲۔ ایک انسان دوسرے انسان کے برابر نہیں بلکہ ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔

یہ دونوں تصور غیر سائنٹفک اور غیر معقول ہیں انسانیت ایک اکائی کا نام ہے اور اس کی ضرورت واحتیاج میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس بات کو قریب قریب ساری دنیا نے تسلیم کرلیا ہے۔ اب رہا دین کا خدا کی طرف سے ہونا تو وہ تقدس واحترام اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ خدا کی طرف سے نہ ہو۔ اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوگا تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک اعلیٰ فلسفہ کی ہوگی جس کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس لئے سرو دھرم سمبھاوَ کا تصور صحیح نہیں ہے بلکہ دین ایک ہی ہے یہی تصور معقول ہے۔ اس لئے تمام دھرموں کا یکساں احترام ایک الگ بات ہے مگر تمام دھرموں کو صحیح ماننا ایک فضول سی بات ہے۔ جب ایک چیز دھرم ہی نہیں ہے تو پھر اس کو صحیح کیسے تسلیم کرلیا جائے؟ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک چیز دھرم نہیں ہے تو پھر اس کو دھرم سمجھا کیوں جاتا ہے اور لوگ کیا سمجھ کر اس کی پیروی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس مسئلہ کو بہت واضح طور پر بیان کیا ہے:

> ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اور یہ اختلافات ان لوگوں نے کی جنہیں حق کا علم دیا جاچکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کیونکہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھادیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے اسے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ (سورہ البقرہ۔۲۱۳)

اس تصور وحدتِ دین کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ **لا نفرق بین احد من رسلہ** ۔یعنی ہم نبیوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ

ایک شخص کو مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح وہ محمد رسول اللہ پر ایمان لایا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے ٹھیک اسی طرح دیگر انبیاء جیسے حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ وغیرہ پر ایمان لائے۔ اگر کوئی شخص ان پر ایمان نہیں لاتا یا ان میں سے کسی ایک پر ایمان نہیں لاتا ہے تو وہ مومن نہیں رہتا۔ جب کہ آج یہ بات غلط طریقہ سے تسلیم کر لی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ عیسائی مذہب کے بانی ہیں اور حضرت موسیٰؑ یہودی مذہب کے بانی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کسی مذہب کے بانی نہیں ہیں بلکہ تمام انبیاء نے صرف ایک دین اللہ کی بندگی کی دعوت دی تھی جسے اسلام کہتے ہیں۔ عیسائی اور یہودی مذہب اسلام سے اپنے اصول وعقائد میں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ ایک ہی دین کی شاخ ہیں جس کو بعد کے لوگوں نے جڑ سے کاٹ کر الگ کر لیا ہے۔ قرآن اس کی تصریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''یہودی کہتے ہیں یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی، ان سے کہو سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ مسلمانوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں'' (سورہ البقرہ، ۱۳۵۔۱۳۶)

ایک دوسری جگہ قرآن مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔'' (سورہ الشوریٰ۔۱۳)

اس بات کی مزید وضاحت قرآن اس طرح بھی کرتا ہے کہ قرآن کا پیش کرنے والا رسول کوئی نرالا رسول نہیں ہے اور قرآن کی تعلیمات نئی نہیں ہیں بلکہ یہ سابق تعلیمات کی تصدیق

کرتی ہے جوانجیل اورتورات میں درج ہیں نیز دوسرے صحیفوں میں آئی ہیں۔

''اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی جوحق لے کرآئی ہے اوران کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے۔''(سورہ آل عمران۔۳)

اس طرح قرآن نہ کسی کتاب کی تردید کرتا ہے اور نہ کسی نبی کی بلکہ وہ دراصل فرقان ہے یعنی حق و باطل کا فرق بتانے والا ہے۔قرآن کی بنیاد تردید مذاہب پرنہیں بلکہ تنظیم مذاہب پر ہے اوراس کووحدت میں پروکر بے شمارراہوں کوچھوڑ کرایک صراط مستقیم کی تعمیر کرنا ہے۔

ہندوستان میں ویدوں کو بہت سے لوگ الہامی کتاب تصور کرتے ہیں۔ ویدوں میں خداایک ہےاور دین ایک ہے کا تصور جا بجاملتا ہےاور کچھ ازلی ابدی سچائیوں کا بھی ذکرملتا ہے۔یہ سب اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ سب طریقوں کوچھوڑ کراورسب چیزوں سے مبرا ہوکرانبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خدا کی بندگی کر نی چاہئے۔اگرایسا ہوجائے تو ادیان کا جھگڑا مٹ جائے اورانسانیت ایک صحیح سچی راہ پرگامزن ہو جائے گی۔گیتا کی تعلیمات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اگر یہ الہامی کتابیں مان لی جائیں تواس سے بھی قرآنی فکر کی تائید ہوتی ہے۔

یہاں ایک بات اورعرض کردوں کہ انبیائے سابق کی تعلیمات جوکچھ کہ ان کی کتابوں میں موجود ہیں اور تاریخی طور جوپرآج ہمارے سامنے ہیں ان میں سے بہت سی چیزیں یاتو غائب ہوگئی ہیں یابعد کےلوگوں نے اپنی شرارت اورنادانی سے بدل دی ہیں۔اس لئے وہ زندگی گذارنے کا کوئی متعین اورمکمل طریقہ نہیں ہے اب اسلام ہی جیسا کہ وہ محمد رسول اللہؐ پرنازل ہوا ہے زندگی گذارنے کا واحد،مستند اورمکمل الٰہی نظام ہے۔لہٰذا اگرکوئی شخص اپنے سابقہ دین کی پوری پوری پیروی کرنا چاہتا ہے اورتمام مذہبی شخصیتوں کا صرف نظری نہیں بلکہ عملی احترام کا جذبہ رکھتا ہے تو اسلام اس کا واحد ذریعہ ہے۔

ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں قبول اسلام دراصل تبدیلیٔ مذہب نہیں بلکہ قبول مذہب ہے۔یہ درھر م انترن(Change of Faith) نہیں بلکہ دھرم دھارن

(Acceptance of Faith) ہے ۔کیونکہ ہندودھرم کے بڑے بڑے زعما کے بقول ہندودھرم دھرم نہیں ۔ایک کلچر ہے ۔اور کلچر دھرم کا ایک حصہ ہوتا ہے جس کا اظہار خاص طور پر سماجی ضابطوں کی شکل میں ہوتا ہے نہ کہ زندگی کا کوئی عقیدہ فراہم کرتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندو دھرم کو ہندوستانی قومیت سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور مادروطن کو خدائی منصب پر بٹھانے کا اہتمام کیا جارہا ہے ۔حالانکہ دھرم اور قومیت دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔عقیدہ بدلنے سے قومیت نہیں بدلتی ۔ایک شخص اگر ہندو ہوکر ہندوستانی ہے تو وہ مسلمان ہوکر بھی ہندوستانی رہے گا ۔اگر ہندوستان کو وہ اپنا ملک مانتا ہے یا ہندوستان میں پیدا ہوا ہے ۔یہ ایک فریب ہے جو بعض طبقات کی طرف سے دیا جارہا ہے کہ دھرم بدلنے سے قومیت بدل جاتی ہے ۔عقیدہ الگ چیز ہے اور ملک الگ چیز ہے ۔عقیدہ بدلنے سے ملک نہیں بدلتا بلکہ دونوں اپنی جگہ سالم اور محکم رہتے ہیں ۔

تصورِ آخرت

اسلام کا چوتھا تصور آخرت ہے ۔یہ عقیدہ عیسائی تصورِ نجات (Atonement) اور ویدانتی فلسفہ آواگون (Transcription of soul) سے کہیں زیادہ سائنٹفک ،عقلی اور مبنی برحق ہے ۔عیسائی عقیدے کی رو سے حضرت عیسیٰؑ جو نعوذ باللہ خدا کے بیٹے تھے نے انسانیت کو گناہ ازلی سے نجات دلانا کے لئے اپنی قربانی دے کر ہر شخص کو جنت اور نجات کی ضمانت دے دی ۔جو عیسائیت کو بطور مذہب قبول کر لیتا ہے ۔چاہے اس کے اعمال کیسے ہی ہوں اس کی نجات ہو جائے گی ۔دوسری طرف آواگون کا تصور یہ بتاتا ہے کہ آدمی کی زندگی کا اصل مقصد موکچھ (نجات) کا حصول ہے جس کے معنی بار بار جنم سے چھٹکارا پانا ہے اور بالآخر ایشور کی آتما میں ویلین ہو جانا ہے ۔اس عقیدے کی رو سے آدمی اپنے کرم کا پھل بھوگنے کے لئے بار بار دنیا میں آتا ہے ۔اچھا کرم کرنے سے اچھے کول میں جنم لیتا ہے اور برا کرم کرنے سے برے کول میں جنم ہوتا ہے ۔یہ عقیدہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شودر میں جنم برے کرم سے ہوتا ہے اور انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں یا وہ جب بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس کے پچھلے جنم کے اعمال کی سزا ہے اور نیز انسان اپنے اعمال کے لحاظ سے پیڑ پودے کیڑے مکوڑے اور کتے بلی میں بھی جنم لے سکتا ہے ۔یہ عقیدہ اتنا کمزور ہے

کہ اس پر کسی عملی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بہت سے سمجھدار لوگ بھی اس عقیدہ کے قائل ہیں۔ شاید باپ دادا کے خیالات کی پاسداری اور پوروجوں کی اندھی پیروی کی وجہ سے وہ سنجیدگی سے اس پر دھیان نہیں دیتے ہیں۔ پھر آخرت کا عقیدہ نہ مان کر وہ اپنے آپ کو ان ذمہ داریوں اور جوابدہیوں سے بچانا چاہتے ہیں جسے یہ عقیدہ ایک فرد پر عائد کرتا ہے۔

اسلام کا تصورِ آخرت ایک ذمہ دار وجود کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنی زندگی پوری ذمہ داری کے ساتھ گذارنی چاہئے۔ اس کی تلقین کرتا ہے اس لئے کہ اس کے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گیا۔ انسان اس دنیا میں بے لگام جانور نہیں ہے بلکہ اسے ایک روز مرنا ہے اور مرکر اپنے رب کے حضور جانا ہے، وہ اس سے پوچھے گا کہ دنیا میں کیسی زندگی گذار کر آئے ہو۔ اگر اس نے پاکیزہ، عدل پرور، متقیانہ زندگی گذاری ہوگی تو خدا کے حضور میں کامیاب ہوگا اور اس کی نعمت بھری جنت کا مستحق ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اگر اس نے ظلم وجور کی روش اختیار کی ہوگی اور خدا کی زمین میں کفر اور شرک کو فروغ دیا ہوگا، خلق اور خدا کے حق کو نہیں پہچانا ہوگا تو وہ ناکام ہوگا اور خدا کے عذاب یعنی جہنم کا مستحق ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ عقیدہ ہر انسان کو اس کے اعمال کا خود ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اور اس کے اندر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ جو سماج اس عقیدہ پر جتنا مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگا اس میں حقوق کی پاسدارری، انسانی احترام، عدل پروری، انصاف وحق پسندی اور تقویٰ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ یہ عقیدہ تمام نوع انسان کی بھلائی اور بہتری کا ضامن ہے۔ یہ عقیدہ جتنا کمزور ہوگا اتنا زیادہ شر وفساد پھیلے گا۔ آج مسلم وغیر مسلم دنیا میں شر و فساد، ظلم وجور، استحصال وعدم توازن کا جو حال ہے اس کی ایک بڑی وجہ عقیدہ آخرت کا کمزور اور نحیف پڑ جانا ہے۔ بھارتی سماج کی اصلاح کے لئے عقیدۂ آخرت نسخۂ شفاء ہے۔

ایک مستحکم نظام اخلاق

ان حقائق کو مان لینے کے بعد جو ایک مستحکم نظام اخلاق پیدا ہوتا ہے جن کو جدید ذہن کا سواد اعظم مسلمہ اصول کے طور پر تسلیم کرتا ہے بلکہ جو انسانیت عظمیٰ کا منتہائے مقصود بن گئی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ شرف انسانی اوراخوت ومساوات نیز بقائے باہم۔
۲۔ علمی بیداری کی اہمیت جس کی بنیاد آزادانہ تحقیق اور سائنسی حقائق کی تفتیش ہو۔
۳۔ مذہبی عدم جارحیت۔
۴۔ آزادیٔ نسواں اور مردوں کی روحانی برابری۔
۵۔ ہر طرح کی غلامی اور استحصال سے نجات۔
۶۔ محنت کی عزت
۷۔ بلاامتیاز مذہب وملت اور رنگ ونسل انسانی یک جہتی اور اتحاد کا حصول۔ دراصل اسلام روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر عالمی انسانی یک جہتی کے حصول کا ایک منضبط منصوبہ ہے۔
۸۔ رنگ، نسل اور دولت کی بنیاد پر غرور اور عصبیت کا قلع قمع کرنا اور ایک عدل پرور سماج کی تعمیر کرنا اس کا مقصود ہے۔
۹۔ ترک دنیا کی نفی۔
۱۰۔ معاشی خوشحالی، پیداوار میں فروغ اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر زور۔

اسلام کی اصولی دعوت کو سمجھ لینے کے بعد اب آیئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹیں کہ بھارت کے لئے اسلام کا پیغام کیا ہے نیز بھارت کو کیا اسلام کی ضرورت ہے؟

بھارت کے لئے اسلام کا پیغام

ہندوستان کی چار ہزار سالہ دیو مالائی تہذیب انتشار وکش مکش کی ایک طویل داستان ہے۔ سیاسی انتشار، سماجی تفاوت اور فکر ونظر کی محدودیت ہندوستان کا خاصہ رہا ہے۔ آج جتنا بڑا ہندوستان آپ دیکھ رہے ہیں انگریزوں کی آمد سے قبل اتنا بڑا ہندوستان کسی ایک مرکزی اقتدار کے زیر سایہ کبھی نہیں رہا۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں گپت خاندان کے ذریعہ ایک وسیع وعریض سلطنت کا قیام عمل میں آیا اور ساتویں صدی کے نصف اول میں تھا نیشور کے راجا ہرش وردھن نے شمالی ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کی، یہ دراصل مسلمانوں کا اس ملک پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنی حکمت، تدبر، جانبازی اور بہادری سے اس ملک کی شیرازہ بندی کی اور بنگال سے

کابل تک ایک وسیع سلطنت کو وجود بخشا۔اس کے بعد انگریزوں نے اس کو مزید استحکام عطا کیا اوراس پورے خطۂ ارض کو ایک جغرافیائی وحدت میں پرونے کی زبردست کوشش کی۔ اگرچہ انگریزوں نے بعض سیاسی وجوہات کی بناپر دیسی راجاؤں کے وجود کو باقی رکھا۔لیکن وہ بھی مرکزی اقتدار کے زیرنگیں اور باز ج گذار تھے۔بالآخر ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد دیسی راجاؤں کے وجود کو ختم کر دیا گیا۔لیکن ملک کی سالمیت کے لئے پورے ملک کو کسی مرکزی اقتدار کے تحت اس کو سیاسی اور جغرافیائی وحدت میں تبدیل کر دینا کافی نہیں ہے۔اس طرح کے تجربات اس سے پہلے ماضی میں بھی ہو چکے ہیں۔لیکن بھارتی سماج کے اندرونی تضادات کی وجہ سے یہ مل مل کر بکھر گئے ہیں۔آج ہماری آزادی کو ۷۰ سال ہو گئے ہیں۔اگرچہ اس وقت عام لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے اور عام ہندوستانی اپنے ملک کو متحد اور منظّم دیکھنا چاہتا ہے۔لیکن ملک میں انتشار وافتراق کی قوتیں سرگرم کار ہیں اور اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ جیسے ہی لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ کمزور ہو اور مرکزی اقتدار میں اضمحلال پیدا ہو وہ اس ملک کو تخرے بخرے کر دیں۔آسام کی تحریک ،خالصتان کی تحریک ، میزو باغیوں کی شورش ، کیرالہ اور تامل ناڈو کی حکومتوں کا بار بار زیادہ سے زیادہ حق خود اختیاری کا مطالبہ اس انتشار کی مظہر ہیں۔ ہندی کے حامیوں اور مخالفوں کی کش مکش تو اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے۔تو زبان اور علاقہ کے نام پر سیاسی پارٹیاں وجود میں آرہی ہیں۔اور کل ہند پارٹیوں سے لوگوں کی مایوسی دیدنی ہے، بڑی تعداد میں لوگ علاقائی پارٹیوں کی حمایت کر رہے ہیں۔اور مختلف ریاستوں خصوصاً سرحدی ریاستوں میں ایسی پارٹیوں کو الیکشن میں بھاری کامیابیاں حاصل ہورہی ہیں اور انہیں اقتدار نصیب ہورہا ہے۔کیا یہ خطرہ کی علامت ہے؟ روس اور امریکہ کے ایجنٹ اور ان کی خفیہ ایجنسیاں ملک کی آزادی، سالمیت اور خودمختاری کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔بہت سی تنظیمیں دیش بھکتی کا لبادہ اوڑھ کر ملک میں انتشار اور تشدد پھیلانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔

جدید ہندوستان کے معماروں کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ قدیم ہندو تہذیب وتمدن اپنے محدود تصورِ حیات ،سماجی تفاوت اور سماجی حس کے فقدان کے باعث جدید ہندوستان کی تعمیر میں کوئی مثبت رول ادا کرنے سے قاصر ہے۔اس لئے ان لوگوں نے ہندو فکر و

فلسفہ سے بے نیاز ہوکر درآمدی نظریات کے سہارے ملک کی تعمیرِ نو کا منصوبہ بنایا۔ شوشلزم، سیکولرزم، جمہوریت اور نیشنلزم کے تصورات فرانس، روس، جرمنی اور انگلینڈ سے اس ملک میں لائے گئے۔ لیکن یہ نظریات بھی ہندوستان کے تہذیبی تضادات کو ختم کرنے میں ناکام ہیں۔ ہندو مسلم فسادات، تامل اور ہندی کی کش مکش، شمالی اور جنوب کا جھگڑا، بیک وارڈ اور فوروارڈ کی چپقلش، ذات پات کے امتیازات، دلتوں اور ہریجنوں کا سنگھرش، ہریجنوں کا زندہ جلایا جانا، ان کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ دینا، ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ملک تہذیبی وحدت کی منزل سے بہت دور ہے۔ اس ملک میں کوئی قومی دھارا نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی نالیاں (Drains) ہیں جو متضاد اور متصادم ہیں اور ایک دوسرے کے بالکل مخالف سمت میں بہتی ہیں۔ ابھی تک اس ملک کے ایک بڑے طبقہ کو بلکہ یہاں کی اکثریت کو برابری اور آزادی کے مواقع نصیب نہیں ہیں۔ آزادی اور برابری کے حصول کی جدوجہد کی سزا انہیں جان ومال کے اتلاف کی شکل میں بھگتنا پڑتی ہے اور ان کی عزت وآبرو سرِ بازار لوٹ لی جاتی ہے۔ اس ملک میں دلتوں اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ اس حقیقت کی منہ بولتی داستان ہے۔ اس سازش میں اس ملک کے سیاست کار، انتظامیہ، پولیس، پریس اور عدالت سب شریک ہیں۔

قومی تہذیب کی تلاش

: یہ صورت حال ہر انسان دوست اور محبّ وطن شہری کے لئے لمحۂ فکر یہ ہے۔ دراصل ہندوستان ایک ایسی قومی تہذیب کی تلاش میں ہے جو اتحاد وسالمیت کی پائدار ضمانت لے کر سامنے آئے۔ اس کے لئے ملک کو کسی ٹھوس عقیدے کی بنیاد پر استوار کرنا ہوگا جس میں وسعت اور عمومیت ہو نیز جس میں سب کو اپنانے اور ساتھ لے چلنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہو۔ ہندوستان میں دسیوں مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ بیسیوں زبان بولتے ہیں۔ علاقے علاقے کے رسوم وعادات جداگانہ ہیں۔ معاشی تفاوت اپنی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ پورا ملک قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہے اور ذات برادری کا زور ہے۔ ان متضاد تصورات میں ایک معتدل اور منصفانہ نظام کے اجزائے ترکیبی کیا ہوسکتے ہیں اور کیا اسلام اس معیار پر پورا اترتا ہے؟ یہ وقت کا اہم سوال ہے۔ آیئے اس

پسِ منظر میں اسلام کا ہندوستان کی مشترکہ قومی تہذیب کی حیثیت سے جائزہ لیں۔

۱۔ اسلام وحدتِ الہ کے تصور کا قائل ہے جو تمام مذاہب کے نزدیک ایک مسلّمہ امر ہے۔ شرک ایک غیر عقلی تصور ہے جس کی کوئی سائنٹفک اور علمی توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے۔

۲۔ کائنات اسی ایک خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس طرح اسلام وحدت کائنات کا قائل ہے ۔زمین ایک اکائی ہے لہذا اس عقیدے کی رو سے علاقائی عصبیت کی تمام دیواریں ڈھہہ جاتی ہیں۔

۳۔ انسان خدا کا بندہ اور ایک ماں باپ کی اولاد ہے۔ لہٰذا تمام انسان آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ اس عقیدے کی رو سے تمام نسلی، قومی، وطنی، علاقائی، لسانی اور مسلکی اختلافات مٹ جاتے ہیں۔ اس طرح انسان اور انسان کے درمیان حائل تمام پردے یکا یک اٹھ جاتے ہیں۔

۴۔ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے جو دو انسانوں کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرتی ہے۔ تمام زبانیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ لہذا تمام زبانیں اچھی ہیں جس طرح آدمی اور آدمی میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کسی زبان سے بیر فضول ہے۔ تمام زبانوں کو پھیلنے، بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں۔

۵۔ تمام انسانوں کے سماجی، سیاسی، معاشی، تمدنی اور قانونی حقوق یکساں ہین۔ لہذا ان کو یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے تو اسے سماجی اور رفاہی اداروں کے ذریعہ سہارا ملنا چاہئے تا کہ وہ عزت نفس کے ساتھ جینے کے لائق ہو سکے۔ نیز ہر طرح کے ظلم واستحصال اور بندوں کی غلامی سے اس کو نجات ملنی چاہئے۔

۶۔ ہر شخص کو اپنے فکر و خیال اور عقیدے کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ملنی چاہئے۔ نیز اسے اپنے عقیدے کو پھیلانے اور عام کرنے کی جدو جہد پر کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اس ضمن میں کسی کو جبر و تحقیر اور دشنام طرازی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کوئی کسی کے دین کو خریدنے اور ڈر خوف اور لالچ کے ذریعہ اپنے دین سے پھیرنے کی کوشش نہ

کرے۔اگر کوئی شخص برضا و رغبت سوچ سمجھ کر کسی عقیدہ کو قبول کرتا یا رد کرتا ہے تو اس سے اس کے معاشی، تمدنی، سیاسی اور قانونی اختیارت پر کوئی فرق نہیں آنا چاہئے۔

ان حقائق سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام بھارت میں ایک متفقہ قومی تہذیب کی تشکیل میں کتنا اہم اور مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔اگر پورا ہندوستان اسلام کا قائل ہو جائے تو اختلافات اور امتیازات جو ہماری پوری قومی تہذیب کو شکست و ریخت سے دوچار کر رہے ہیں یک لخت ختم ہو جائیں گے۔میں ملک کے تمام رہنماؤں اور بہی خواہوں کو خاص کر ہندوستان کے عام لوگوں کو جن کے بارے میں میرا احساس ہے کہ یہ ملک کے رہنماؤں سے کہیں زیادہ ملک کے وفادار اور جاں نثار شہری ہیں آواز دیتا ہوں کہ اپنی ان باتوں کا معروضی انداز سے جائزہ لیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ اسلام ہی بھارت کے قومی اتحاد و سالمیت اور اخوت و مساوات کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ بھارت کو اپنے وجود و بقا کے لئے اسلام کی ضرورت ہے۔میں تمام اہل ملک سے درخواست کرتا ہوں کہ جب وہ بہت سے درآمدی نظریات کو جو تاریخی اور عملی طور پر ناقص ثابت ہو چکے ہیں ۔ بھارت میں تجربہ کر رہے ہیں اور اس کے کڑوے کسیلے پھل چکھ رہے ہیں تو کیوں نہیں ایک بار اسلام کا تجربہ کر کے دیکھتے ہیں۔اگر یہ بھی عملی طور سے ناکام ہو جائے گا تو اسے رد کر دینے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ہمارے اس دعویٰ پر کچھ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر اسلام میں ایسی ہی اتحاد و سالمیت کی صلاحیت ہے تو مسلم ملکوں میں یہ انتشار کیوں ہے؟ کسی تفصیل میں جائے بغیر اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ تریاق موجود ہے مگر زہر زدہ شخص اس کا استعمال نہ کرے تو محض اس کی موجودگی اس شخص کو ہلاکت سے نہیں بچا سکتی ہے میں نہیں جانتا کہ گاندھی جی نے یہ بات کس جذبہ کے تحت کہی تھی۔لیکن جب ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ وہ آزاد ہندوستان میں سوراج کا کیا تصور رکھتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ میں ہندوستان میں حضرت عمرؓ جیسا طرزِ حکومت پسند کرتا ہوں۔اسلام کی خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بھارت کے صدر جمہوریہ آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی کتاب دی ہارٹ آف انڈیا (The Heart of India) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

''اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو پُر اسرار الجھنوں سے آزاد ہے۔یہ ایک

ایسا تہذیبی نظام ہے جس میں ذات پات اور نسلی پجاریوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام نے توحید اور اخوتِ انسانی کے ذریعہ دنیا کے کئی تاریک گوشوں سے دہشت ناک روایات وعادات کا قلع قمع کردیا اور کروڑوں انسانوں کے معیارِ حیات کو بلند کیا ہے۔ اس نے پسماندہ قوموں کو ہوس پرستانہ شرک، طفل کشی، انسانی قربانی اور بھوت پریت کی پرستش نیز جادوٹونے کے چکر سے نجات دلانے میں گراں قدر مدد کی ہے۔''

اسلام آج بھی ہندوستان میں یہ کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہے اور یہاں کی تاریک اور دہشت ناک روایات سے بھارتی سماج کو آزاد کرانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

اسلام برائے امن اور آزادی

بھارت کے لئے اسلام کے پیغام پر غور کرنے کا دوسرا پہلو امن اور آزادی: ہے۔ اسلام سلامتی کا دین ہے۔ یہ امن کا امین اور آزادی کا علمبردار ہے۔ اسلام پائدار امن کا خواہاں ہے۔ یہ اسباب انتشار کو ایک ایک کرکے ختم کردیتا ہے۔ تمام انسانوں کو برابری کے مقام پر لاکر اس نے ہر طرح کے سیاسی، سماجی اور معاشی تفاوت کو مٹادیا نیز اس بات کا پورا پورا انتظام کیا کہ کہیں سے کوئی رخنہ اندازی نہ ہو اور شروفساد کو درآنے کا موقع نہ ملے۔ اپنا جائز حق لے لینے کے باوجود اگر کوئی شخص زیادتی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو اسلام نے تادیبی اور تعزیری کارروائی کے ذریعہ اس کا قلع قمع کردیا ہے۔ اسلام میں فتنہ قتل سے شدید تر ہے اس لئے فتنہ کے سدباب کے لئے قتل کیا جاسکتا ہے تاکہ معاشرہ کا امن درہم برہم نہ ہو۔ اسلامی سزاؤں میں سختی اسی وجہ سے برتی گئی ہے۔ آج بھارت میں انتشار وافتراق کا ماحول ہے۔ جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ عام آدمی کا امن وسکون غارت ہوگیا ہے۔ لوگ ہر آن خوفزدہ اور پریشان نظر آتے ہیں، ہر طاقت ور کمزور کو دبا لینا چاہتا ہے۔ غریب اور کمزور عوام کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں۔ حقوق کی ادائیگی میں عدم توازن پایا جاتا ہے۔ ان حالات نے پورے سماج کو آتش فشاں کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ملک میں ایک

طبقہ وہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے یعنی Haves not ہے حتی کہ وہ صبح کھاتا ہے تو شام کی فکر رہتی ہے اور بسا اوقات اسے دو وقت کی روٹی میسر نہیں آتی۔ ہندوستان میں اعداد وشمار کے مطابق ملک کی کل آبادی کا 48% فیصد غریبی کی سطح سے نیچے ہیں یعنی ۱۹۷۰-۷۱ کی قیمت کے مطابق ان کی یومیہ فی کس آمدنی ۳۵ پیسے سے زیادہ نہیں۔ایک طرف قیمتوں میں بے پناہ اضافہ اور دوسری طرف ذرائع آمدنی کا محدود اور معدوم ہونا۔اس صورت حال میں عام آدمی کی زندگی کس مپرسی میں گذرتی ہے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔دوسری طرف ملک میں مٹھی بھر گروہ ہے جو پورے ملک کی ۸۰ فیصد دولت پر قابض ہے۔۲۰۱۸ میں شائع اعداد وشمار کے مطاق 1% لوگوں کے پاس ملک کے کل اثاثہ کا 73% ہے گویا 99% آبادی کے پاس صرف 27% مال ودولت ہے۔ان 27% میں بھی بے حد فرق وتفاوت پایا جاتا ہے۔حکومت،عدالت، پولیس، پریس سب اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ان سبھوں کی ملی بھگت نے عام آدمی کو جانوروں کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔دھیرے دھیرے پولیس، قانون اور عدالت پر سے اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔یہ ادارے جرائم اور ظلم کی روک تھام کے بجائے ان کو بڑھانے اور فروغ دینے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔اس وقت ہندوستان میں عام آدمی کی حالت دیدنی ہے۔وہ معاشی،سیاسی،مذہبی،تمدنی جانی اور مالی ہر اعتبار سے اپنے کو بے سہارا اور غیر محفوظ (Unprotected) محسوس کرتا ہے۔لوگوں کی مایوسی اور بد دلی بڑھتی جارہی ہے کیونکہ آج کے اکثر سیاستداں جرائم پیشہ،عدلیہ غیر مؤثر،انتظامیہ بدعنوان، پولیس کرپٹ، پریس خائن،حکومت عوام دشمن،حزب اختلاف عیار اور مفاد پرست ہیں۔ان حالالت میں بے امنی اور انتشار نہ بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کا زمام کار خداترس، آخرت کا خوف رکھنے والے انسان دوست،عدل پسند، صاحب صلاحیت اور ایماندار لوگوں کے ہاتھ میں آئے جس کے پیچھے عقیدہ کی طاقت اور بیدار رائے عامہ ہو۔جب تک ہندوستان کو ایسے معاشرہ میں تبدیل نہیں کیا جاتا ملک میں پائدار امن اور قانون کی حکمرانی ناممکن ہے۔غریب اور کمزور لوگوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے میری اپیل ہے کہ ملک کے تمام پسماندہ طبقات کو امن اور عدل کے اس جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں اٹھالینا چاہئے۔برناڈ شا نے دوسری جنگ عظیم کے دوران کہا تھا کہ آج اگر دنیا پر محمدؐ کی

ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے تو دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ضرورت محمدؐ کی ڈکٹیٹر شپ کی نہیں ،ان اصولوں کی حکمرانی کی ہے جو محمدؐ لے کر آئے تھے۔آج اگر اخلاص کے ساتھ حضورؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ہندوستانی سماج کی تشکیلِ نَو کی جائے تو امن اور نظم کا حصول بہت آسان ہوسکتا ہے۔

آزادی صرف غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا پانے کا نام نہیں ہے بلکہ آزادی انسانی شرف کے ساتھ جینے کا نام ہے ۔ بھارت جیسے ملک میں جہاں اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر فیصلہ صادر ہوتا ہے ۔ سچی آزادی اور حقیقی جمہوریت کا تصور محال ہے۔اکثریت کوئی مستقل قدر کا نام نہیں ہے۔اکثریت کبھی ایک چیز کو جائز قرار دیتی ہے تو کبھی ناجائز۔ایک کے دور حکومت میں شراب ناجائز ہے تو دوسرے کے دورِ اقتدار میں جائز۔اس وقت ملک میں ہم جنس شادی ، باہمی مرضی سے بغیر شادی کے جنسی تعلق اور بغیر شادی کے میاں بیوی کی طرح رہنا یعنی لِو ان ریلیشن شپ سب قانونی طور پر جائز کر دیا گیا ہے۔جس نے جنسی پاکیزگی کے تمام سابقہ تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے ۔جب تک ہماری جمہوریت مستقل اقدار کی پابند نہیں ہوتی کم از کم اقلیت تو اس طرح کے جمہوری نظام میں سچی آزادی کا خواب نہیں دیکھ سکتی ہے۔اسلام انسان کو ہر نوع کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔اسلامی عقیدہ کی رو سے صرف خدا بڑا ہے باقی سب برابر ہیں۔کسی پر کسی کو کوئی مالکانہ حق حاصل نہیں ہے۔ایک شخص انتظام مملکت کا ذمہ دار ہوسکتا ہے ۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ملک اس کی مرضی کے تابع ہوگا اور اس کے صحیح اور غلط کاموں کا جائزہ لینے کے لئے کوئی ٹھوس میزان نہیں ہوگی ۔آج بھارت کی تمام اقلیتیں کیوں ڈری سہمی ہیں؟ اس لئے کہ حکمراں کے نظریات بدلتے رہتے ہیں ۔کبھی دستور ہند کے رہنما اصولوں کو بنیادی حقوق پر ترجیح دی جاتی ہے اور کبھی بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر، جب چاہا جیسے چاہا ملک کے دستور میں ترمیم و تنسیخ کر دی گئی ۔آزادی کے بعد سے اب تک دستور ہند کی سو سے زائد بار ترمیمات ہو چکی ہیں اور اب تو اس پورے دستور کو بدلنے کی بات ہو رہی ہے۔ یہ تمام اقدامات انسانی شرف اور آزادی کے تصور کے منافی ہیں۔جمہوریت کو ایک مستقل اقدار کا پابند بنانا ضروری ہے۔اسلام میں جمہوریت کا مطلب خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت ہے۔یعنی اقتدار اعلیٰ کلی طور پر خدا کے ہاتھ میں ہے اس میں کوئی

کسی طرح شریک نہیں۔ جمہور کو صرف اتنا حق ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص یا ادارہ کو انتظام مملکت کی ذمہ داری سونپ دے اور پھر ان پر نگراں بن کر دیکھے کہ خلافت، خدا کی حاکمیت کے تحت صحیح خطوط پڑ چل رہی ہے یا نہیں۔ جہاں کہیں بھی اس سے انحراف کی کیفیت پائی جائے گی جمہور کا حق ہے کہ وہ اس کو دوبارہ خدا کی حاکمیت کے تحت قائم کردے۔ لہذا اسلامی جمہوریت کے تحت کسی ایک فرد یا پارٹی کی مستقل اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہاں من مانی کرنے اور ڈکٹیٹر شپ چلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خلیفہ کا انتخاب جمہور کے ذریعہ ہوگا اور جمہور صرف خلیفہ کا ہی نہیں بلکہ اس کی مجلس شوریٰ کا بھی انتخاب کرے گا۔ خلیفہ پر لازم ہوگا کہ اللہ کے قانون کے مطابق شوری کے مشورے سے نظم مملکت کی انجام دہی کرے۔ اس طرح خلیفہ اور مجلس شوریٰ دونوں معروف میں اطاعت کے حق دار ہیں۔ جہاں معاملہ غیر معروف اور منکر کا ہوگا خلیفہ اور اس کی شوریٰ کو اطاعت کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے اور اگر بزورِ قوت قوم سے اطاعت کا مطالبہ کیا جائے گا تو قوم کو حق حاصل ہے کہ خلیفہ کی اطاعت سے انکار کردے بلکہ اس کو انکار کردینا چاہئے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا صاف صاف اعلان ہے:

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں'' (حدیث)

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

''ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا سب سے بڑا جہاد ہے'' (حدیث)

اس طرح خلیفہ اور شوری کو خیر کا پابند کر کے اور جمہور کو معروف میں اس کی اطاعت کا حکم دے کر دراصل اسلام نے انسانی شرف و آزادی کی حفاظت کی ہے۔ اور ایک دوسرے کے حقوق و اختیارات پہچاننے اور اس کا پاس ولحاظ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ سچی جمہوریت اور باہمی اعتماد و اتحاد اسی ٹھوس اصول کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے مسائل کی وجہ

ہمارا ملک اس وقت جن مشکلات اور پریشانیوں کے دور سے گذر رہا ہے جس طرح کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے ہر وقت اور ہر جگہ جان و مال کا زیاں، کرپشن، اخلاقی انارکی، جنسی بے

راہ روی ،شر وفساد،لوٹ کھسوٹ ،ظلم واستحصال ، منہ پھاڑے کھڑے ہیں جس نے عام آدمی کی ساری توانائی نچوڑ لی ہے۔ ہر شخص ہراساں اور پریشان حال ہے۔تمام ترقیاتی منصوبے اور روک تھام کی تدابیر ناکام ہوگئی ہیں۔اس کی وجہ کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کے چار اسباب ہیں۔

۱۔ سست رفتار ترقی
۲۔ علم وحکمت کی کمی
۳۔ بددیانتی اور اخلاقی قدروں کا فقدان
۴۔ دولت اور وسائلِ پیداوار کی غیر منصفانہ تقسیم

میرے نزدیک ان تمام اسباب میں آخری دو وجہ زیادہ اہم ہیں۔ بے ایمانی، کرپشن اوردولت کی غیرمنصفانہ تقسیم نے ہی ملک سے تمام قوت محرکہ (Incentive) اور اقدامی صلاحیت(Initiative) چھین لی ہے جس کی وجہ سے ترقی کی رفتار سست ہے اور لوگ محنت اور لگن کے ساتھ کام نہیں کرتے نیز حکمت و مہارت کا مناسب استعمال نہیں ہو پاتا ہے۔ جب کوئی قوم ایمانداری کا جوہر کھودیتی ہے تو اس میں بہت سی خرابیاں آجاتی ہیں۔ بھارتی قوم وہ جوہر کھوچکی ہے جو کسی ایماندار اور محنتی قوم کا خاصہ ہے۔اس لئے بھارت کو یہ دن دیکھنے پڑرہے ہیں۔اسلام آدمی کو ایماندار اور ذمہ دار بناتا ہے اور ہر چیز کو مناسب معتدل ،منصفانہ ڈھنگ سے برتنے اور خرچ کرنے اور لگانے پر زور دیتا ہے۔

اسلام پیداوار میں اضافہ(In crease in Production)اور منصفانہ تقسیم(Distributive Justice) کا حامی ہے وہ اخلاق کو بلند دیکھنا چاہتا ہے نیز علم ومہارت کو انسانیت کی مشترکہ میراث قرار دیتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کی ہدایت دیتا ہے۔اس طرح ملک کو اس وقت جو سیاسی ،سماجی ،معاشی ،اخلاقی اور تکنیکی مسائل درپیش ہیں اسلام ان سبھوں کا واضح اور قابل اطمینان حل پیش کرتا ہے۔اسلام پرامن بقائے باہم کا داعی، اتحاد وسالمیت کا علم بردار ،اخوت ومساوات کا امین ،معاشی انصاف کا ضامن ،عزت وآزادی کا محافظ اورامن وخوشحالی کا پیغامبر ہے۔اے کاش کوئی اسے آزمائے!

ایک اہم سوال

مندرجہ بالاحقائق سے واقف ہونے کے بعد ایک غیر مسلم یہ سوال کرسکتا ہے کہ اسلام اگر اتنا ہی بہتر نظام ہے تو پھر آج کی مسلم سوسائیٹی اور مسلمان ممالک اس قدر پراگندہ حال بکھرے ہوئے، پسماندہ، کمزور اور دوسروں کے دست نگر کیوں ہیں؟ آج ان سے زیادہ ذلیل قوم دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ جہاں یہ اقلیت میں ہیں وہاں بھی اور جہاں یہ اکثریت میں ہیں وہاں بھی۔ ہر جگہ یہ مارے پیٹے اور ذلیل کئے جارہے ہیں۔ ذلت ونکبت ان کا مقدر بن گئی ہے۔ دولت واقتدار بھی ان کو اس ذلت آمیز حالت سے نکالنے میں ناکام ہے۔ سوال بجا اور اہم ہے۔ اس سوال کا بس ایک ہی جواب ہے کہ آج کی مسلم سوسائٹی اور مسلمان ممالک اسلامی اعمال ونظریات سے بہت دور ہیں اور وہ اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اسلام محض کوئی مان لینے کی چیز نہیں ہے۔ یہ وراثت میں ملنے والا دین نہیں ہے بلکہ ایک عملی نظام ہے۔ جس کی مخلصانہ پیروی سے ہی یہ نتائج رونما ہوسکتے ہیں۔ آج کی مسلم سوسائیٹی اور مسلمان ممالک اسلام کی مخلصانہ پیروی اگر زندگی کے جملہ معاملات میں شروع کردیں تو دیکھتے دیکھتے ان کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ اسلام ایک ایسا بیج ہے کہ جو بوئے گا پھل پائے گا جو نہ بوئے گا محروم رہ جائے گا اور کسی صاحب ایمان قوم کے لئے یہ محرومی دوگانہ ہوتی ہے۔ وہ دوہری مجرم ہے۔ ایک جرم حق کو نہ ماننے کا اور دوسرا کفران نعمت کا۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو کفران نعمت سے محفوظ رکھے اور اس کے اندر ذوق عمل پیدا کرے۔ (آمین)

ایک اپیل

آخر میں اہل ملک سے یہ اپیل کرنا چاہوں گا کہ وہ بیجا تعصب اور تنگ نظری میں مبتلا ہوئے بغیر اسلام کا سچے دل سے اور سائنٹفک مطالعہ کریں اور اگر ان کی سمجھ میں یہ بات آئے کہ اسلام ایک بہتر نظام حیات ہے تو اس کا تجربہ کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں یہ سمجھنا کہ یہ نام نہاد مسلمانوں کا دین ہے غلط ہے۔ اپنے قومی تفاخر میں مبتلا ہوکر کسی سچی بات کو جھٹلا دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ البیرونی جو محمود غزنوی کے حملہ کے وقت ہندوستان آیا تھا اس نے اپنی کتاب ''کتاب الہند'' میں ہندوستانی ذہن کا ایک تجزیہ پیش کیا ہے جس کے بارے میں، ایم، پانیکر جو ملک کے ایک ممتاز

تاریخ داں اور ماہر تعلیم گذرے ہیں کا خیال ہے کہ ''وہ ایک واضح مشاہدہ پیش کرتا ہے'' ہندوؤں کے بارے میں البیرونی کہتا ہے:

''ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ان سے بہتر ملک کوئی دوسرا نہیں، ان سے بہتر کوئی دوسری قوم نہیں، ان کے بادشاہوں جیسا کوئی بادشاہ نہیں ان کے علم جیسا کوئی علم نہیں''

پروفیسر پانیکر کے خیال میں یہ بیجا احساس برتری ہے۔ آج دنیا سمٹ کر چھوٹی ہوگئی ہے پہلے علم و تجربات کی ترسیل کا کوئی مناسب ذریعہ نہیں تھا اس لئے اس وقت اگر کوئی قوم یا گروہ کسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا تھی تو اس کو لائق معافی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اب اس طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو جہالت ہی کہا جاسکتا ہے ۔ خاص طور سے اس ماحول میں کہ ہم نئے نئے نظریات وخیالات کو اپنا رہے ہیں اور ہر روز ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ رگ وید کی تعلیم کی رو سے ''اچھے خیالات کو ہر طرف سے آنے دو'' کے مطابق اپنے دل کا دروازہ کھلا رکھئے اور اپنی زندگی سے حق پسندی اور حق پرستی کا ثبوت دیجئے۔

آخری بات

اس موقع پر میں مسلمان طلباء نوجوانوں اور عام مسلمانوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا اسلام کو محض نظری طور پر قبول نہیں کرے گی اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اخلاص کے ساتھ اسلام کی عملی نمائندگی کریں اور اپنے سماج کو اسلامی بنانے کی کوشش کریں۔ نیز اس پیغام کو بھارت میں روشناس کرانے کے لئے ایک باضابطہ اور منظم منصوبہ بنائیں اور پوری امت کو متحد و منظم کر کے اس دعوت کو عام کرنے کی کوشش کریں تبھی برف پگھلے گی اور آگے کی راہ کھلنے کا امکان پیدا ہوگا۔ اس کے لئے علم و کردار کسے ساتھ صبر و حکمت کی ضرورت ہے۔ یہ وقت اجتہاد فکر کے ساتھ اتحاد عمل کا ہے۔ پھر کہیں سے ڈھونڈ کر لا اسلاف کا قلب وجگر۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ العنکبوت۔ ۶۹)

اسلام ایک دعوت ایک تحریک

اسلام غلط فہمیوں کے گھیرے میں

آج ہم انسانی تاریخ کے بہت ہی بحرانی دور سے گذر رہے ہیں۔ بعض تاریخی عوامل کے زیر اثر اب سے دو صدی پہلے مشرق و مغرب کے سواد اعظم نے مادی تہذیب کے زیر اثر مذہب اور مذہبی تصورات سے چھٹکارا حاصل کر کے کچھ نئی قدروں کی بنیاد پر معاشرہ کی تشکیل شروع کی۔ بظاہر یہ بڑا ہی انقلابی قدم تھا جس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن افسوس جس چیز کو اکسیر سمجھ کر استعمال کیا گیا تھا وہ زہر ہلاہل نکلا اور بہت جلد یہ پتہ چل گیا کہ اگر ہم اسی رخ پر چلتے رہے تو ہمیں تباہی کے گہرے غار میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ انسانیت نجات کی راہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن تمام راہیں مسدود اور تمام دروازے مقفل معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن نت نئے نظریات وافکار کی اختراع کرتے کرتے تھک گیا ہے اس کے اندر نمود و ارتقا کی تمام صلاحیتیں گویا ختم ہو چکی ہیں اور وہ سخت الجھن میں گرفتار ہے کرے تو کیا کرے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے لیکن ٹھیک اسی شکل میں نہیں جس شکل میں اس نے پہلی بار خود کو پیش کیا تھا۔ اس لئے اکثر لوگ کسی واقعہ کی ظاہری شکل دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ یہ واقعہ تاریخ میں نیا ہے۔ لہذا اس کی توجیہہ کے سلسلے میں کسی نئے طرز فکر کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی فطرت ایک مستقل ساخت رکھتی ہے۔ لہذا چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا انداز و معیار ایک سا رہتا ہے لیکن اس کے Technique اور Approach میں وقت اور حالات کے تحت بنیادی تبدیلی آچکی ہوتی ہے اس لئے آدمی اس کو نیا طرز فکر اور نئی طرح سمجھنے لگتا ہے جب کہ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے نقش اول کا نقش ثانی یعنی پرتو ہی ہوتا ہے۔ انسان کا علم چونکہ محدود ہے۔ اور تجربات کے وسیع کینوس پر اس کی پوری گرفت نہیں ہوتی اس لئے اس کا مطمح نظر محدود ہو جاتا ہے اور وہ تاخیر و تقدیم کے چکر میں پھنس کر قدیم و جدید کی خود ساختہ اصطلاحوں میں گم ہو جاتا ہے۔

انسانی تاریخ ہمیں ایک تسلسل کا پتہ دیتی ہے جس کی روانی دریا کے بہاؤ کی مانند ہے یہاں نہ ہمالیہ جیسی اونچائی ہے اور نہ سمندر جیسی گہرائی، بلکہ سطح آب پر ہلکی ہلکی موجوں کا ترنگ ابھرتا ڈوبتا نظر آتا ہے، کبھی کبھی جوار بھاٹے بھی آٹھتے ہیں لیکن اس کے تسلسل اور بہاؤ میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ زمانہ ایک وحدت ہے جسے ہم خانوں میں تقسیم نہیں کرسکتے ہیں۔ کیلنڈر کی تاریخیں، تقدیم وتاخیر کا فلسفہ قدیم وجدید کی باتیں یہ سب اضافی حقیقتیں ہیں جو محض ہندساتی مفروضے (Arithmatical Hypothesis) ہیں جن کے ذریعہ چیزوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے چنانچہ اساطیر الاولین کی پھبتی اپنے آپ میں غلط ہے جو چیز قدیم ہے وہی جدید بھی ہے کیونکہ اس کا تسلسل قائم ہے ہاں! وہ چیز اپنا وجود کھودیتی ہے جس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

کائنات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر دیکھئے کیا چیز ہے جو کل قائم تھی آج نہیں ہے۔ چاند اور سورج کا نظام، ہواؤں کا چلنا۔ بارش کا ہونا، زمین کی گردش، دن اور رات کی الٹ پھیر، موسموں کی تبدیلی، ہر چیز مستحکم، مسلسل اور مدام، یہ ساری چیزیں جتنی قدیم ہیں اتنی ہی جدید بھی۔ ان کا تسلسل قائم ہے۔ نتیجتاً حیات انسانی کا تسلسل قائم ہے۔ یہ تو ہوا کہ آج سے سوسال پہلے کا کسان پھاوڑا اور ہل چلاتا تھا اور اس کے ذریعہ زمین کھود کر غلہ اگاتا تھا اور آج کا کسان ٹریکٹر اور ہارویسٹر سے کام لیتا ہے اور اس کے ذریعہ غلہ اگاتا ہے۔ پہلے وہ نہریں اور کنویں کھود کر پانی نکالتا تھا اور آج بورنگ گاڑ کر زمین کے آبی وسائل سے اپنی کھیتی سیراب کرتا ہے۔ پہلے وہ جڑی بوٹیوں کے ذریعہ اپنے دکھوں کا علاج کرتا تھا اور آج پیٹنٹ دواؤں کے ذریعہ علاج کرتا ہے۔ یہ ساری تبدیلیاں فنی ہیں۔ چیزوں کی خاصیت ان کی حقیقت وحیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بلکہ جدید فنی مہارت نے اس کی اہمیت دوبالا کردی ہے۔ اور اس کے بے شمار فوائد ظاہر ہونے لگے ہیں اور جیسے جیسے انسانی علم اور تجربات میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی چیزوں میں نکھار پیدا ہوتا جائے گا۔

یہ ساری کائنات انسان کی دشمن نہیں اس کی دوست ہے اور قانون فطرت کا اٹل نظام اس کی بقا اور دوام کے لئے ہے۔ اس لئے انسان کا کام فطرت سے لڑنا نہیں بلکہ اس سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے لہذا فطرت سے ہم آہنگی حیات انسانی کی ضمانت ہے۔ یہ انسانی ذہن کا کمال ہے کہ اس نے طبعی قوانین سے ہم آہنگی پیدا کرکے بہت سے پوشیدہ فطری رازوں کو واشگاف کیا اور

ایجادات واختراعات کی بھرمارلگادی۔جس نے تہذیب جدید کی صورت گری کی ہے۔

لیکن انسان اپنی سماجی ہیئت کوفطری قوانین کے حوالے نہ کرسکا۔اس تضاد عملی کے نتیجہ میں اس کی زندگی دوخانوں میں بٹ گئی جو باہم ایک دوسرے سے متصادم ہے نتیجتاً مادی اسباب ووسائل کی فراوانی کے باوجوداس کے دل کاسکون لٹ گیا ہے، راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے معاشرہ ظلم وفساد سے بھر گیا ہے اورتہذیب خودکشی پرآمادہ ہے۔انسانیت ایک جانکاہ کشمکش سے دوچار، داروئے شفا کی محتاج ،انتہائی کس مپرسی کے عالم میں بچاؤ! بچاؤ! کی صدالگارہی ہے۔لیکن کون ہے جواسے زندگی کے ازلی حقائق سے آشنا کرے؟مسیحا آپ ہی بیمار ہے۔

کسی معروضی بحث میں پڑے بغیر یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔لہذا انظام فطرت سے ہم آہنگ ہوکر ایک بہتر جہاں کی تعمیر کامنصوبہ پیش کرتا ہے جس طرح مادی اصولوں سے ہم آہنگی نے انسان کو کتنے وسیع وسائل وذرائع سے ہمکنار کردیا اورانسانی زندگی آسائشوں سے بہرہ ور ہوئی ٹھیک اسی طرح اگرانسان اپنے آپ کوان آفاقی اصولوں سے ہم آہنگ کرلے تو اس کے اخلاق وعمل میں ایسی خوشگوار تبدیلی آئے گی اوراس کا معاشرہ اتنا پرسکون اورخوش حال ہوجائے گا۔جس کا تصوربھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان حقائق کواچھی طرح سمجھنے کے لئے اسلام کو پورے شرح وبسط کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔

۱۔ دنیا میں اگر کوئی سب سے بڑا جھوٹ بولا جاتا ہے جس نے بنی آدم کی اکثریت کوگمراہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام صرف مسلمانوں کا دین ہے۔ یہ ایسی خلاف واقعہ بات ہے جس کی کوئی اصل نہیں ۔اسلام اپنی عین فطرت میں آفاقی اورلافانی ہے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی غلط فہمی جواس دین کواس کے تسلسل سے کاٹنے اوراس کی آفاقی اورلافانی حیثیت کومجروح کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔وہ یہ ہے کہ اس دین کی ابتدا محمد رسول اللہ ﷺ سے ہوئی گویا آپؐ بانی اسلام ہیں حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ محمدؐ رسول اللہ اسلام کے اول نہیں آخری نبی ہیں۔آپؐ کے بعد کوئی اورنبی نہیں آئے گا آپؐ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تکمیل

فرمادی جس کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہوئی تھی ۔اس طرح دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اعلان کر دیا ہم نبیوں کی وحدت میں کوئی فرق نہیں کرتے اس سلسلے کی مزید تفصیلات پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔

۳۔ بعض جدت طراز ذہنوں نے اسلام کو بھی ایک خود ساختہ نظریۂ حیات کی طرح ایک مخصوص تاریخی دور تک محدود رکھنے کی کوشش کی اور تہذیب انسانی کی ایک ارتقائی منزل قرار دے کر اس کے دوام کو تجدید کی نوٹس دے دی تاکہ اس کی افادیت وآفاقیت ذہنوں سے محو ہو جائے۔

۴۔ جب انسانی ذہنوں میں بگاڑ آتا ہے تو وہ اصول پسندی کے بجائے سمجھوتے کی روش اختیار کرتا ہے اور ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی بنیاد پر بقائے باہم کا نظریہ پیش کرتا ہے۔

انسانی نقطۂ نظر سے تو یہ ایک محمود طرز فکر ہے۔لیکن نظریاتی اعتبار سے انتہائی مہلک ۔اس کا لازمی نتیجہ غیر صالح عناصر کی کارفرمائی ہے۔جس کے نتیجہ میں معاشرہ میں فساد رونما ہوتا ہے اور ظلم کی نت نئی شکلوں کو رواج پانے کا موقع ملتا ہے اسی نظریہ کی کوکھ سے نظریہ نکلا ہے کہ تمام مذاہب حق ہیں اور سب کا یکساں احترام کرنا چاہئے ۔حالانکہ اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ لچر اور لوچ بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟ ایک مذہب ہے جس کا بنیادی عقیدہ توحید ہے دوسرا تثلیث کا قائل ہے اور تیسرا بیشمار دیوی دیوتاؤں کو اس کی ذات اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک مانتا ہے ۔اور کوئی سرے سے کسی خدا کے وجود کا ہی قائل نہیں ہے۔پھر بتائیے ان میں سے کون سا نظریہ صحیح ہے؟ کیا سب صحیح ہیں یا سب غلط ہیں۔یا اس میں سے کوئی ایک صحیح ہے اور باقی غلط ہیں ظاہر ہے اگر توحید کا عقیدہ صحیح ہے تو شرک اور تثلیث کا عقیدہ غلط ہے اور اگر موخر الذکر صحیح ہے تو اول الذکر غلط ہوگا یہ کیا کہ اندھیرا بھی ہے اجالا بھی ۔زندہ بھی ہے اور مردہ بھی ،دو میں سے کوئی ایک بات ہی ہوگی لیکن مذاہب کے بارے میں لوگوں نے صلح کل کی عجیب پالیسی اپنا رکھی ہے ۔میں یہ نہیں کہتا کہ جبراً کسی سے کوئی بات منوالی جائے لیکن جو حق ہے اس کا بابانگ دہل اعلان ہونا چاہئے ۔رہا کسی مذہب اور مذہبی شخصیت کو برا بھلا کہنا تو یہ عقیدے کا نہیں بلکہ اخلاق کا مسئلہ ہے۔اور اخلاق کا تقاضہ ہے کہ انسانی شرافت سے نیچے اتر کر کوئی بات نہ کی جائے۔

اسی غلط فکر نے اس بات کو جنم دیا ہے کہ اسلام دنیا کے عام مذاہب کی طرح ایک مذہب

ہے جو کسی انسانی ذہن کی اختراع ہے۔ اس کو ماننا تمام انسانوں کے لئے لازمی نہیں ہیں۔ یہ ہدایت کا کوئی واحد ذریعہ نہیں ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی طرح مسلمانوں میں بھی یہ نظریہ عام ہوتا جارہا ہے، اور وہ اپنے داعیانہ مقام سے دور ہٹتے چلے جارہے ہیں۔ اور اسی طرح مسلمان ایک قوم، رسول اللہؐ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی رہنما اور اسلام مسلمانون کا قومی مذہب بنتا جارہا ہے۔ اس پر مسلمان بھی خوش ہیں اور کافر بھی شادمان۔ اس لئے کفر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور مسلمان اپنے تنگ دائرے میں سمٹتے چلے جارہے ہیں جس سے کسی قیمت پر باہر نکلنا نہیں چاہتے۔

اسلام کے متعلق یہی وہ بنیادی غلط فہمیاں ہیں جنہوں نے لوگوں کے سوچنے کے انداز اور طرزِ عمل کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ جب کوئی چیز کسی خاص شخص یا گروہ کی ملکیت قرار دے دی جاتی ہے تو دوسرے لوگوں کی توجہ اور دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور اپنی طرف سے بھی بے پروائی کا اظہار لازمی طور پر ہوتا ہے۔ آج اسلام کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ ہے وہ یہی طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہے۔ جب تک اس کی اصلاح نہیں ہوتی اس وقت تک مسلمان قوم عالمِ انسانی میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے سے معذور رہے گی اور دنیا اسلام کے فیوض و برکات سے محروم رہے گی۔ جس کی ذمہ داری اور وبال سے یہ قوم نہ دنیا میں محفوظ رہ سکتی ہے نہ آخرت میں۔ لہذا وقت کا تقاضا ہے کہ اس غلط فہمی کے پردے کو چاک کیا جائے اور مسلمان نوجوانوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس خوابِ گراں سے بیدار ہوں اور اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آگے آئیں۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں ، خوابِ گراں ، خوابِ گراں خیز

اسلام ایک آفاقی دین

اسلام عین اپنے مفہوم میں قومی، علاقائی اور شخصی حد بندیوں سے پاک ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب یا تو کسی شخصیت کے نام سے موسوم ہیں یا کسی قوم کے نام سے یا کسی خطہ اور قبیلہ کے نام

سے مثلاً جین دھرم اور بدھ دھرم کو لے لیجئے یا عیسائیت ، زرتشیت اور کنفیوشش کو لے لیجئے یہ تمام مذاہب اپنے اپنے پیشواؤں کے نام سے موسوم ہیں۔ قومی اعتبار سے یہودیت قابل ذکر ہے۔ اور علاقائی اعتبار سے ہندو مذہب کا خاص طور سے نام لیا جاسکتا ہے ۔ الغرض مذاہب کے جنگل میں ہر مذہب کسی خاص قوم خطہ اور شخصیت سے وابسطہ ہے جس کو اپنی حد بندی سے آگے جانے کی نہ فرصت ہے نہ اجازت ہے۔ جین دھرم، زرتشیت ، یہودیت اور ہندومت خالص علاقائی مذاہب ہیں اور یہ مخصوص قوم سے وابستہ ہیں ۔ وہاں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی شخص جو اس قوم میں پیدا نہیں ہوا اس کو ہم عقیدہ بنایا جائے یہ تمام مذاہب حق کو انتہائی محدود اور قابل تقسیم اکائی سمجھتے ہیں چنانچہ ان کا سماج ایک شدید قسم کے اندرونی تضاد اور طبقاتی تفاوت کا شکار ہے اور عملی طور پر دنیا کو دینے کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

موجودہ عیسائیت ایک فریب محض ہے یہ اپنی اصل میں کوئی تبلیغی دین نہیں ہے آج بھی بائبل میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول موجود ہے کہ ''میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کر رہا ہوں اور غیر بنی اسرائیل کو دین کی دعوت دینا ایسا ہی ہے جیسے بچوں کی روٹی کتوں کے حوالے کر دی جائے۔'' اب عیسائیت نے جو تبلیغ کا روپ دھارا ہے یہ بھی دراصل مغرب کے سامراجی عزائم کا ایک حصہ ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تبصرہ موجودہ عیسائیت پر ہے نہ کہ نفس دعوت عیسوی پر کیونکہ وہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو الہامی اور آفاقی ہے جس کو اسلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت اپنی موجودہ شکل میں ایک محرف دین ہے جس کا اقرار خود عیسائی علماء اور محققین کرتے ہیں۔ بہرحال عیسائیت ایک نقلی دین ہے اور اس کی اصل اسلام ہے۔

یہاں ایک پہلو اور بھی قابل لحاظ ہے کہ عیسائیت کی بنیاد رہبانیت تھی جس کے باعث مغربی سماج نے اس کو ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیا پھر یہ باقی دنیا میں کس طرح قابل عمل ہوسکتی ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے یہی وجہ ہے کہ عیسائیت نے قیصر اور چرچ کا حق بانٹ رکھا ہے اور روم میں ویٹیکن سیٹی سے باہر جھانک کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا ہے ۔ یہ تو مغربی سیکولرزم کی رواداری کا کمال ہے کہ اس نے عیسائیت کو ایک جائے پناہ دیدی اور تیسری دنیا کے ممالک میں

مشینریز کا جال پھیلا کر اور مال و منال عطا کر انہیں چرنے چگنے کا موقع دیا۔ ورنہ جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے یہ کب اپنی موت آپ مر چکی ہوتی۔

بدھ مت دراصل کوئی مذہب نہیں یہ ایک مت ہے۔ مذہب کے لئے ضروری ہے کہ الہامی ہو اور کم از کم خدا کے وجود کا قائل ہو۔ بدھ مت کا پورا فلسفہ اگر اس بنیادی سچائی کی نفی نہیں کرتا تو بالکل خاموش ضرور ہے۔ یہ اس بات کی غماز ہے کہ اس کو حقیقت کا سراغ سرے سے لگا ہی نہیں یہ ایک ذہنی روتھی جس نے علائق دنیا سے بھاگ کر نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ یہ ہندو مذہب کی تعلیمات کا چربہ ہے جس کو مہا تما بدھ کی حرکی وجود نے تحریک عطا کی اور چونکہ اس دور کے مروجہ ہندو سماج کے خلاف یہ ایک ردعمل بھی تھا اس لئے پسماندہ اور نچلی ذات کے لوگوں نے اس کو اختیار کیا اور جب شہنشاہ اشوک کی سرپرستی اس کو حاصل ہوئی تو پڑوسی ممالک میں تیزی سے پھیل گیا۔ اس طرح تاریخی اعتبار سے اس کو ایک تبلیغی نظریہ کہا جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ دنیا کی رہنمائی کے لئے ایک ناقص اصول ہے جہاں زندگی اور اس کے مسائل سے بار بار کے جنم سے نجات پانا بتایا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ موجودہ عیسائیت کی بہن ہے جو آج کے انسان کے لئے اگر بالکل ناقابل التفات نہیں تو ناقابل عمل ضرور ہے۔

اس تفصیل سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام عین اپنے مفہوم میں گروہی، نسلی اور قومی حد بندیوں سے پاک ہے اور کسی خاص شخص قوم اور خطۂ ارض سے منسوب ہونے کے بجائے ایک فطری آفاقی اور دائمی دین ہے۔ جو پوری طرح فطری اصولوں سے ہم آہنگ ہے جس پر یہ نظام کائنات قائم ہے اور گردش کر رہا ہے اور انسانی زندگی پر اس کے قیام سے ہی انسانیت کو سچا امن اور سچی خوشحالی مل سکتی ہے جس کی تصدیق نظام کائنات کے ذرے ذرے سے ہو رہی ہے۔

اسلام کے اساسی تصورات: اسلام کا لغوی مفہوم اطاعت وفرمابرداری ہے۔ اصطلاحی معنوں میں اللہ کی فرماں برداری اور اطاعت کو اسلام کہا جاتا ہے اور جو شخص اللہ کی فرماں برداری اور اطاعت میں زندگی گذارتا ہے اسے مسلمان کہتے ہیں یہاں کسی تفصیل میں جانے سے پہلے اسلام کے اساسی تصورات کو ذہن نشیں کر لینا ضروری ہے۔

(۱) اس آسمان وزمین کا بلکہ محسوس اور غیر محسوس ساری کائنات کا خالق، مالک، آقا، نگہبان،

پرورش کرنے والا اور حاکم ایک اللہ ہے۔ یہی توحید ہے۔ خدائے واحد کی تخلیق کردہ ایک مخلوق انسان بھی ہے جو کائنات کی دوسری تمام مخلوقات سے اشرف وافضل ہے کیونکہ اسے عقل وارادہ عطا کیا گیا ہے اور کائنات میں اسے یک گونہ خود اختیاری اور تصرف کا حق حاصل ہے۔

(۲) خدا نے انسان کو یونہی باختیار اور صاحب تصرف بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ کائنات میں پائی جانے والی ہر چیز کی طرح انسانوں کی بھی صحیح راہ حیات کی طرف رہنمائی کی ہے اور تخلیق کا مقصد بتایا نیز اس کے آخری انجام سے باخبر کیا ہے۔ یہ علم اور ہدایت انسان کو جس ذریعہ سے ملی وہ رسالت ہے۔ رسالت یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں میں سے ہی کچھ لوگوں کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا جو خدا کی طرف سے بندوں کے علم وہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا جو تمام مذہبی کتابوں کی رو سے اس سرزمین پر پہلے نبی تھے اور جن کی نسل سے ہی تمام انسان پیدا ہوئے اور محمد رسول اللہؐ پر ختم ہو گیا۔ آپؐ دین اسلام کے آخری نبی اور رسول ہیں آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔ کیونکہ آپؐ کی ذات پر اللہ تعالیٰ نے اس دین کو مکمل کر دیا اب رہتی دنیا تک قرآن اور محمدؐ کی ذات و تعلیمات (سنت) انسانیت کی رہنمائی اور ہدایت کا واحد اور مکمل ذریعہ ہے۔

(۳) رسولوں کے ذریعہ دیئے گئے علم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کو عقل وارادہ کی آزادی، خود مختاری اور تمام مخلوقات پر برتری یونہی نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ یہ اختیار خصوصی اور یہ منصب امتیازی، ایک خاص امتحان ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر ہی ابدی فلاح یا خسران منحصر ہے۔ ہر چیز کی مدت حیات مقرر ہے فرد کی بھی، سماج کی بھی اور اس مادی کائنات کی بھی۔ فرد کی مدت حیات بہت مختصر ہوتی ہے سماج کی اس سے طویل اور کائنات کی اس سے طویل کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان کے اصول پر ایک مدت خاص کے بعد جس کا صحیح صحیح علم اللہ ہی کو ہے یہ دنیا لپیٹ دی جائے گی پھر اللہ تعالیٰ اس کے ملبے سے دوسری دنیا تعمیر کرے گا اور اس دنیا میں کئے گئے ذرہ ذرہ اعمال کا حساب کتاب لے گا جس نے اس کی پیش کردہ نظریۂ حیات کو مانا ہوگا اس کے مطابق صالح عمل کیا ہوگا وہ وہاں کامیاب ہوگا اور ابدی فلاح کی

جگہ جنت پائے گا اور جس نے اس سے انکار کیا ہوگا اوران اعمال کی پرواہ نہیں کی ہوگی جو خدا کی نظر میں پسندیدہ ہیں تو وہ ناکام ہوگا اورابدی خسران کی جگہ جہنم میں جائے گا۔پس یہ زندگی اپنے انجام کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ انسان کو بہت ہی مختصرسی مدت کے لئے صرف ایک بار ملتی ہے اوراس کی صحیح قدرشناسی پر ہی اس کی فلاح ونجات مضمر ہے۔اس لئے ہرانسان کا فرض ہے اوراس کی عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ نبی کے ذریعہ پیش کردہ ہدایات پرایمان لاتے ہوئے عمل کرے یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کواختیار کرکے وہ ابدی ناکامی ونامرادی اورخسران سے محفوظ رہ سکتا ہے اورفلاح وکامرانی سے ہمکنار ہوسکتا ہے ۔فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِي الْاَبْصَارِ

(۴) چوتھی بات کہ انسان خدا کا بندہ ہے اورایک دوسرے کے مقابلے میں بالکل مساویانہ حقوق کا مالک ہے۔انسان اور انسان میں کسی طرح کا امتیاز غلط ہے ہرانسان دعوت کا یکساں مخاطب اورخدا کے سامنے اپنے اعمال کا یکساں ذمہ دار ہے اوراپنے کئے کا یکساں بدلہ پائے گا۔اس طرح اسلام انسانوں کوایک پلیٹ فارم پرلا کھڑا کرتا ہے اوردوئی کے ہرنقش کومٹا کر وحدت آدم کا زوردارنعرہ لگاتا ہے اورسوال کرتا ہے جب خدا ایک ہے اوراس کا تخلیق کردہ انسان بھی ایک ہے تو پھر یہ دوئی اور تضاد کیسا؟ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ جب خدا ایک ہے اورانسانیت اپنی اصل کے اعتبار سے ایک وحدت میں پروئی ہوئی ہے تو مساویانہ سلوک کے پیش نظر سب کے لئے ایک ہی نظام ہونا چاہئے اور جب سب کے لئے ایک نظام ہوگا تو وہ ذریعہ بھی ایک ہی ہونا چاہئے جس سے انسان کو یہ علم اور ہدایت حاصل ہوتی ہے اس طرح اسلام بدیہی طور سے پوری انسانیت کا نعرہ ہے اوراس کا دیا ہوا نظام اللہ کے بندوں کووحدت ومساوات کے دھاگے میں پرودینے کا سب سے معتبر اورموثر ذریعہ ہے۔ یعنی اسلام کسی کی جاگیرنہیں بلکہ ہوا،سورج، پانی، زمین اورآسمان کی طرح سب کا سرمایہ ہے اورسب کے لئے ہے۔اسی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام اصل میں ایک دعوت ایک تحریک ہے جس کا مقصد تمام انسانوں کوخدا کی طرف بلانا اورابدی فلاح کی راہ دکھانا ہے تاکہ دوئی،فساد،ظلم وتفاوت ختم ہواور ساری انسانیت اللہ کا کنبہ بن کرصلاح

وفلاح کے اصول پر دنیا میں زندگی گذارے اور اپنے خالق کی مرضی پوری کرے۔ جو اس کا مقصد وجود ہے۔

اسلام دین کائنات

اب دیکھئے کہ نظام کائنات کس طرح اسلامی اصولوں یعنی خدا کی اطاعت وفرمانبرداری پر استوار ہے۔ اس دور کے مٹھی بھر دہریوں کو چھوڑ کر دنیا کے سارے انسانوں کا جب سے دنیا بنی ہے یہ عقیدہ رہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کسی بااختیار صاحب اقتدار، صاحب وسیلہ اور بہترین صنّاع اور کارساز ہستی نے کی ہے۔ اسی جلیل القدر ہستی کا نام اللہ ہے۔ قرآن جھنجھوڑ دینے والے انداز میں سوال کرتا ہے ان سے پوچھو کس نے زمین اور آسمان کی تخلیق کی؟ کہو اللہ نے یا وہ یقیناً کہیں گے اللہ نے! گویا یہ اندرون کا ادراک ہے یا عقل عام کی گواہی۔ جو سائل کے سوال پر جھٹ بول اٹھتا ہے اللہ نے! کیوں؟ اس لئے کہ جب انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اپنے گردوپیش کو دیکھتا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں پر نظر ڈالتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ جس ہوا میں وہ سانس لے رہا ہے جس زمین پر چلتا پھرتا ہے جس آسمان کی چھت کے نیچے وہ بس رہا ہے جس سورج سے روشنی اور توانائی حاصل کرتا ہے جس بارش سے اپنی کھیتی سیراب کرتا ہے۔ جس پانی کو پی کر فرحت اور سکون حاصل کرتا ہے جب دن آتا ہے تو کام میں جٹ جاتا ہے اور جب رات آتی ہے تو آرام وسکون کی خاطر نیند کی آغوش میں پناہ لیتا ہے تو وہ سوچتا ہے یہ سب کیا ہے؟ ان سب کو کس نے بنایا ہے؟ اور وہ ان سب کی پابندی کرنے پر کیوں مجبور ہے؟ جب وہ اس پر غور کرتا ہے تو پہلی حقیقت جو اس پر واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مظاہر کائنات میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تخلیق اس نے یا اس جیسے کسی انسان کی ہو چاہے وہ دور جدید کا انسان ہو یا دور قدیم کا۔ دوسری بات جو اس پر واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نظام کائنات اس کی پابند نہیں ہے بلکہ وہ اس نظام کائنات کا پابند ہے۔ لہٰذا جینے کے لئے اسے فطرت سے مطابقت کرنا پڑتی ہے اور وہ ایسا نہ کرے تو اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے پر اسے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جس طرح وہ فطری ضابطوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہے

ٹھیک اسی طرح کائنات کا ذرہ ذرہ ایک لگے بندھے ضابطے کے تحت سرگرم عمل ہے۔ سورج روزانہ پورب سے نکلتا ہے اور پچھّم میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ معلوم کب سے چلتا آرہا ہے۔ اور کب تک چلتا رہے گا۔ اس میں وہ اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح نظام کائنات کی کوئی چیز اپنے اجزائے ترکیبی میں اپنے مطلب سے کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی نہ اپنی خاصیت بدل سکتی ہے اور نہ اپنا فطری منصب اور مقام چھوڑ کر الگ کوئی راہ اپنا سکتی ہے گویا یہ کائنات قائم ہے اور اسے ہی دین فطرت کہتے ہیں۔ قرآن ان آثار و آیات پر غور کرنے کی تلقین کرتے ہوئے واشگاف انداز میں کہتا ہے:

> ترجمہ ''بلاشبہہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں دن اور رات کے باری باری آنے میں۔ ان جہازوں میں جو سمندر میں لوگوں کے لئے فائدہ مند چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس بارش میں جسے اللہ نے آسمان سے اتارا پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور ہر طرح کے جانور اس نے اس میں پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے بیچ کام پر لگا رکھے گئے ہیں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔'' (۲۔۱۶۴)

اور عقل سے کام لے کر بہر حال آدمی اتنا تو جانتا ہے اور جان ہی سکتا ہے کہ یہ تمام کائنات کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر ہے جس سے روگردانی اور سرتابی کی کسی میں جرأت نہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن تعجب کے ساتھ انسانوں سے پوچھتا ہے کہ تم اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ پسند کرتے ہو جب کہ کائنات ارضی و سماوی طوعاً و کرھاً اللہ کی بندگی میں مصروف ہے:

> ترجمہ '' کیا یہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں جب کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب چار و ناچار اسی کی بندگی کرتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔'' (۳۔۸۲)

اس طرح اسلام نظام فطرت سے ہم آہنگی کی دعوت کا دوسرا نام ہے۔

اسلام کا دوسرا مفہوم سلامتی ہے نظام کائنات سے ہم آہنگ ہوجانے کے بعد انسان اور کائنات کے درمیان تضاد ختم ہوجاتا ہے نیز انسان کے درمیان فطری اصولوں پر استوار تعلق پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے کش مکش جو باطل نظریات کی کارفرمائی کی وجہ سے انسانی آبادی میں برپا ہوتی ہے اس سے نجات مل جاتی ہے اور اُخروی انجام کے اعتبار سے بھی وہ مامون ومحفوظ رہتا ہے اس کو ایک مثال سے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دو بھائی اپنے اپنے حق کے معاملے میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور ہر ایک اس کش مکش میں زیادہ سے زیادہ طاقت کے زور پر ہڑپنے کی کوشش کرتا ہے جب تک ایک کا حق دوسرے کے یہاں زیادہ ہوگا یا دوسرے کو اس کا حق پورا نہیں ملے گا کش مکش اور نزاع باقی رہے گی لیکن جب کوئی منصف ان کے درمیان عدل کے مطابق دونوں کے حقوق برابر برابر بانٹ دے گا تو یہ نزاع خود بخود ختم ہوجائے گی۔ اور دونوں سلامتی کے ساتھ زندگی گذارنے لگیں گے۔ اسی طرح اگر پورا معاشرہ عدل وانصاف کی بنیاد پر قائم ہوجائے تو پرامن بقائے باہم کی راہ ہموار ہوجائے گی اور کوئی کش مکش باقی نہیں رہے گی۔

اسلام ہر طرح کے خسارے سے بچنے کے لئے ایک نظام عدل ہے جو قائم بالقسط ہے جس میں ہر ایک کے حقوق کی عادلانہ بنیادوں پر پاسداری کی جاتی ہے اور حقوق وفرائض کا ایسا میزان متعین کیا جاتا ہے جس میں کسی کو نہ اس کے فرائض سے زیادہ حقوق دیئے جاتے ہیں اور نہ حقوق سے زیادہ فرائض بلکہ دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اس میزان عدل کو جب آدمی ٹھکرا دیتا ہے تو دنیا شر وفساد سے بھر جاتی ہے اور انجام کار خسارے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

> ترجمہ: ’’خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے فساد برپا ہوگیا ہے تاکہ انہیں ان کے کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ وہ (غیرحق پرستانہ طرز عمل) سے باز آجائیں۔ (۳۰۔۴۱)

گویا انسانیت پر آج یا آج سے پہلے جو بھی تباہی آئی ہے اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے فطرت سے ہم آہنگی نہیں برتی یعنی اسلام کے فطری اصولوں کی اتباع نہیں کی جس کے نتیجے میں فطرت اور انسان کے درمیان کش مکش برپا رہی جس نے ایک فساد کی شکل اختیار کر لی ہے

اس جرم کی پاداش میں انسانیت کئی بار تباہ ہوچکی ہے اوراب تو ایسی صورت حال ہے کہ یہ اگر عقل وہوش سے کام نہیں لے گی تو مکمل تباہی سے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا یہ تو دنیا میں وہ انجام ہے جو بدیہی ہے اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے لیکن اسلام کی رو سے دنیا بس یہی نہیں ہے بلکہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

چنانچہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا سارا انحصار اسی فطری اصول کی اتباع پر ہے ایسے لوگ جو ان فطری اصولوں کی اتباع نہیں کرتے اوراپنے طور پرنت نئے ضابطے طے کرکے خود بھی ہوس پرستانہ زندگی اختیار کرلیتے ہیں اور دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں تو ان کا پیش کردہ دستور ہرگز تسلیم نہیں کیا جائے گا اوراس لحاظ سے اس کالازمی انجام خسارے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔قرآن کا واضح اعلان ہے:

ترجمہ:’’جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ کبھی اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ٹوٹا پانے والوں میں سے ہوگا۔(۳۔۸۵)

اس طرح اسلام دنیا کے مختلف مذاہب میں سے کوئی مذہب نہیں جس میں کچھ جزوی سچائی پائی جاتی ہے۔بلکہ یہ فطرت کا وہ اصول ہے جو نظام کائنات سے مطابقت رکھتے ہوئے انسان کے فکروعمل کو واحد راستے کی طرف موڑ دیتا ہے اور دوسری ہر پگڈنڈی پر سے گذرنا ممنوع قرار دیتا ہے۔اس لئے کہ دوسری ہرراہ انسان کو جہنم کی طرف لے جاتی ہے جب کہ اسلام آدمی کو جنت نعیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔اسی لئے قرآن کریم میں اسلام کو الصراط المستقیم The Only Straight Way کہہ کرپکارا گیا ہے اورفرمان ربانی کے ذریعہ دنیا والوں سے خواہ کسی خطہ اورملک کے باشندہ ہوں۔کسی عہد میں رہتے ہیں صاف صاف باخبر کیا گیا ہے۔

ترجمہ:’’اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔جن کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے اختلاف اس کے بعد کیا کہ علم ان کے پاس آچکا تھا ایسا انہوں نے محض ایک دوسرے پرزیادتی کرنے کے لئے کیا جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کریں گے تو وہ جان لیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔اگر وہ لوگ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو میں نے اورمیرے ماننے والوں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا

ہے۔(۳۔۱۹)

اسلام کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کی غلامی نیز خدا کے سوا ہر دوسری چیز کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔اسلام کی نظر میں زمین اور آسمان کی ساری چیزیں خواہ وہ سورج اور چاند ہو یا دریا اور پہاڑ کوئی بڑا انسان ہو یا جانور۔آگ اور پانی ہو یا بادصرصر سب خدا کی مخلوق ہیں اور ہر ایک اپنے دائرے میں نظام فطرت کی پابند اور ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔گویا یہ سب کسی پیچیدہ مشین کے پرزے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر کافی اہم ہیں لیکن کوئی کسی کا حاکم نہیں ہے ان کی افادیت باہمی تعاون میں ہے اس طرح اسلام انسان کو مخلوق پرستی کے غار سے نکال کر آزادی کی وسیع فضا میں پرواز کا حکم دیتا ہے ۔ اسلام کے نزدیک انسان تمام مخلوقات میں اشرف وافضل ہے۔لہذا یہ انسانیت کے منصب اور مقام سے فروتر ہے کہ انسان اپنے جیسے انسان یا کسی دوسری مخلوق کے آگے سر جھکائے اور پناہ واستعانت کی درخواست کرے۔اس کائنات میں سب سے برگزیدہ وجود فرشتوں کا ہے جو ہر وقت احکام خداوندی کی اتباع میں سرگرم عمل رہتے ہیں وہ انتہائی معصوم اور گناہ کے ہر شائبے سے پاک ہوتے ہیں لیکن انہیں اس کائنات میں تصرف اور خود اختیاری کی اجازت حاصل نہیں ہے جب کہ انسان کو تصرف اور اختیار کی آزادی حاصل ہے۔ اللہ نے فرشتوں کو انسان کے سامنے جھکا کر اور لقد کرمنا بنی آدم کا اعلان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی عظمت کا اعلان کر دیا۔اب کون ہے جو انسان کے سجدوں کا مستحق ہوسکتا ہے؟ اس کے سجدوں کا مستحق اللہ واحد کی ذات کے سوا کوئی نہیں!

اس طرح اسلام نے ایک طرف شرک وبت پرستی اور اوہام وخرافات کا قلع قمع کر دیا اور دوسری طرف اپنے جیسے انسانوں کی عملی اور فکری غلامی سے نجات دلائی۔ ہر انسان اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کا بندہ ہے نہ کہ ایک دوسرے کا مالک اور ہر ایک پر خدائی ضابطہ کی اتباع فرض ہے۔ اگر کوئی انسان کسی وقت اجتماعی معاملہ کا ذمہ دار بھی بنتا ہے تو وہ مالک نہیں ہوتا اور نہ اسے من مانا تصرف کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اسے اس خدائی ضابطے کے تحت بندگئ رب کے جذبے سے لوگوں کے حقوق اسی میزان ومقدار میں ادا کرنے ہوتے ہیں جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور وہ معاملات جن میں خدائی ضابطہ واضح رہنمائی نہیں کرتا ان کو وہ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے احساس

بندگی کے ساتھ باہمی مشاورت سے ادا کرتا ہے تا کہ ظلم کا شائبہ بھی باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی حاکم کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔جس کے معنی نیابت کے ہیں وہ خدا کی طرف سے بندوں کی نیابت کرتا ہے وہ دوہری جوابدہی میں گھرا ہوتا ہے اس کی غلط روش پر دنیا میں اسے برطرف کرنے کی اجازت ہے اورآخرت میں برے انجام سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے ۔اس طرح اسلام دنیا کا واحد نظریہ انقلاب ہے جو انسانوں پر انسانوں کی ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ کر دیتا ہے جب کہ ہر نظام چاہے وہ قومی ہو یا سامراجی ،طبقاتی ہو یا خاندانی ،جمہوریت کے پردے میں ہو یا شہنشاہیت کے لباس میں انسانوں پر انسان کی غلامی کو مسلط رکھنے میں سب یکساں ہیں۔ان تمام نظام ہائے حیات میں اختراعی فکر کو آخری سچائی تسلیم کرتے ہوئے اتباع کو لازم گردانا جاتا ہے اور بصورت انکار آج بھی جیل ہے، پھانسی ہے سزائے موت اور جلاوطنی ہے۔انسانوں کو انسان کی غلامی سے نجات کی دعوت دیتے ہوئے نبیؐ نے ایک مکتوب میں ارشاد فرمایا'' کہ تم کو بندوں کی غلامی سے خدا کی غلامی کی طرف بلاتا ہوں اور تمہیں بندوں کی آقائی سے خدا کی آقائی کی طرف پکارتا ہوں''

بندوں کی غلامی سے نجات کی واحد ضمانت یہ ہے کہ آدمی طاغوت سے کفر کرے اور مومن باللہ بن کر رہے تا کہ ہر حال میں ایک مضبوط سہارا اس کی دست گیری کو موجود ہو قرآن پکار پکار کر کہتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰه فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲-۲۵٦)

ترجمہ: اور جس نے طاغوت سے کفر کیا اور ایمان لایا اس نے ایسا مضبوط سہار اتھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔اس طرح اسلام دین فطرت ہونے کی وجہ سے انسانی آزادی وحریت کا ضامن بھی ہے۔

روسو نے حریت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ وہ غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے''لیکن وہ اس کو واضح نہیں کر سکا کہ اس بندھن کو کس طرح کاٹا جائے جو لوگوں کی اقتدار طلبی اور ہوس پرستی کی وجہ سے انسانی سماج کے پاؤں میں پڑی ہے جس کے بوجھ سے ہر شخص کراہ رہا ہے۔فرانس کا انقلاب حریت اگرچہ شاہی خاندان کے خاتمہ کا سبب بنا اور

اس جگہ جدید یورپ کے انسانوں کو حریت ،مساوات اور انسانی برابری کے اعلیٰ تصورات سے، تعارف حاصل ہوالیکن یہاں بھی انسانوں پرانسانوں کی غلامی برقرار ہی ۔دھیرے دھیرے تانا شاہوں اور سامراجی دیوؤں نے جمہوری قبا اوڑھ کرانسانی آبادی کو بدستور اپنی غلامی میں رکھنے کی رسم جاری رکھی اورنت نئے پردوں میں مستور ہوکرظلم کے پہاڑ توڑے۔جمہوریت اگر چہ موجودہ ازموں میں حقوق انسانی کی پاسداری کے لحاظ سے اہم اور بہتر ہے۔لیکن اس کا ڈھانچہ اپنی موجودہ شکل میں جسم بے روح ہے۔بفرض محال اگراس کو اپنے حقیقی روپ میں نافذ بھی کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ذہن کی اختراع کی حکومت باقی رہے گی اور اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پرحق وباطل کے فیصلے ہوتے رہیں گے۔بہر حال موجودہ جمہوریت نئی بوتل میں پرانی شراب ہی ہے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔جمہوریت کے پاس اقدار کی کوئی مستقل میزان نہیں۔اکثریت کی رائے ہمیشہ حق ہوگی چاہے وہ بداخلاقی اور سود کے حق میں ہو یا شراب نوشی کے حق میں اور اقلیت ہمیشہ مطعون ہوگی چاہے سچائی کی علم بردار ہو۔یہاں جیسے لوگوں کی حکومت ہوگی وہ اپنی فکر مسلط کرنے کی کوشش کریں گے اوراس کی خلاف ورزی قابل گردن زدنی جرم قرار دیا جائے گا۔ان کا دستور ظالموں کے لئے کھلی چراگاہ ہوگا۔جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق من مانی کریں گے اور خلق خدا نجات کی کوئی راہ نہ پاکران کی دست نگر بنی رہے گی۔عالم انسانیت کوظلم کی اس چکی سے نکالنے کے لئے ہی اللہ نے اپنے رسول بھیجے جس کی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے قرآن اعلان کرتا ہے:

> ترجمہ: جواس رسول امّی نبیؐ کے پیچھے چلتے ہیں جسے وہ اپنے یہاں تورات اورانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جوانہیں نیک باتوں کا حکم دیتا اور بری باتوں سے روکتا ہے ان کے لئے اچھی چیزیں حلال کرتا ہے اور بری چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور دور کرتا ہے ان سے ان کے بوجھ اور پھندے جوان پر تھے۔تو جولوگ اس پر ایمان لائے اوراس کی حمایت کی اوراس کی مدد کی اورنور کی اتباع کیا جواس کے ساتھ اتارا گیا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔(۷۔۱۵۷)

اس طرح اسلام حق وباطل کا ایک مستقل معیار فراہم کرتا ہے نیز انسانیت جن بندھنوں

اور بیڑیوں میں صدیوں سے جکڑی ہوئی ہے، وہ اس سے نجات بخشتا ہے اور دائمی فلاح وکامرانی کا ایسا راستہ دکھلاتا ہے جو سراسر حق اور عدل ہے۔ لہذا خدا کی مستقل اور مکمل اطاعت انسان کو ہر نوع کی غلامی سے نجات دلاتی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسلام انسان پر انسان کی غلامی کا کیوں منکر ہے؟ اس لئے کہ اسلام کی نگاہ میں تمام انسان آپس میں برابر ہیں کسی پر کسی کو کوئی امتیاز اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا کلیہ ہے کہ خدا بڑا ہے باقی سب برابر ہیں۔ یہی اسلام کا وہ شرف وامتیاز ہے جس کی خاک کو بھی دنیا کا کوئی سماج نہیں پہنچ سکا ہے۔ اور نہ کوئی اجتماعی اخلاق کا ضابطہ۔ بعض جگہوں پر خوب صورت الفاظ میں بلند بانگ اعلانات ضرور ملتے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی عملی مثال نہیں ملتی۔ آج کا مسلم سماج بھی غیر اسلامی سماج سے متاثر ہو کر چھوٹے بڑے کی تمیز سے دوچار ہو گیا ہے لیکن آج بھی یہ روگ مسلم سماج میں بہت کم ہے اگر چہ اس کی بروقت اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ اسلام نے شرف وامتیاز کا ایک ہی پہلو رکھا ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ یعنی خوف خدا ہے۔ اس میں بھی یہ بات بزور کہی گئی ہے کہ وہ صرف خدا کے نزدیک صاحب شرف ومنزلت ہے کسی شخص کو تقویٰ کی بنیاد پر سماج میں اپنی بڑائی کا اعلان کرنے کا اور اپنے لئے کسی شرف ومنزلت کا مقام طلب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو روح تقویٰ کے خلاف ہے اور کھلی نفسانیت ہے جس کا خدا اور خلق کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں۔ لہذا رنگ، نسل، مال و دولت، جاہ واقتدار، جنس اور علاقہ کی بنیاد پر کسی کو اپنی بڑائی جتانے کا اختیار نہیں ہے۔

انسانی مساوات کا اعلیٰ تصور پیش کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: ''اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تمہارے ابوالآباء بھی ایک ہی ہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل نہیں برتری صرف تقویٰ کی بناء پر ہے۔''

ایک دوسری تقریر میں آپ نے فرمایا کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر

کوئی فضیلت نہیں ۔ اس طرح ہروہ انسان جو دنیا کے کسی خطہ میں پیدا ہوا و رکسی رنگ ونسل اور برادری سے تعلق رکھتا ہے ۔ایک ہی ماں باپ کی اولا د ہےاوراس دنیا میں اس کے حقوق برابر ہیں ۔ اوراگر کوئی شخص کسی کے حق پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہے یا اس کے شرف ومنزلت کوٹھیس پہونچائے تو اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اسلام نے شرف وامتیاز کا ایک ہی پہلو رکھا ہے اور وہ تقویٰ خداترسی اور پرہیز گاری ہے۔اسلام نے مادی چیزوں کو انسانی شرف کا معیار قرار دینے کے بجائے اس کی اخلاقی حیثیت کو اہمیت دی ہے۔ایک شخص امیر ہے لیکن اس کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے تو ایسا شخص اسلامی معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔اس کے برعکس ایک غریب مگر صاحب تقویٰ آدمی ہے وہ اسلامی سماج میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ گوشہ نشیں بزرگان دین اسلامی سماج کے ممتاز ترین لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں اوراس کی چلتی پھرتی مثال آج کے گئے گذرے سماج میں بھی دیکھی جاسکتی ہے ۔مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے جلیل القدر بادشاہ اورصاحب ثروت لوگ گذرے ہیں لیکن مسلمان بحثیت قوم کبھی ان کے گرویدہ نہیں رہے اوران کی زندگی کوکبھی بھی اپنے لئے نمونہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ وہ ان سے گریز کرتے رہے۔جب کہ بہت سے درویش صفت اورفقیر بےنوا مرجع خلائق بنے رہے اوردنیا ان کے فکروعمل سے ہدایت حاصل کرتی رہی ۔اسلامی سوسائٹی نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو چیلنج کیا ہے جو سماج میں اپنا سکہ چلانا چاہتے ہیں آپ کوایسی مثالیں بےشمار ملیں گی کہ ایک فقیر بےنوا اٹھتا ہےاورایوان شاہی میں جاکر بادشاہ وقت کو بہت ہی سخت لہجہ میں تنبیہہ کرتا ہےاور پورے شان فقر کے ساتھ اپنے ٹھکانے پرواپس لوٹ آتا ہےاسلام نے حریت فکراورانسانی مساوات کی ایسی اسپرٹ جگائی ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو دبا نہیں سکتی ۔ ہر جابر وظالم کے خلاف روح اسلام عود کرآتی ہے ۔کبھی اپنا سر دیتی ہے کبھی دوسروں کا سر لیتی ہے لیکن کبھی شکست اوراطاعت قبول نہیں کرتی ۔ اسلام میں کسی شخص کے ڈکٹیٹر بننے کی گنجائش نہیں ہے ۔ رسول اللہؐ نے اپنی امت کوروز اول ہی سے یہ انقلابی تعلیم دی تھی ۔ ’’کہ سب سے بہتر جہاد کسی سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے‘‘اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے ایک بدو اورایک عورت سے پوچھا۔ ’’اگر میں تم کواسلام کے خلاف حکم دوں تو تم کیا کروگے تو

انہوں نے جواب دیا کہ ٹکوئے کی طرح سیدھا کردیں گے یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ مسلمانوں نے ہر دور میں اس فرض کو کما حقہ نبھایا ہے اور اپنی قربانیوں سے روشن مثال قائم کی ہے۔

مساوات کا اسلامی تصور اپنے اندر گوناں گوں پہلو رکھتا ہے۔ اسلام نہ صرف سماجی مساوات کا علم بردار ہے بلکہ سیاسی اور معاشی مساوات کا نقیب بھی ہے۔ سماجی مساوات کے تصور کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں اس سلسلے میں اتنا اور جان لیجئے کہ قانون کی نگاہ میں خلیفہ اور ایک معمولی شہری اسی طرح برابر ہیں جس طرح ایک انسان کے دونوں ہاتھ۔ خلیفہ کو ایک عام شہری کے مقابلے کوئی امتیاز حاصل نہیں جن قانونوں کی پاسداری اور پابندی عام شہریوں پر فرض ہے اور اس سے روگردانی قابل تعزیر جرم۔ ٹھیک اسی طرح سے وہ خلیفۂ وقت پر بھی پوری شدت اور جامعیت کے ساتھ نافذ ہوتا ہے اور اگر خلیفہ اس کی خلاف ورزی کرے تو وہ بھی اسی طرح قانون کی گرفت میں آ سکتا ہے جس طرح ایک عام شہری۔ اسلام وہ اولین دین ہے جس نے قانون کی حکمرانی کا تصور عطا کیا اور من مانا قانون سے روکا تا کہ کوئی حکمراں اپنی مرضی سے قانون بنا کر اپنے ظلم کو جواز عطا نہ کر سکے۔ سیاسی اعتبار سے اسلام میں بادشاہت کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ یہاں حکمراں عوام کی رائے سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی عہدے کا خواہاں ہو بلکہ کسی شخص کی اخلاقی حیثیت اور علمی صلاحیت کا لحاظ کر کے اسلامی سماج اس کو خلافت اور حکومت کا منصب تفویض کرتا ہے۔ خلیفۂ اسلام کے لئے الگ سے کوئی مخصوص اختیار حاصل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ خود بھی اسلامی اصول پر عمل کرے اور لوگوں سے بھی ان اصولوں کی پابندی کرائے اور اس بات کی نگرانی کرتا رہے کہ حدود اللہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اس کا کام فلاح کے جامع اصول کے تحت مملکت کا کاروبار چلانا ہے اور اس کی ترقی و خوش حالی کے لئے کوشاں رہنا ہے۔ نیز بندوں کا رشتہ اللہ سے مضبوط کرتے رہنا ہے جس کے لئے نظام تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کرنا ہے۔ اسلامی مملکت نظم وضبط کے نفاذ کے ساتھ ہی ساتھ معلم اخلاق بھی ہوتی ہے اور اسلام کے زریں اخلاقی اصولوں کو زندگی کے ہر دائرے اور شعبہ میں نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔

اسلام اور معاشی مساوات

مساوات انسان کا لازمی تقاضا ہے کہ معاشی میدان میں بھی مساوات قائم کیا جائے۔ معاشی مساوات کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ ملک کی دولت تمام لوگوں کے درمیاں برابر تقسیم کردی جائے۔ ایسا کرنا نہ ممکن ہے اور نہ قرین مصلحت اور دنیا میں ایسا کوئی سماج کبھی نہیں ہوا جہاں اس طرح کا نظام قائم ہو یہ انسانی فطرت کے منافی ہے اور اس کی بوقلموں اور متنوع وجود کی ضد ہے۔ اسلام معاشی مساوات کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور رجحان کے مطابق حصول معاش کی پوری آزادی ہوگی اور مواقع کی تقسیم میں تمام لوگوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جائے گا۔ اسلام لوگوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے مناسب ماحول کی فراہمی پر بھی زور دیتا ہے تاکہ ظلم واستحصال سے آزاد سماج قائم ہو اور معاشی افزائش اس طرح ہو کہ ایک طرف دولت کی پیداوار بڑے پیمانے پر ہو دوسری طرف معاشی انصاف کی بھی گارنٹی ہو۔ اور سماج کا کوئی طبقہ محروم ونامراد دوسرے کے سامنے کاسہ لیسی کرنے والا نہ رہے۔ یہ اسلام کا کوئی نظری اصول نہیں ہے۔ بلکہ وہ عملی پروگرام ہے جس کو بروئے کار لا کر اسلام نے قرن اول میں مسلم سوسائٹی سے غربت اور ظلم کا استیصال کر دیا تھا۔ اسلامی نظام معیشت اصل میں ایک فلاحی ریاست کا باضابطہ دستور ہے جس کی بنیاد پر ہی خوشحال اور پرامن معاشرہ کی تعمیر کی دیرینہ آرزو پوری ہوسکتی ہے۔

اسلام کا معاشی نظام جس کلیہ سے شروع ہوتا ہے وہ الارض للہ ہے یعنی یہ زمین اور اس میں پائی جانی والی تمام چیزیں جو پیداواری عمل میں مدومعاون ہوتی ہیں، وہ سب کی سب اللہ کی امانت ہیں اور اس پر آزادانہ اور خودمختارانہ تصرف کا اختیار نہ کسی فرد کو ہے اور نہ سماج کو اور نہ اسٹیٹ کو بلکہ اللہ کی چیز ہے اور اس میں کوئی تصرف اس کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ صریحاً ظلم اور غداری ہے۔ جس کے نتیجے میں سماج میں ناانصافیاں پروان چڑھتی ہیں اور فساد فی الارض رونما ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کے نزدیک بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمت کو امانت سمجھے اور اس کی مرضی کے مطابق ہی اس میں تصرف کرے۔ قرآن انسانی سماج میں پیدا شدہ طبقاتی کش مکش عدم اتحاد اور عدم مساوات پر پوری جامعیت کے ساتھ تبصرہ

کرتے ہوئے یہ اعلان کرتا ہے۔

ترجمہ: ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے (پھر جب انہوں نے آپس میں اختلاف کیا) تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دیتے اور ڈراتے آئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تا کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کررہے ہیں وہ اس کولوگوں کے بیچ فیصلہ کردیں اور یہ اختلاف انہی لوگوں نے کیا جنہیں کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ ان کے پاس پہلے ہی احکام آچکے تھے اور یہ اختلاف صرف اس لئے کیا کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ لینا چاہتے تھے۔۔تو جولوگ ایمان لے آئے اللہ نے انہیں اپنی مہربانی سے اس سچائی کی راہ دکھائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔(۲۔۲۱۳)

ان آیات میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اصل اختلاف صاحب علم لوگوں نے کیا اور ان لوگوں نے کیا جو اپنے حق سے زیادہ لینا چاہتے تھے۔اسلامی نظام معیشت میں کوئی اپنے جائز حق سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ اسلام میں کوئی استحقاقی طبقہ (Privileged Class) نہیں ہے۔یہاں ذرائع پیداوار کے فروغ سے زیادہ اہمیت تقسیم عادلانہ (Distributive Justice) پر دیا جاتا ہے۔دولت اور ذرائع پیداوار کی منصفانہ تقسیم نظام معیشت کو عدل وقسط کی بنیاد پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔اسلامی نظام معیشت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں یکا یک اچانک منافع اندوزی (Windfall Gain) کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور بازار میں مانگ اور سپلائی کی قوتوں کا آزادانہ عمل دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ مانگ اور سپلائی کے ہر دو پہلو پر کنٹرول ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے من مانی قیمت لینے اور ناجائز منافع اندوزی کرنے کا سوال پید انہیں ہوتا۔نظم معیشت میں نہ صرف اشیاء تعیش کی پیداوار پر یا تو بالکلیہ پابندی رہتی ہے یا بہت کم مقدار میں اس کی پیداوار کی اجازت ہوتی ہے۔اسلامی نظام معیشت میں کسی فرم یا فرد کی اجارہ داری کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور نہ بازار میں گلا کاٹ مسابقت کا ماحول ہوتا ہے آمدنی کے ایسے تمام ذرائع جس پر بغیر جوکھم اور محنت کے راتوں رات کروڑ پتی بن جانے کا امکان ہو ان پر بالکل پابندی ہوتی ہے جیسے سود، سٹہ، جوا، لاٹری، احتکار، ملاوٹ، اسمگلنگ وغیرہ۔اسلامی نظام

معیشت میں ان چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں کیوں کہ یہ چیزیں ایک طرف نظم معیشت کے استحکام کونقصان پہنچاتی ہیں دوسری طرف معاشرہ میں دولت کی منصفانہ تقسیم میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور مصنوعی طریقے سے اس کے نظم کو بگاڑنے والی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام معیشت میں نہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ انہیں کن مدات میں خرچ کیا جا رہا ہے اسلام نے آمدوخرچ دونوں میں حلال وحرام کی قید لگا کر سماج کو معاشی بے راہ روی کا شکار ہونے اوراس کے نتیجے میں پیدا شدہ بحران سے بچانے کا پورا پورا انتظام کیا ہے۔اسلام میں شراب ،زنا،لہوولعب،فحاشی،عریانی اوراس طرح کی دوسری چیزوں پرسخت پابندی ہے اسلای نظام معیشت اپنی کامیابی کے لئے ایک مخصوص ماحول چاہتا ہے۔ جب تک وہ ماحول میسرنہیں ہوگا اس نظام معیشت کے برکات پوری طرح ظاہرنہیں ہوسکتے۔اسلام مکمل انقلاب کا داعی ہے یہاں پیوندکاری سے کام نہیں چلے گا۔اس لئے اگر کوئی سماج،شخص یا اسٹیٹ اسلام کواختیار کرنا چاہتا ہے تو اسے پورے پورے اسلام کواختیار کرنا ہوگا اورزندگی کے کسی دائرے اورکسی معاملے میں بھی اس سے بے نیاز ہوکر کام نہیں کرنا ہوگا،تب ہی وہ اپنی صحیح اسپرٹ میں نافذ ہوسکے گا اورتب ہی اس سے متوقع فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہوگی کہ اسلامی معاشرہ ایک ذمہ دار اورہوشیار معاشرہ ہوتا ہے جہاں تمام چیزوں پرنظر رکھی جاتی ہے۔خاص طور سے آمدنی کی صورتوں اورخرچ کے راستوں پر یہی وہ طریقہ ہے جس کی ٹھیک سے پابندی کرنے پرناجائز انتفاع کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں اور استحصال کی تمام صورتوں کا کلی طور پرخاتمہ ہوجاتا ہے اس وقت اسلامی معیشت کا پورا خدوخال پیش کرنا مقصودنہیں ہے تاہم اس تفصیل سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام اگرچہ انفرادی ملکیت کی کلی نفی نہیں کرتا۔لیکن اس کا مطلب ہرگزنہیں ہے کہ انفرادی ملکیت کے حصول اورخرچ پرکوئی پابندی نہیں لگاتا۔ بلکہ مذکورہ بالا سطورمیں اس کی وضاحت ہوچکی ہے کہ اسلام کس طرح آمدوصرف کے ذرائع پرنظر کرتا ہے اورمعاشرہ میں عدل وقسط اوراستحکام قائم رکھنے کے لئے کس قدر اہتمام کرتا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ ان بنیادوں پر استوار رہے۔ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے اس بات کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ معاشرہ میں دولت کی تقسیم غیر

منصفانہ ڈھنگ سے ہوگی اور ایک شخص کروڑ پتی ہوگا اور دوسرا بھوکا مرے گا۔

اسلام اولاً تو تمام کمزور طبقات (Weaker Section) کا نگراں اور ان کے مفاد کا محافظ ہے ۔ اس لئے وہ سب سے پہلے ان کے بنیادی مسائل سے بحث کرتا ہے اور ان کا پروقار حل ڈھونڈھتا ہے ۔ بھیک مانگنا اور بھیک منگی کو برداشت کرنا اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ ہے ۔ یہ چیزیں سماج کے ماتھے پر کلنک ہیں۔ بھیک منگی اور غلامی اگر کسی قبائلی سماج میں رائج تھی تو اسے کسی حد تک برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن کسی منظّم سماج میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ چنانچہ اسلام نے رفتہ رفتہ اس بات کی کوشش کی کہ ان دونوں برائیوں کا پوری طرح خاتمہ کر دیا جائے اور اسلامی سماج اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ مسلمانوں کی غفلت اور نادانی نے پھر سے ان برائیوں کو جنم دے دیا ہے اور آج دنیا میں جتنے مسلمان بھیک منگے پائے جاتے ہیں خاص طور سے برصغیر ہندو پاک میں اتنے شاید ہی دنیا کے کسی اور حصے میں پائے جاتے ہوں۔ بہر حال اسلام اس کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور انسانی عظمت کے منافی سمجھتا ہے چنانچہ جو لوگ بھیک مانگتے ہیں اور عادت اور پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں اور جو لوگ کسی ضرورت یا اضطرار کی وجہ سے مجبور ہو کر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں تو سماج پر اس کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ انفرادی طور پر کچھ کرنے کی بجائے ایسا اجتماعی نظام قائم کرے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں۔، اسی لئے اسلام نے زکوۃ اور صدقات کو اجتماعی طور پر جمع کرنے اور خرچ کرنے کا حکم دیا اور اسے حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فرض قرار دیا ہے ۔ اسلام ایک ایسا اجتماعی نظام بنانا چاہتا ہے جس میں کوئی شخص انفرادی حیثیت سے کسی کا محتاج نہ رہے۔ اسلامی سماج زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے ایک ایک فرد کی گارنٹی لیتا ہے کہ ان میں کوئی بھوکا، ننگا، بیمار اور بیکار نہ رہے ۔ اسلامی نظام معیشت کی وسعت کو سمجھنے کے لئے بس اتنی بات جان لیجئے کہ ''اسلامی مملکت میں ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو اس کی ذمہ داری اسٹیٹ پر عائد ہوگی'' امور بالا کی مزید تشریح حضور پاک کی اس گفتگو سے ہوتی ہے جو آپ نے عدی بن حاتم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کی تھی۔ آپ نے فرمایا:

''شاید تمہیں اسلام میں داخل ہونے سے روکنے والی چیز اس کے ماننے والوں کی

تنگ حالی ہے! سو خدا کی قسم عن قریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ان لوگوں کے اندر دولت کے فوارے چھوٹیں گے یہاں تک کہ اسے لینے والے نہیں ملیں گے اگر تم کو یہ چیز اسلام میں آنے سے روکتی ہے کہ مسلمان کی تعداد کم ہے اور ان کے مخالفین بہت ہیں تو میں تمہیں بتا تا ہوں کہ خدا کی قسم وہ وقت آنے والا ہے کہ تم سن لوگے کہ ایک عورت تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر قادسیہ سے اس مسجد کی زیارت کے لئے چلی اور بخیریت پہونچی اور شاید تمہارے لئے یہ خیال مانع ہے کہ سلطنت اور اقتدار دوسروں کے پاس زیادہ ہے سو خدا کی قسم! ایسا عن قریب ہوگا کہ تم سن لوگے کہ سرزمین بابل کے قصور اسپید مسلمانون نے فتح کر لئے۔''

اس بات کی تشریح اپنی طرف سے کرنے کے بجائے نعیم صدیقی صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف ''محسن انسانیت'' سے من وعن نقل کرتا ہوں۔ اس گفتگو سے ذیل کے اہم نتائج نکلتے ہیں۔

''اسلام صرف اخلاقی اصلاح ہی کی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کے پروگرام میں معاشی فلاح شامل ہے اور سیاسی انقلاب بھی۔ وہ آخرت کی بھلائی کو دنیوی معاملات کی درستی سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ اسلامی تحریک اگر تکمیلی مدارج تک پہونچ جائے تو اس کے لازماً یہ نتیجے نکلنے چاہئیں۔

(۱) معاشی ذرائع ووسائل اتنی ترقی کر جائیں اور ان کو ایسے صحیح عادلانہ طریق سے تقسیم کیا جائے کہ معاشرے میں کوئی محتاج نہ رہے۔

(۲) سیاسی لحاظ سے اتنی مضبوط حکومت پیدا ہو کہ مخالفین اسے تر نوالہ نہ بنا سکیں بلکہ الٹا وہ مخالف طاقت کا زور توڑ سکے۔

(۳) داخلی امن کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اگر ایک عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنہا سفر کرے اور انسانی آبادیوں اور ویرانوں سے گذرے تو اس کی جان عزت اور مال پر کسی طرح کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہی اسلامی نظام سلطنت کی خوبیاں ہیں۔

اس طرح اسلام یہ سب خیر انسانیت کی جھولی میں بغیر اس کی انفرادی آزادی اور عزت نفس پر قدغن لگائے ڈال دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی نظام چاہے اس کے وعدے اور دعوے کتنے ہی شاندار اور خوشنما ہوں۔ اسلامی معیار فلاح کے اس اونچے مقام کو نہیں چھو سکتے۔ اس کے لئے کسی

بحث میں جائے بغیر یہ دیکھ لینا کافی ہوگا کہ آج سے پندرہ سو سال پہلے جب اسلام ایک وحشی قوم کا دین بنا تو اس نے تمدنی اعتبار سے نہ صرف اس کی کایا پلٹ کردی۔ بلکہ معاشی اعتبار سے جو قوم بالکل مفلوک الحال تھی اور جس کی زندگی معمولی تجارت اور لوٹ پاٹ پر بسر ہوتی تھی۔ایک دوسرے کے حقوق کی ایسی پاسداری بنی اور دولت کی منصفانہ تقسیم اس طرح ہوئی کہ تھوڑے عرصہ میں کوئی شخص زکوٰۃ لینے والا نہ رہا۔

اسلام نے جو غریبی کی سطح (Poverty Line) متعین کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس 7.5 تولہ سونا یا 52.5 تولہ چاندی یا اتنی مالیت کا سامان نہ ہو تو وہ غریب ہے اور ایسی صورت میں اس کو جائز معاشی ذرائع سے روزی بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔اسلام کے روزگار فراہمی کی کسی بھی اسکیم میں اس طبقہ کو فوقیت دی جائے گی اور اس کے باوجود بھی کوئی شخص ایک عام ملکی معیار زندگی سے نیچے ہوگا تو سماجی تحفظ (Social Security) اسکیم کے ذریعہ اس کی کفالت کی ذمہ داری حکومت اسلامی پر ہوگی۔اس لحاظ سے اسلام صرف سماجی بھائی چارہ اور مساوات (Social brother hood and Equality) ہی کا نعرہ نہیں دیتا بلکہ معاشی بھائی چارہ (Economic brother hood) بھی قائم کرتا ہے۔جب تک ایک شخص کی جائز ضرورت پوری نہیں ہوتی۔اس وقت تک معاشرتی استحکام اور امن کا قیام مشکل ہے۔اسلام اس بات کی پوری گارنٹی لیتا ہے اسلام میں چوری ڈکیتی، احتکار، اسمگلنگ، شراب نوشی، جوا، سٹہ، سود وغیرہ کی سخت ممانعت ہے اس کی خلاف ورزی پر سخت سے سخت سزا بھی طے کی گئی ہے۔لیکن یہ احکامات اسی وقت پوری شدت کے ساتھ لاگو کئے جاسکتے ہیں جب حکومت اسلامی اپنے مفوضہ فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیتی ہو اور عوام کو حکومت سے کوئی واجبی شکایت باقی نہ رہے۔لہذا جو حکومت اول الذکر فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گی اسے موخر الذکر احکامات میں سختی کرنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں ہوگا۔کیونکہ اسلامی حکومت کوئی خیالی ہیولیٰ نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہے رنگ بھر لیجئے بلکہ اسلامی نظام حکومت ایک مکمل ہیئت ہے جس کے بام ودر ساخت و پرداخت بالکل طے شدہ نقشہ کی طرح عالم واقع میں وجود میں آچکے ہیں۔لہذا اس کے مواد اور روح میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔آج دنیا پریشان ہے کہ ان بیشمار سماجی اور معاشرتی برائیوں سے کس

طرح چھٹکارا پائے جس کے نتیجے میں دھرتی کا امن درہم برہم ہوگیا ہے اور فساد فی الارض رونما ہے ۔طبقاتی کشمکش کی گرم بازاری ہے اور عالم گردوں دگرگوں ہے ۔حقیقی جواب اسلام ہے ۔اسلام کے ذریعہ ہی انسانیت ہر نوع کی ناجائز معاشی انتفاع ،استحصال ،فساد فی الارض اور طبقاتی کشمکش سے نجات پاسکتی ہے اور اسی کے ذریعہ تمام طبقات وافراد کو باوقار اور جائز طریقہ سے حصول معاش کے مواقع حاصل ہوسکتے ہیں نیز اسی کے ذریعہ تمام افراد واقوام کا معاشی خوشحالی اور ترقی میں پرزور تعاون حاصل ہوسکتا ہے ۔تنہا اسلام ہی ایک نئے عالمی نظام کا پیغامبر ہے اور اسی کے ذریعہ انسانی دکھوں کا مداوا ہوسکتا ہے ۔چنانچہ اسلام رحمت ورافت ،اخوت ومساوات اور خیر واخلاص کا ہی دوسرا نام ہے اس طرح اسلام توحید واتحاد کا علمبردار ،انسانی مساوات اور سچی آزادی کا نقیب ،امن وانصاف کا محافظ ،معاشی خوشحالی اور اخروی نجات کا ضامن ہے ۔یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے بار بار لوگوں کو دعوت دی ۔''اے لوگو! کہو لا الہ الا اللہ فلاح پاجاؤ گے'' اسی ایک کلمہ میں تمام انقلابی اور تعمیری روح پوشیدہ ہے ۔اور یہی کلمہ ہر لحاظ سے دنیوی اور اخروی فلاح کا ذریعہ اور ضامن ہے پھر کون ہے جو اپنی فلاح کی دعوت پر لبیک نہ کہے اور اس کا مطیع ونقیب بن کر دنیا اور آخرت میں کامیاب نہ ہونا چاہے ۔ع

صلائے عام ہے ہر فرد ہر زماں کے لئے

موجودہ دور میں شہادت حق کی جہتیں اور طریقۂ کار

موجودہ منظر نامہ

اس وقت دنیا کی آبادی سات ارب سے زیادہ ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ ایک ارب بیس کروڑ ہے۔ گویا دنیا کا ہر ساتواں آدمی مسلمان ہے۔ بھارت کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ بیس کروڑ ہے۔ اس طرح بھارت کا ہر چھٹا شخص مسلمان ہے۔ بہار کی آبادی دس کروڑ ہے جس میں دو کروڑ مسلمان ہیں گویا بہار کا ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے۔

مسلمان دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں موجود ہیں۔ دنیا میں لگ بھگ دو سو سے زائد ممالک ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی 52 سے زیادہ آزاد خود مختار حکومتیں ہیں۔ اس وقت لگ بھگ دنیا کی ایک چوتھائی خطۂ ارض پر ان کی حکمرانی ہے۔ مسلمان دنیا کے 55-52 ممالک میں اکثریت میں ہیں اور باقی دنیا میں اقلیت میں ہیں، جن کی تعداد چند ہزار سے لے کر کروڑوں میں ہے۔ اتنی بڑی آبادی ہونے کے باوجود اور دنیا کے ہر حصے اور ہر خطے میں موجود رہنے کے بعد بھی اسلام دنیا کے تمام ملکوں اور آبادیوں میں اجنبی اور انجان ہے سب سے زیادہ Misunderstood اور Misrepresented دین ہے۔ غیر مسلم ہی نہیں بہت سے مسلمان بھی اس پر منھ آتے ہیں۔ ا س صورت حال کی وجہ کیا ہے؟ میرے خیال میں اس کی چار بنیادی وجہیں ہیں۔

غلط فہمی اور غلط نمائندگی کے اسباب

(۱) جہالت و ناخواندگی

سب سے پہلی وجہ مسلمان عوام، مرد و خواتین کی غالب اکثریت کی جہالت و ناخواندگی ہے۔ مسلمانوں میں ایک اندازے کے مطابق شہری اور دیہاتی علاقوں میں کم و بیش 60% ایسے

مرد وخواتین ہیں جو پہلا کلمہ بھی نہیں جانتے ہیں اور جن کو اسلام کے بنیادی عقائد ، وضو، طہارت ،اورنماز کے بنیادی ارکان سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ وہ محض نام کے مسلمان ہیں اوران کی زندگی تمدنی طور پر کفر وجہالت کا ملغوبہ ہے۔جس نے اسلام اور مسلم سماج کی صورت اتنی بگاڑ رکھی ہے کہ اس کی پہچان میں مشکل ہورہی ہے۔

(۲) اسلام سے عدم وابستگی

دوسری وجہ ہمارے سماج میں اسلام سے عدم وابستگی یا کم وابستگی ہے۔ مسلمانوں میں جولوگ تعلیم یافتہ ہیں ان کی بڑی تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے اسلام کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا ہے اور اگر کچھ پڑھا بھی ہے تو ایسے ذرائع سے پڑھا ہے جو قابل وثوق نہیں ہیں۔ اس لئے یا تو وہ ان امور پر کچھ سوچتے نہیں ہیں یا پھر ان کے ذہنوں میں بے شمار شبہات اور سوالات پل رہے ہیں جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کبھی کبھی انہیں اپنے مسلمان ہونے پر بھی شرم آتی ہے اور وہ اپنی شناخت چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسلم تعلیم یافتہ مرد وخواتین اور نو جوانوں کی ایک بڑی تعداد، بالخصوص ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد جو بڑے شہروں میں رہتی ہے اور جنہوں نے عیسائی مشنری اسکولوں میں یا نام نہاد انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے اور جن کا مسلم معاشرے سے کوئی گہرا سماجی اور جذباتی رشتہ نہیں ہے جنہوں نے قرآن اور اسلام کو یا تو پڑھا نہیں ہے یا پھر مستشرقین کے حوالے سے پڑھا ہے یا غیر مصدقہ ذرائع سے کچھ پڑھ لیا ہے، اسلام کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی ناقص ہے۔ اس طرح کے لوگ بالخصوص انگریزی اور ہندی میڈیا میں جب اسلام پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس وقت سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ اسلام ناقص وکیلوں اور کمزور پیروکاروں کے درمیان پھنس کر اپنی جوہری صلاحیت کھوتا جارہا ہے۔ اور ہر محاذ پر اسے مات کھانی پڑ رہی ہے۔ کوئی دین اپنے ماننے والوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جب مسلمانوں کی غالب اکثریت کا حال یہ ہے تو اس کی غلط نمائندگی ہی

ہوگی جس کے نتیجے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا پیدا ہونا فطری ہے۔

شناخت کا بحران

دوسری طرف موجودہ مسلم معاشرہ چونکہ ہر طرح کے افراد کا مجموعہ ہے اور اس نے کفر و اسلام کا ایسا مکسچر بنا رکھا ہے جس سے یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ وہ کون سی خرابی ہے جو اس وقت مسلمان معاشرے میں رائج نہیں ہے۔ عقائد میں بگاڑ، عبادات سے بے پروائی، اخلاقی انحطاط، سماجی نابرابری اور انتشار یہ سب خرابیاں مسلمان سماج میں موجود ہیں۔ آپ غیر مسلم معاشرے کی کوئی خرابی اٹھالیں آپ کو مسلم معاشرے میں وہ دوگنا تین گنا مقدار میں مل جائے گی۔ اس طرح مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ، شہری ہو یا دیہاتی، عورت ہو یا مرد، سب نے جانے انجانے اسلام کا ایسا تیاپانچا کر رکھا ہے کہ اسلام مسلم آبادیوں میں اجنبی ہوگیا ہے اور اپنے ہی گھر میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ مسلمان معاشرے نے بالعموم عملاً اسلام کو چھوڑ دیا ہے اور اس کی جگہ غیر اسلامی اقدار و روایات کو گلے لگالیا ہے۔ ایسی صورت میں جو حقیقی اور اصلی اسلام ہے یعنی قرآن و سنت والا اسلام وہ مسلمان معاشرے میں اجنبی اور انجان ہے۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو اصلی اور صحیح اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے تو عام عوام تو دور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ، علماء اور دیندار افراد بھی اس پر منھ آتے ہیں، ایسے لوگوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور لوگوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمان عوام سطحیت، جذباتیت، روایت پسندی، مذہبی عدم رواداری، ذہنی محدودیت، رجعت پسندی اور غیر معقولیت کے ایسے دلدادہ ہیں کہ انہیں قرآن و حدیث، سیرت و سنت کے حوالے سے بھی جب کوئی بات بتائی جاتی ہے تو وہ اس کو مان کر نہیں دیتے۔

مسلمان معاشرے میں دین کی صحیح سمجھ اور اچھی جانکاری رکھنے والے اور بدلتے ہوئے وقت و حالات کے لحاظ سے ایک ترقی پسند ذہن (Progressive out look) کے ساتھ باشعور اسلامی زندگی گزارنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہی لوگ ہیں جو ملت کے اجتماعی ضمیر کے نگہبان (Conscience keeper) ہیں لیکن یہ حد درجہ محدود تعداد

میں(Minuscle minority) ہیں۔اس لئے ملت اور باقی دنیا پر ان کے اثرات بہت محدود ہیں۔دین وملت کی پہچان اس کی غالب اکثریت کے طرزِ حیات اور تہذیب وثقافت سے ہوتی ہے۔جس سماج میں غربت و جہالت کا دور دورہ ہے،عوام وخواص میں دوری ہے اور خواص بھی اپنی پہچان گم کر چکے ہیں۔ظاہر ہے اس صورت میں اس کی ایک مسخ شدہ تصویر ہی ابھر کر سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم سماج اس وقت شناخت کے بحران (Identity crisis) سے دوچار ہے۔

(۳) گروہ بندی اور طبقاتیت

اسلام کی غلط نمائندگی (Mis-representation) کی تیسری وجہ مسلمانوں میں پائی جانے والی گروہ بندی ،طبقاتیت اور مسلکی تنازع ہے جس کو گروہ بندی (Factionalism) کہتے ہیں۔مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو وحدت کلمہ، وحدت قبلہ اور وحدت کتاب پر یقین رکھتی ہے لیکن ان ساری وحدتوں کے باوجود یہ اس وقت دنیا کی سب سے منتشر قوم ہے۔کہاں تو یہ تھا کہ جہاں تین مسلمان ہوں وہاں ایک کو اپنا امیر بنالیں اور باقی لوگ معروف میں اس کی اطاعت کریں اور کہاں یہ صورت حال ہے کہ پوری قوم شتر بے مہار ہے جس کا کوئی گلہ بان نہیں ہے۔قوم خدا ،رسول، کتاب اور آخرت سب پر ایمان رکھتی ہے،خود کو مسلمان بھی کہتی ہے مگر وہ اس پر عمل نہیں کرتی ۔روحِ محمدؐ اس کے جسم اجتماعی سے نکل چکی ہے۔مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر سویا ہوا ہے جس کو جھنجھوڑ کر جگانے کی ضرورت ہے۔

اس وقت مسلمان قوم بہتر فرقوں اور تہتّر جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کو نت نئے طریقے سے مزید توڑنے اور منتشر کرنے کی سازش رچی جا رہی ہے قوم ہر روز ٹوٹ رہی ہے بکھر رہی ہے،آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین کے نام پر اکٹھا کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔کیونکہ کہ ہر مسلک اور جماعت کے لوگ خود کو ہدایت یافتہ اور ناجی مانتے ہیں جب کہ دوسرے مسلک اور جماعت کے لوگوں کو گمراہ اور ناری سمجھتے ہیں۔اگر کسی مسلمان آبادی میں تین مسلک کے لوگ ہیں تو تینوں کی مسجدیں الگ ہیں جہاں ایک دوسرے کا ایک ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا قریب قریب ناممکن ہے۔اولاً تو لوگ یہ مانتے ہیں کہ دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے ان کی

نماز نہیں ہوگی ۔ اگر کسی نے نماز پڑھ بھی لی تو اس مسلک کے لوگ برا مانتے ہیں کہیں کہیں مسجدوں کو دھونے اور نمازیوں کو زدوکوب کرنے کی شکایت بھی ملی ہے۔ جب مسلمانوں میں آپس میں اس درجہ عدم برداشت (Intolerance) ہے تو باقی لوگ اگر ان کی بدمزاجی پر منھ آتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ جو دین ساری انسانیت کے لئے ہے۔ جس کا رب رب العالمین ہے، جس کا رسول رحمۃ للعالمین ہے اس کے ماننے والے جب مسلمان کو مسلمان ماننے کو تیار نہیں ہیں اور مسلمان کو دائرہ اسلام سے باہر کرنے پر تُلے ہیں، ان کی دن رات کی سرگرمیاں اسی کے گرد گھومتی ہیں کہ خود کو حق پر اور دوسرے مسالک کے لوگوں کا باطل پر ہونا ثابت کردیں اور یوں ان کو جہنم رسید کرکے ہی دم لیں وہ بھلا بھٹکی ہوئی انسانیت کو اسلام کی دعوت کیسے اور کس منہ سے دیں گے؟ جنھوں نے اپنے دل و دماغ کو اتنا چھوٹا کرلیا ہے جس میں سوائے ان کے کوئی جنت میں نہیں جاسکتا وہ بھلا کیسے لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف بلائیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم بحیثیت مجموعی دعوت حق اور شہادت حق کی ذمہ داری سے غافل ہے ۔ بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ فضول اور غیر ضروری عمل ہے اور آپس میں فروعی باتوں پر جھگڑنا ہی دینی کام ہے۔ اس صورت میں دنیا اگر اسلام کے رحیم و شفیق چہرے کو دیکھنے سے محروم ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

مسلک کی حقیقت

مسلک اور جماعت کوئی غلط چیز نہیں ہے اور نہ ذات برادری میں کوئی برائی ہے۔ ہمارے صالح ترین اور حد درجہ فہیم و فقیہہ بزرگوں نے عام عوام کی رہنمائی کے لئے اپنے بہترین علم و تفقہ اور تقویٰ کی بنیاد پر مختلف مسائل کی تحقیق کر کے ایک راستہ دکھایا جس کو مسلک کہتے ہیں تاکہ عام لوگ جن کو اتنا علم اور اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن و سنت سے استفادہ کرکے احکام و معاملات کو جان سکیں ان کی رہنمائی کی جاسکے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان صالح ترین بندوں کے ذریعہ ہمارے لئے دین پر چلنا آسان کردیا۔ لیکن کوئی فقیہ یا امام خدا یا نبی کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے حکم یا عمل میں کوئی خامی یا غلطی کا امکان نہ ہو۔ اس لئے کسی فقیہ یا امام نے اپنے آپ کو آخری حق کے طور پر پیش نہیں کیا جس کی رائے یا فتویٰ سے اگر اختلاف کیا جائے تو کفر صادر ہوگا۔ بلکہ تمام ائمہ نے بڑے احتیاط سے کام لیا ہے اور امت کو مسلک کی پیروی میں آزاد چھوڑا ہے ۔ حضرت امام

ابوحنیفہ کا قول مشہور ہے کہ اگر میری رائے یا فتویٰ کے بالمقابل تمہارے پاس کوئی حدیث پہنچے تو میری رائے کو دیوار پر دے مارو اور حدیث پر عمل کرو۔ امام مالک نے جب مؤطا امام مالک لکھی تو خلیفہ وقت نے خواہش ظاہر کی کہ اس کو خانہ کعبہ کے دروازے پر ٹانگ دیا جائے اور حج کے موقعے پر پورے عالم اسلام میں منادی کرادی جائے کہ اسی کتاب کی بنیاد پر عمل کیا جائے۔ امام مالک نے خلیفہ کو ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ میں نے جو کچھ اپنے علم و تفقہ کی بنیاد پر لکھا ہے اس پر میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ پوری امت کو اپنی فقہ پر چلنے کے لئے مجبور کروں۔ آپ لوگوں کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیجئے، ان کو جس پر اعتماد ہوگا اس امام کی پیروی اختیار کریں گے۔ اب آپ سوچ سکتے ہیں جب ائمہ مسالک نے کسی کو اپنی رائے ماننے پر مجبور نہیں کیا تو بھلا کوئی اور کیوں کسی کی رائے ماننے پر مجبور کر سکتا ہے۔

امت میں اس وقت پانچ مسالک معروف و مقبول ہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اہل حدیث۔ ان تمام مسالک کے بارے میں علمائے اہل سنت والجماعت کے جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ تمام مسالک برحق ہیں۔ ان میں ترجیح کا مسئلہ تو ہوسکتا ہے مگر کسی کی تردید نہیں کی جاسکتی ہے۔ ان میں سے جس کسی مسلک پر عمل کیا جائے گا وہ صحیح اور برحق ہوگا۔ جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور تمام مسالک کے علما اس کو صحیح مانتے ہیں پھر مسلک کی بنیاد پر اتنا اختلاف و انتشار کیوں ہے؟ ہندوستان میں اسّی نوّے فیصد مسلمان حنفی المسلک ہیں۔ دیگر مسالک کے لوگ بیس فیصد سے زائد نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں حنفی مسلک کے دو گروہ ہیں ایک دیوبندی کہلاتے ہیں اور دوسرے بریلوی کہلاتے ہیں۔ ایک مسلک پر ہونے کے باوجود دونوں حلقوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت اور عناد پائی جاتی ہے، جس نے انتشار کی صورت پیدا کردی ہے، اور یہ لڑائی علما کے حلقے سے نکل کر عوام کے حلقے میں داخل ہوگئی ہے۔ جس نے ہندوستاان میں امت کو دو پھاڑ کردیا ہے۔ حالات اس حد تک خراب ہوگئے ہیں کہ اپنے گروہی اور مسلکی مفاد کی خاطر یہ دونوں حلقے دینی اور ملی مفاد کو داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ مسلمان عوام ان دونوں حلقوں میں برپا چشمک کی وجہ سے شدید مذہبی انتشار میں مبتلا ہیں۔ اس کشمکش نے ہندوستان میں دین کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان شیعہ سنی اختلاف سے بھی نہیں ہوا ہے۔ ایک سیدھا سادہ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ۔

یہ کس کا فرادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

اس چشمک نے دین کی اقامت اور شہادت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اور اس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور عام نوجوانوں کے ذہنوں میں دین سے دوری اور کنفیوژن پیدا ہوا ہے اس نے دین کی پوری صورت بگاڑ دی ہے اور مسلمانوں کی یہ شبیہ بن گئی ہے کہ یہ لوگ بے حد جھگڑالو ہیں جو آپس میں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دنیا والوں کی بھلائی کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو اپنا بھلا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بھلا دوسروں کی بھلائی کیسے کر سکتے ہیں؟ اسلام کی غلط نمائندگی (Misrepresentation) کی ایک بڑی وجہ ہمارا مسلکی تنازعہ بھی ہے۔

ذات برادری

اسلام دین وحدت ہے۔ وہ خدا کو ایک مانتا ہے اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد گردانتا ہے۔ ظاہر ہے جب تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو ان میں چھوٹے بڑے ،شریف رذیل، چھوت اچھوت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن نے واضح طور پر اعلان کیا ہے لقد کرمنا بنی آدم یعنی ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دار بنایا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ اسلام میں ذات برادری نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں ذات برادری ہے، قوم اور قبیلے ہیں۔ مگر یہ پہچان کے لئے ہیں۔ جیسے لوگوں کے نام ان کی پہچان کے لئے ہوتے ہیں۔ قرآن میں اللہ نے صاف صاف فرمایا ہے ''لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو دراصل اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔'' (الحجرات ۱۳) جس طرح کسی نام میں کوئی بڑائی یا چھوٹائی نہیں ہوتی اسی طرح کسی قوم قبیلے، ذات برادری میں کوئی بڑائی یا چھوٹائی نہیں ہے ۔مگر انسانی آبادی جو مختلف قوموں، مذہبوں اور تہذیبوں میں منقسم ہے، ان کے یہاں انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق و امتیاز پائے جاتے ہیں ۔بعض قوموں میں بعض برادری کو پیدائشی طور پر عزت دار اور بعض کو پیدائشی طور پر ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستان میں برہمن پیدائشی طور

پرعزت داراور شودر پیدائشی طور پر ذلیل مانے جاتے ہیں۔مسلمان دنیا کے ہر گوشے اور ہر خطے میں ہیں۔اب جب کہ وہ اپنا داعیانہ کردار بھول گئے ہیں تو اس وقت وہ دنیا کی آبادیوں میں داعی کے بجائے مدعو کی حیثیت سے جی رہیں ہیں۔اس لئے دنیا پر اثر انداز ہونے کے بجائے مختلف جگہوں پر مقامی آبادیوں کے تہذیب وثقافت سے متاثر ہورہے ہیں، اوران کی اچھی اور بری ہر طرح کی چیزیں اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔ان میں ذات برادری کا فرق بھی ہے جو مسلمان سماج میں بھی اسی طرح دیکھنے کو ملتا ہے جس طرح غیر مسلم سماج میں ہے۔ چنانچہ اگر ہم ہندوستان کی بات کریں تو یہاں مسلمانوں کی کچھ ذاتیں خود کو شرفا میں شمار کرتی ہیں اور دیگر ذاتوں کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتی ہیں۔حال کے دنوں میں جمہوری تقاضون کے تحت پسماندہ برادریوں میں جو تعلیمی اور معاشی بے داری آئی ہے اور کچھ سیاسی قوت حاصل ہوئی ہے تو انہیں یہ احساس ہونے لگا ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد بڑے طبقے نے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔لہذا ان کے اندر ایک انتقامی جذبہ پروان چڑھ رہا ہے جس نے مسلمان معاشرے میں ایک نئی معاشرتی کشمکش پیدا کردی ہے۔ایک زیادتی ماضی میں نام نہاد مٹھی بھر بڑے لوگوں نے کی تھی اب دوسری زیادتی نام نہاد پسماندہ طبقات کی طرف سے کی جارہی ہے۔جب کہ موجودہ ہندوستان کے حالات ہر دوطبقہ کے لئے انتہائی سنگین ہیں۔ جان ومال،عزت وآبرو،دین وثقافت،زبان،مدارس،مساجد،قبرستان،اوقاف، جدید تعلیمی ادارے سب اس وقت زد پر ہیں۔مسلمانوں کو مٹانے،کمزور کرنے،دبانے اور حاشیہ پر ڈھکیلنے اوران کو شودر بنانے کی اعلیٰ سطحی محلاتی سازشیں بڑے پیمانے پر ہورہی ہیں۔لوگ کھلی آنکھوں سے اس کو دیکھ بھی رہے ہیں۔مگر اس کے بعد بھی انتشار پھیلانے اور پھوٹ ڈالنے سے باز نہیں آرہے ہیں۔ابھی کشتی میں بیٹھے مسافروں کو آپس میں جھگڑنے کا وقت نہیں ہے بلکہ کشتی میں سوراخ کرنے والوں کو روکنے کا وقت ہے تاکہ کشتی کنارے لگ سکے ورنہ کسی ایک کی نادانی سے پوری کشتی ڈوب جائے گی اور سب ڈوب جائیں گے۔

ہمیں جاہلی عصبیت اور ماضی کی غلطیوں سے باہر نکلنا ہوگا۔مساوات اور آپسی اتحاد کو نئے سرے سے مضبوط کرنا ہوگا۔دین کے اصل کی طرف واپس آنا ہوگا۔اپنے اندر ایک امت اور ایک ملت ہونے کا احساس ابھارنا ہوگا۔حرف دوئی اور اونچ نیچ کے فرق کو مٹانا ہوگا۔تبھی ہم

اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کرسکیں گے ۔ورنہ ہم اسلام کے سلسلے میں موجودہ غلط تصور (Misconception) کو دور نہیں کرسکتے ہیں۔ ہماری ان داخلی کمزوریوں کی وجہ سے لوگوں کو اسلام کے سمجھنے میں غلط فہمی ہورہی ہے کیوں کہ ہم اس کی غلط نمائندگی کررہے ہیں۔

(۴) مغربی دانشوروں اور میڈیا کا رول

اسلام کے سلسلے میں غلط فہمی پھیلانے اور اس کو بدنام کرنے میں مغربی دانشوروں اور میڈیا کی شرانگیزی ایک اہم وجہ ہے۔اسلام کو Misrepresent کرنے اور اس کی شبیہ بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں مغربی دانشوروں ،سیاست دانوں اوران کی میڈیا کو ید طولیٰ حاصل ہے۔اسلام کے عروج کے زمانے میں انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ہر محاذ پر مات کھانی پڑی تھی یہ سلسلہ دوسال دس سال نہیں بلکہ کم وبیش پانچ صدیوں تک چلتا رہا۔پھر اس کے بعد مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ آدھی سے زیادہ دنیا فتح کرلی ہے اور تمام بڑی طاقتوں کو شکست دے دیا ہے۔اب کوئی ان کے مقابلے میں نہیں آسکتا ہے۔تن آسانی،عیش کوشی اور سہل انگاری ان کی تہذیب بن گئی اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق یہ خود کو ڈھالنے میں ناکام ہوگئے۔نتیجتاً وہ اندر سے کمزور ہونے لگے۔ان کے مقابلے مغرب اندر سے انتقامی جذبات سے پُر تھا۔اس نے سائنس اور ٹکنولوجی میں فروغ کے ذریعہ امکانات کی نئی دنیا ایجاد کرلی۔ چنانچہ جب وہ جدید علوم اور جدید ٹکنولوجی سے لیس ہوکر مسلم دنیا پر حملہ آور ہوا تو اس نے پوری قوم کو خواب خرگوش میں مبتلا پایا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پوری مسلم دنیا کو اپنا غلام بنالیا۔تمام بڑی بڑی سلطنتوں کو ہڑپ لیا۔اور چار دانگِ عالم میں اس کا ڈنکا بجنے لگا ۔مغربی استعمار نے مسلم دنیا کو اسلام سے پھیرنے (De - Islamise) کی بھرپور کوشش کی اور ایک بڑی آبادی کو اپنے جیسا بنا بھی لیا مگر وہ مسلم دنیا سے اسلام کو دیس نکالا دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔بدلتے عالمی حالات نے جب مغربی استعمار کو کمزور کرنا شروع کیا اور ساری دنیا میں حریت پسند تحریکیں تیزی سے ابھرنے لگیں نیز دو عالمی جنگوں نے یورپی استعمار کو کمزور کردیا تو انہیں مجبوراً ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو جس میں مسلم دنیا کا بڑا حصہ تھا۔آزاد کرنا پڑا۔ تاہم وہ ان ملکوں اور علاقوں کو آزاد کرتے وقت اپنی سیاست سے باز

نہیں آئے اور انہیں آپس میں بانٹنے اور باہم متصادم رکھنے کی چال چل گئے۔اس وقت ایشیائی اور افریقی ملکوں میں جو باہمی اور سرحدی تنازعات ہیں وہ سب مغربی استعمار کی دین ہیں۔افسوس ہے کہ اس خطے کے سیاست داں اور دانشور آج بھی ان کے دام میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مغرب فطرتاً توسیع پسند ہے۔سائنس اور ٹکنولوجی نے اسے جو قوت عطا کی ہے اس کی وجہ سے ساری دنیا اس کے امکان کی زد میں ہے۔وہ آزادی اور جمہوریت کا دم بھرتا ہے۔مگر اس کا مقصد اپنی نظری برتری ثابت کر کے وہاں ایسے اداروں کا قیام ہے جو بغیر جنگ کے ان کے وسائل اور علاقوں کو عملاً اس کی عملداری میں دیدے۔وہ دنیا کے قدرتی وسائل پر خود کو اپنا اولین حقدار مانتا ہے۔اگر کوئی قوت عملی اور نظری حیثیت سے اس کی مخالف ہے تو وہ اس کو اپنا ازلی دشمن سمجھتا ہے۔اور اس کو راستہ سے ہٹانے کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار ہے۔

عیسائی استعمار نے امریکہ کی قیادت میں ایک ایسے عالمی نظام (World order) کا خواب دیکھا ہے جس میں بظاہر ایک ملک آزاد وخود مختار ہوگا مگر عملاً اس کے وسائل وذرائع پر اس کا قبضہ ہوگا۔اور وہ اپنی آزادانہ مرضی سے اس کو جیسا چاہے گا اس کا استعمال کرے گا۔جو حکومت، نظریہ یا علاقہ اس کے اس دام فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں ہے وہاں وہ اپنے نظریات برآمد کر کے اس علاقے پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے اور حکومت میں تبدیلی (Regime Change) کے ذریعہ ان ملکوں میں کٹھ پتلی حکومت قائم کرتا ہے جو اس کے مزاج اور مفاد کے مطابق کام کرتی ہے۔اس عالمی نظام (World Order) کے خلاف کم وبیش پوری تیسری دنیا میں شدید بے چینی دیکھنے کو مل رہی ہے۔اور کئی جگہوں پر مسلح مزاحمت (Arms struggle) بھی ہو رہے ہیں۔

اس وقت مغرب امریکہ کی قیادت میں پوری دنیا فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔چونکہ عالمی معیشت کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔وہ سائنس اور ٹکنولوجی سے پوری طرح لیس ہے۔ذرائع ابلاغ پر اس کا قبضہ ہے۔اس نے عریانی اور فحاشی کا دفتر کھول رکھا ہے۔جس کو آرٹ، فن، اظہار کی آزادی اور تخلیق کا خوش نما نام دیا ہے اور اس میں اتنا پیسہ ہے کہ وہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لئے ایک پُر کشش کیریر بنتا جا رہا ہے۔نتیجہ ہے کہ اعلیٰ انسانی اخلاق سے عاری اور مادی

اخلاقیات کے پروردہ مرد و خواتین نے تیسری دنیا کی نوجوان نسلوں کو پوری طرح مسحور کر رکھا ہے۔ مسلم دنیا بھی ان کے اثرات سے اچھوتا نہیں ہے تاہم اسلامی اقدار عریانی اور بے حیائی کے سیلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسلام کے خلاف مغرب کا غصہ کئی طرح سے نمایاں ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ وہ اپنے ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لئے مسلم نوجوانوں کو عسکری تربیت دیتا ہے پھر انہیں مختلف زیرِ زمین انتہا پسندانہ اور دہشت گردانہ کاروائیوں کے لئے لوجسٹک سپورٹ فراہم کرتا ہے۔ مسلمانوں میں مذہبی جنون کو ہوا دے کر مختلف گروہوں کے درمیان خونریزی کراتا ہے۔ اپنی مخصوص چال (Strategy) کے ذریعہ اپنے خاص مقامات یا افراد پر حملے کراتا ہے۔ اور اس کو بہانہ بنا کر مختلف مسلم ملکوں اور علاقوں میں فوجی کارروائی کا جواز پیدا کرتا ہے۔ اور عالمی برادری کو گمراہ کر کے ان کو اپنے ساتھ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دہشت گردی کا سارا تانا بانا مغرب اور امریکہ نے بُنا ہے، اور اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے اس کو اپنے جنگی چال (Strategic warfare) کا حصہ بنایا ہے۔ دہشت گردی انسانیت اور اسلام کے خلاف ایک مجرمانہ کاروائی ہے جو حد درجہ قابل نفرت اور قابل مذمت ہے۔ یہ ایک احمقانہ، بزدلانہ اور مجرمانہ کاروائی ہے جس کی کسی طرح تائید نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس طرح کی کسی کارروائی میں ملوث ہے تو مسلم سوسائٹی سے اس کو الگ تھلگ (Isolate) کرنا چاہئے اور پوری مسلم سوسائٹی کو اس سے اپنی برأت کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس وقت دہشت گرد جتنا مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں اور مسلم آبادیوں کو تاراج کر رہے ہیں اتنا کسی اور کا نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے میں یقین کی حد تک اس بات کو مانتا ہوں کہ یہ کارروائی کسی صاحب ایمان گروہ کی طرف سے نہیں ہوسکتی ہے۔ ضرور کوئی معشوق ہے جو اس پردۂ زناری میں ہے جو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے یہ خونی کھیل کھیل رہا ہے۔

مغرب کو اپنے جمہوریت پسند، لبرل، آزاد خیال، اور اظہار رائے کی آزادی پر بہت ناز ہے اور اس کی آڑ میں وہ اسلام مخالف پروپیگنڈے کو بڑھاوا دینے میں شرافت کے تمام لباس اتار کر پوری طرح ننگا ہوگیا ہے۔ اس کا غصہ، اس کی جھنجھلاہٹ دیکھتے بنتی ہے۔ اس نے اپنے شاعروں، ادیبوں، قلم کاروں، خاکہ نویسوں، کارٹونسٹوں، ناول نگاروں، صحافیوں، سیاسی مبصروں کی

ایک پوری فوج کھڑی کر رکھی ہے جس کا کام ہی ہے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہے اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا ہے۔وہ پبلک لائف کی ساری شرافت وتہذیب(Decoram & Decency) کو بھول کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو کسی شریف اور مہذب فرد اور سماج کے فہم وقیاس سے باہر ہے۔مگر مغرب پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مظاہرہ کررہا ہے۔ اسلام کے خلاف ،حضرت محمدؐ کے خلاف اس وقت مغرب میں جو سفلہ پن دیکھنے کو ملتا ہے اس سے اس کے شدید ذہنی تشنج کا پتہ چلتا ہے جس نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ رکھا ہے۔ وہ شدت جذبات میں جل کر خاک ہورہا ہے۔ دراصل امریکہ اور مغرب نے اسلام کے خلاف Neo- Crusade یعنی ایک نئی مذہبی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔کمیونزم کے خاتمے کے بعد اس کے حوصلے بلند ہیں۔وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح اس نے کمیونزم کا خاتمہ کردیا ہے۔ اسی طرح اسلام کو بھی انسانی آبادی سے نکال باہر کردے گا۔اس لئے اس نے اسلام کے خلاف سرد اور گرم دونوں جنگ چھیڑ رکھی ہے۔لیکن اسے شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام صرف نظریہ نہیں بلکہ دین ہے اور دین کو کوئی مٹا نہیں سکتا ہے۔

بہر حال اسلام کی شبیہ بگاڑنا ،اس کی صورت مسخ کرکے پیش کرنا ،لوگوں کو گمراہ کرنا اور اسلام کو بدنام کرنا اس وقت مغرب کا محبوب مشغلہ ہے۔مغرب چونکہ بہت پڑھا لکھا تعلیم یافتہ ہے ۔ معاشی اعتبار سے کافی مضبوط ہے،اس کے پاس بے پناہ عسکری طاقت ہے،سائنس اور ٹکنولوجی سے پوری طرح لیس ہے،اس کے پاس مضبوط ادارے ہیں، بڑے بڑے ریسرچ سنٹرس ہیں،مضبوط اور موثر میڈیا ہے اور اس کے ادارے کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد دنیا میں ہر جگہ فیصلے کے مقام پر فائز ہیں،اس لئے اس کی طرف سے جو بات آتی ہے ساری دنیا اس کو توجہ سے سنتی ہے،اس کو یک گونہ وثوق (Credibility) حاصل ہے۔اس ماحول میں مغرب کی اسلام دشمنی اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے جس کا بڑی حکمت سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔بے احتیاطی میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم نقصاندہ ثابت ہوسکتا ہے۔ہمیں ایمان اور فراست مومن سے کام لینا ہوگا ۔اور ایک پُرامن جوابی انقلاب کے ذریعہ اس کی تمام تر ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

فریضۂ شہادت حق کی جہتیں اور طریقۂ کار

یہ وہ داخلی اور خارجی حالات ہیں جس میں شہادت حق کا فریضہ انجام دینا ہے۔شہادت حق کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام دین حق ہے۔اور ہم اس کی گواہی دیتے ہیں بلکہ ایک ایسا ماحول بنائیں جس میں اسلام کا حق ہونا ثابت ہو جائے۔اس کے لئے ہمیں مختلف سطحوں پر اور مختلف انداز سے اس فریضے کو انجام دینا ہوگا۔

(۱) علم کا فروغ اور جہالت کا خاتمہ

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی جہالت اور ناخوانگی کے گہرے اندھیرے میں بھٹک رہی ہے اس کو علم کی روشنی میں لانا شہادت حق کی لازمی ضرورت ہے۔مسلمانوں میں عام خواندگی (General literacy) کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم اور بیداری پیدا کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ایک جاہل اوران پڑھ قوم شہادت حق کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی ہے۔جو دین کی بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہے وہ اس کی شہادت اور اقامت کا فریضہ کیسے انجام دے سکتی ہے؟ اس لئے مسلم آبادیوں میں علم کا فروغ اور جہالت کا خاتمہ شہادت حق کی اولین شرط ہے۔

(۲) مسلمان تعلیم یافتہ طبقے پر توجہ

مسلمانوں کا وہ طبقہ جو خواندہ اور تعلیم یافتہ ہے بلکہ جس کا شمار دانشوروں اور معاملہ فہم صاحب علم میں ہوتا ہے مگر ان کی دینی معلومات واجبی اور ناقص ہے جس کی وجہ سے ان کا فکر و کردار اسلام کے بجائے کفر کی گواہی دیتے ہیں یا جنھوں نے اسلام کو بچوں کا کھیل سمجھ لیا ہے اور اپنی ناقص علم کی وجہ سے اس کی غلط شہادت و وکالت پیش کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کو بھی اسلام سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ان کے ذہن و مزاج، علم اور سمجھ کو سامنے رکھ کر ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ان کے ذہن کے بند گرہ کو کھول سکے اور ان کی صحیح اسلام کی طرف رہنمائی کر سکے، یہ طبقہ ہماری توجہ کا خاص مستحق ہونا چاہئے۔اس سے نفرت کرنے یا ان کو برا بھلا کہہ کر ان

سے الگ رہنے یا دور بھاگنے کے بجائے ان کے پاس جانے کی ضرورت ہے، اور دلسوزی کے ساتھ ان کے ذہن وجذبات کو اپیل کرنے کی ضرورت ہے۔ تا کہ اسلام کا یہ بھٹکا ہوا قافلہ اپنے قبیلے میں شامل ہو جائے۔ مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کی 95% تعداد اپنی اصل کی طرف آسانی سے واپس آسکتی ہے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں اور وسائل کا اسلام کی شہادت واقامت کے لئے بھرپور استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم مناسب ڈھنگ سے ان کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ کریں اور ان کو اسلامی فولڈ میں لانے کی منصوبہ بند کوشش کریں۔ ہم نے ایسے سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو دیکھا ہے جب تک وہ مسلم ملکوں اور آبادیوں میں رہے اس وقت تک اسلام سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں تھا بلکہ وہ ہر بات پر منھ آتے تھے اور یک گونہ ان کو مسلم ثقافت اور اسلامی روایات سے نفرت تھی مگر جب یہی لوگ انگلینڈ اور امریکہ اور دیگر یورپی ملکوں میں جا بسے اور وہاں ان کا مختلف تمدن سے سابقہ پڑا تو وہ پوری شدت کے ساتھ اسلام کی طرف پلٹے۔ بقول اقبال ؎ مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے، اس لئے ہم اپنی موجودہ تعلیم یافتہ نسل سے مایوس نہیں بلکہ بہت پرامید ہیں۔ بس ضرورت ہے صحیح انداز کے ساتھ ان تک پہنچنے کی۔ مسلمانوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام کا وہ غیر استعمال شدہ وسیلہ ہے جس کو ایک بار اگر دریافت کر لیا جائے اور سلیقے سے اس کا استعمال ہو تو شہادت حق کا فریضہ بھی انجام دیا جاسکے گا اور انسانیت عظمی کی رہنمائی کے لئے ایک نئی باصلاحیت حوصلہ مند قوت وقیادت بھی ہاتھ آئے گی۔ شہادت حق کے لئے اس طبقہ کو اچھی طرح سمجھنے اور مثبت انداز سے اس کے ساتھ جڑنے کی ضرورت ہے۔

(۳) مسلمانوں میں اتحاد وتنظیم کی ضرورت

شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی کے لئے مسلمانوں میں دینی جانکاری اور دینی بیداری کے ساتھ ساتھ ان کے اندر اتحاد وتنظیم بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کرنا ہوگا کہ مسلک اور برادری پہچان کے لئے ہیں نہ کہ تکرار کے لئے۔ سارے مسالک برحق ہیں اور سارے مسلمان عزت وشرف میں برابر ہیں۔ پھر ان مسالک کے درمیان حق اور باطل یا برادریوں کے درمیان چھوٹے اور بڑے کی تمیز غلط اور غیر اسلامی ہے۔ مسلمانوں میں اتحاد کی ساری علامتیں موجود

ہیں اور مسلمان قوم بنیادی طور پر متحد بھی ہے ۔ جب کبھی ناموس رسولؐ پر حملہ ہوتا ہے، قرآن وشریعت پر قدغن لگانے کی کوشش ہوتی ہے ۔ مساجد اور مدارس کو نشانہ بنایا جاتا ہے ۔ مسلمان سارے اختلاف بھول کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں ۔ اس وقت کوئی نہیں پوچھتا کہ کون دیوبندی ہے؟ کون بریلوی ہے؟ کون اہل حدیث ہے؟ کون سید ہے کون شیخ کون پٹھان؟ کون انصاری اور کون راعین ہے؟ اس وقت سارے مسلمان اپنے نبیؐ کی حرمت پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی اتحاد کی کوئی علامت ہو سکتی ہے؟ جب فساد ہوتا ہے تو مارنے والا یہ نہیں دیکھتا کہ وہ دیوبندی کو مار رہا ہے یا بریلوی کو، شیخ کو مار رہا ہے یا انصاری کو ۔ اس وقت اس کو مسلمان سمجھ کر مارا جاتا ہے ۔ جب دشمن مسلمان اور مسلمان میں فرق نہیں کرتا پھر مسلمان کیوں مسلمان میں فرق کرتے ہیں؟ اپنی طاقت کو کمزور کرتے ہیں اور اغیار کو اپنے اوپر چڑھ دوڑنے اور غالب آنے کا موقع دیتے ہیں جب تک ہم مسلک اور برادری سے اوپر اٹھ کر خود کو اسلام کے نام پر جمع نہیں کریں گے ہماری طاقت بکھری رہے گی اور دشمن ہم کو مغلوب کر کے ایک ایک کر کے چن چن کر مارتے ،ستاتے ،دباتے ،کمزور کرتے اور پامال کرتے رہیں گے ۔ مسلمان عوام میں اتحاد کا زبردست داعیہ موجود ہے ۔ مگر ہمارے بعض مفاد پرست نادان دوست یا دشمن کی طرف سے خریدے ہوئے لوگ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے مسلک اور برادری کا جھگڑا کھڑا کر کے ہمیں آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ مسلمان کمزور ہو جائیں ۔ جب مسلمان کمزور ہو جائیں گے تو اسلام کمزور ہوگا اور اس طرح انہیں مسلمان اور اسلام کو مغلوب کر کے اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کا موقع مل جائے گا ۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنے دشمنوں کی چال کو سمجھیں ،اپنی صفوں میں دوست نما دشمن کو پہچانیں اور آپس میں لڑائی جھگڑے سے باز آئیں ۔ لہذا شہادت حق کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان انتشار کو دور کر کے ان کو سیسہ پلائی دیوار بنایا جائے اور اساس دین کی بنیاد پر ان کو متحد اور منظم ہونے کی دعوت دی جائے ۔ تبھی ہم مجموعی طور پر شہادت حق کا فریضہ انجام دے سکیں گے ۔ شہادت حق کسی مخصوص جماعت یا گروہ کی ذمہ داری نہیں ہے ۔ بلکہ پوری مسلم ملت کی ذمہ داری ہے ۔ قرآن نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ رسول تم پر گواہ ہیں اور تم ساری دنیا پر اس دین

کے گواہ ہو(البقرہ۱۴۴) شہادت حق ہماری ازلی اور منصبی ذمہ داری ہے۔یہ مسلمانوں کا وہ کام ہے جس کے لئے وہ دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔اس لئے سارے مسلمانوں کو چاہے وہ کسی مسلک کے ماننے والے ہوں کسی جماعت کے فرد ہوں یا کسی ذات برادری سے تعلق رکھتے ہوں انہیں شہادت حق یعنی اسلام کی ،(جواللہ کا سچا آخری اور مکمل دین ہے) گواہی مسلمانوں اور غیر مسلموں یعنی ساری دنیا کو دینی ہے۔تبھی وہ دنیا میں عزت وسر بلندی اور آخرت میں اللہ کی رضا اور انعام کے مستحق ہوسکتے ہیں ورنہ اس جرم میں وہ خدا کے غضب کے شکار ہوں گے، رسولؐ اور قرآن کی شفاعت سے محروم ہوجائیں گے ۔یہاں بھی گھاٹے میں رہیں گے اور وہاں بھی گھاٹے میں رہیں گے۔لہذا شہادت حق کے لئے مسلمانوں کا باہمی طور پر متحد ہونا اور منظم ہونا دوسری بڑی ضرورت ہے۔

(۴) غیر مسلموں میں دعوت

شہادت حق کی چوتھی سطح وہ ہے جس کا تعلق غیر مسلم دنیا سے ہے۔اسلام نظری اور علمی طور پر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک اسلامی دنیا ہے جس کو وہ ملت اسلام کہتا ہے اور دوسری غیر اسلامی دنیا ہے جس کو وہ ملت کفر قرار دیتا ہے۔ملت کفر چاہے وہ کوئی بھی ہو اور باہم وہ کتنی ہی متضاد اور متصادم ہو اسلام کے مقابلے میں سب ایک ہیں الکفر ملت واحدۃ۔تمام اہل کفر ایک ملت ہیں۔حضورؐ کے زمانے سے لے کر آج تک جتنے یہودی ہیں،عیسائی ہیں۔مشرک ہیں، دہریہ ہیں ،ان کے اندر رنگ ونسل ،زبان وثقافت ،طرز حکمرانی ،معیشت ومعاشرت ،عقیدہ وتہذیب میں چاہے جتنا بھی فرق ہے۔اسلام کی مخالفت اور دشمنی کے معاملے میں ان کے درمیان یک گونہ تحریری اور غیر تحریری معاہدہ پایا جاتا ہے۔کل تک جب مسلمان اپنے دین وعقیدے کے ساتھ ساتھ سیاسی اور عسکری طور پر مضبوط تھے تو ان کے دشمنوں کی ایک نہیں چلتی تھی اور وہ ہر محاذ پر فتح یاب تھے۔مگر جب یہ صورت حال بدلی۔انہوں نے اپنے دین کو چھوڑ دیا۔ان کے عقیدے میں جھول پیدا ہونے لگا۔علم کی جگہ انہوں نے جہالت کو گلے لگالیا۔آپس میں انتشار وافتراق پیدا ہوا۔ان کی فوجی طاقت کمزور ہوگئی۔اور ان کی اجتماعیت بکھرنے لگی تو جو طاقتیں مغلوب تھیں ان پر غالب آنے لگیں۔اس وقت ساری دنیا میں اہل کفر نے اسلام اور مسلمانوں کو دبوچ رکھا ہے۔مسلمان پوری طرح سے

مغلوب ہوگئے ہیں تاہم روح اسلام آزاد ہےاور وہ مغرب کی بالادستی اور غلبہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

مغرب کو اسلامی آبادیوں میں جگہ جگہ شدید کشمکش کا سامنا ہے۔اس وقت مغرب پر پوری طرح جھلاہٹ طاری ہے۔چار پانچ سو سال کے سیاسی، عسکری، معاشی اور علمی غلبے کے باوجود وہ روح اسلام کو شکست دینے میں ناکام ہے ۔غصے اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے مغرب نے اپنا ذہنی توازن کھودیا ہے۔وہ پوری بے رحمی اور بے شرمی کے ساتھ مسلم آبادیوں کو تاراج کرنے کے ساتھ ساتھ منھ چڑھانے ،پھبتی کسنے، مذاق اڑانے ،جذبات سے کھیلنے اوراس طرح اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کی کوشش کررہا ہے۔اس نے اپنے شاعروں، ادیبوں ، فنکاروں ،صحافیوں ، قلمکاروں ، خاکہ نگارون ، کارٹونسٹوں اور تمام طرح کے لوگوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ اسلام کے خلاف جتنا ہفوات بک سکتے ہیں بکیں اور جیسی غیر شریفانہ حرکتیں کر سکتے ہیں کریں تاکہ مسلمانوں کی دلآزاری ہواوران کے جذبات بھڑکیں۔تاکہ وہ اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا جواز حاصل کرسکیں۔

دہشت گردی کے نام پر انہوں نے ایک نئی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔مسلمانوں میں جو گروہ دہشت گردانہ کارروائی میں ملوث ہیں انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہئے کہ ایسی کارروائی فائدہ کے بجائے نقصان پہنچانے والی ہے۔اس سے اسلام اور مسلمانوں کا بھلا نہیں ہوگا۔دہشت گردی انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے ۔اور یہ ایک بزدلانہ، احمقانہ، اور مجرمانہ کارروائی ہے۔یہ قبائلی یا مقامی جنگ نہیں ہے، یہ عالمی جنگ ہے۔یہ جنگ ہتھیار سے نہیں لڑی جاسکتی ۔یہ علمی جنگ ہے۔لہذا چند بے گناہ معصوم لوگوں کو مار کر اور اکا دکا جگہوں پر بم پھوڑ کر کسی بھی Establishment کا کچھ نہیں بگاڑا جاسکتا ہے۔اس سے دشمن کو مجروح اور پریشان تو کیا جاسکتا ہے اس پر جیت حاصل نہیں کی جاسکتی۔It can bleed the enemy but can not Defeat it اس لئے جو لوگ ایسے انسانیت دشمن غیر اسلامی حرکتوں سے جڑے ہوئے ہیں ان کو اس سے باز آنا چاہئے ۔یہ جہاد نہیں ہے۔یہ ظلم ہے گناہ ہے۔غیر انسانی، غیر اسلامی فعل ہے۔ہم اس کی ہر ممکنہ مذمت کرتے ہیں۔

آج کی جاہلیت بہت پڑھی لکھی جاہلیت ہے۔سائنس اور ٹکنولوجی سے لیس ہے۔علم

وتحقیق کی دلداہ ہے۔نظم اورمنصوبہ بندی سے کام کرتی ہے۔اس کے پاس بے پناہ وسائل اوراعلی دماغ ماہرین ہیں،دانشوروں اورمدبروں کی بڑی فوج ہے۔اس وقت اس کی علمی،عسکری،معاشی قوت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔مغرب اوراہل کفر سے ہتھیار کی لڑائی نہیں جیتی جاسکتی ہے۔اس وقت مسلمانوں کو نئے حالات اور نئے زمانے کے لحاظ سے مومنانہ حکمت وفراست سے کام لیتے ہوئے نئے ہتھیار سے جہاد زندگانی کی جنگ جیتنے کے لئے پرعزم کوشش کرنی ہوگی۔

شہادت حق کے لوازم

(۱) تجدید ایمان

اس میں سب سے پہلا ہتھیار تجدید ایمان ہے۔یعنی اپنے ایمان کو پھر سے زندہ اور بیدار کرنا ہوگا۔کمزور ایمان کے ساتھ ہم یہ جنگ نہیں لڑ سکتے۔اس کے لئے خدا پرایمان،رسول پرایمان۔اورآخرت پر ایسا ایمان ضروری ہے کہ قوم اس سے لذت آشنا ہوجائے اورقرآن پاک سے اس کی جذباتی اورعملی وابستگی استوار ہو۔

(۲) اعتصام باللہ اوراعتصام بالرسالت

دوسرا ہتھیار اعتصام باللہ اوراعتصام بالرسالت۔یعنی اپنے خدا اوراپنے رسولؐ سے چمٹ جانا ۔جس طرح ایک بچہ کسی خوف یا خطرے کے وقت اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے ۔اسی طرح ایک مومن کو اپنے خدا اوراپنے رسول سے چمٹ جانا چاہئے ۔یہ وہ پناہ گاہ ہے جہاں خطرہ کافور ہوجاتا ہے۔قرآن اوررسول کا احترام مسلمانوں پرفرض ہے۔جوغیرمسلم ہیں ان پرفرض نہیں ہے۔اگرکوئی غیرمسلم تہذیب وشرافت چھوڑ کر خدا اوررسول کی شان میں گستاخی کرتا ہے اورقرآن کی بیحرمتی کرتا ہے تو یہ اس کے عقیدے اورتہذیب کے عین مطابق ہے۔ہمارا اس پرغصہ ہونا فطری ہے مگر ایسی صورت میں اپنے جذبات پرقابو رکھیں بلکہ ایسی تمام حرکتوں کے جواب میں ہمارا ردعمل یہ ہونا چاہئے کہ ہم کوئی اوچھی حرکت نہ کریں۔خدا،اس کے رسول اوراس کی کتاب سے سوگنا محبت واحترام وفاداری اورعمل کا مظاہرہ کریں ۔صحابہ کا اسوہ ہمارے سامنے بہترین نمونہ عمل ہے۔جب مکہ والے حضورؐ پرکوڑے ڈال رہے تھے۔،سر پراوجھ ڈال رہے تھے،راستے میں کانٹے

بچھا رہے تھے، پتھر مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے، مدینے میں آپ کے قتل کی سازش کر رہے تھے، مسلمان اپنے نبیؐ پر جان چھڑک رہے تھے ۔ان کی ایک ایک بات مان رہے تھے ۔ان کے اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، آپ کے وضو کا پانی بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے ۔غرض خود سپردگی اور جان نثاری، محبت واحترام کے ذریعہ ایک ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے تھے جس نے بالآخر دشمنوں کو ہار ماننے پر مجبور کر دیا ۔ بہت سے کٹر کافر مومن و مسلم ہو گئے اور جو لوگ حضورؐ کے خون کے پیاسے تھے وہ جان نثار ساتھی بن گئے ۔اسلام نے کل بھی اس ہتھیار سے دنیا فتح کیا تھا اور آج بھی اسی ہتھیار سے دنیا فتح ہو گی ۔

(۳) انسان دوستی اور انسانیت کی بھلائی کی حرص

دہشت گردی کے بجائے انسان دوستی، نفرت کے بجائے محبت، عداوت کے بجائے خدمت اور دوست ہو یا دشمن سب کی بھلائی کی فکر اسلام کا وہ کارگر ہتھیار ہے جس کو لے کر ہم انسانی آبادیوں میں آئیں تو دنیا کی تقدیر بدل سکتی ہے۔شہادت حق یا اسلام کے پیغام کو عام کرنے کا مقصد مسلمانوں کی تعداد بڑھانا یا اپنے غلبے کی کوشش کرنا نہیں ہے بلکہ لوگوں کو خدا کے غضب، جہنم کی آگ اور ابدی خسارے سے محفوظ رکھنا ہے ۔ یہ انسانیت کی حد درجہ ہمدردی کا مظہر ہے ۔ یہ کام بغیر غرض اور اجرت کے محض خدا کی خوشنودی اور عام لوگوں کی بھلائی کے جذبے سے کیا جاتا ہے ۔اس کا کوئی سیاسی اور معاشی مقصد نہیں ہے ۔ایک ماں اپنے بچے سے جتنا پیار کرتی ہے اور جس طرح اس کی بھلائی چاہتی ہے، ایک مسلمان انسانیت سے اتنا ہی پیار کرتا ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ وہ بلا امتیاز رنگ و نسل، جنس و قوم پوری انسانیت کی بھلائی کا حریص ہے۔یہی جذبہ اسے لوگوں کی دشمنی اور عناد کے باوجود ان تک پہنچ کر دین کی دعوت دینے پر مجبور کرتا ہے ۔ یہ کام مسلمانوں کے کسی ایک گروہ یا جماعت کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ پوری ملت کے کرنے کا کام ہے ۔ لہذا مسلمانوں کو اس کے لئے علمی، عملی اور اخلاقی لحاظ سے تیار کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے ۔ شہادت حق کی ادائیگی ہی دنیا اور آخرت میں مسلمانوں کے فلاح کی ضامن ہے ۔

(۴) حصول علم

ہم سائنس اور ٹکنولوجی کا نظم ومنصوبہ بندی کا مقابلہ جہالت اور بے ڈھنگا پن سے نہیں کر سکتے ہیں۔دنیا اسباب وعلل کی جگہ ہے۔یہاں وجہ اور اثر کا قانون نافذ ہے۔اب ہمیں جہالت کو تین طلاق دے کر مسلمان سماج سے باہر نکالنا ہوگا۔اور علم کی دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر میں لانا ہوگا ۔سائنس اور ٹکنولوجی کا علم اسی طرح حاصل کرنا ہوگا جس طرح دین کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔بغیر علم کے اسلام اور مسلمان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ماضی میں ہم نے جو بھی غلطی کی ہے۔اب اس کو دہرانا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ہمیں اپنی نئی نسل کو ہر طرح کے علوم وفنون سے آراستہ کرنا ہے۔اور پوری قوم کو امت العلم بنانا ہے۔تبھی ہم وہ وسائل وذرائع حاصل کر پائیں گے جو شہادت حق اور جہاد زندگانی میں قوموں کو سر بلند اور سرخرو رکھنے کے لئے ضروی ہے۔اس کے لئے نئے ریسرچ سنٹر،نئی لیبوریٹری بنانے کی ضرورت ہوگی۔اسلام پر جان دینا آسان ہے مگر تا عمر اپنے ذہن وعمل سے اس کی شہادت پیش کرنا مشکل ہے۔یہ دور جہاد بالسیف کا نہیں جہاد بالقلم کا ہے۔عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔اسلام کو اس وقت آپ کے ذہن کی ضرورت ہے۔کسی قوم کی سر بلندی اور کسی نظریہ کی عظمت اس کے Human Resource کی کوالیٹی سے طے ہوتی ہے۔ہمیں اپنے اندر ایسے ہزاروں سائنٹسٹ،اکنومسٹ،پولیٹکل تھنکر،فلاسفر،قانون داں،ٹیچر،انجینیر ،جرنلسٹ،ادیب،مورخ،شاعر، قلمکار اور دیگر شعبوں کے ماہرین پیدا کرنے ہیں جو اجتہادی اور تخلیقی صلاحیتوں سے متصف ہوں اور دنیا ان کے علم وکمال کا لوہا مانتی ہو،جب تک اسلام کو اعلی ذہنی وفکری صلاحیتوں کے لوگوں کا ساتھ نہیں ہوگا۔ہماری بڑی آبادی اور بڑے وسائل ضائع ہوتے رہیں گے بلکہ ان کا استعمال ہمارے خلاف ہوگا۔یہ دور علم وسائنس کا دور ہے،علم اور سائنس کا جواب علم اور سائنس ہی ہوسکتا ہے۔اس لئے اعلی علمی صلاحیت مجموعی اعتبار سے شہادت حق کی لازمی ضرورت ہے۔لہذا اپنی نوجوان نسل کو اس انداز سے تربیت دینا اور اس طرح ان کی تزئین ذہنی کرنا شہادت حق کا لازمہ ہے۔

حاصل کلام

لہذا بدلتے حالات میں شہادت حق محض اس کا نام نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو صرف یہ

بتائیں کہ اسلام دین حق ہے بلکہ ہمیں اپنے ایمان اور عقیدے کو جلا بخشنی ہوگی، اپنے رسولؐ اور اپنی کتاب سے پوری طرح جڑنا ہوگا۔ اپنی قوم کو اعلیٰ علمی صلاحیتوں سے متصف کرنا ہوگا۔ اور پوری انسانیت کے لئے بے لوث خدمت، محبت اور ایثار کے ساتھ ان سے جڑنا ہوگا۔ کسی آفت کے وقت مدد کے لئے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ مسلمان کا ہونا چاہئے۔ اور کسی ظلم کے خلاف اٹھنے والے پہلی آواز مسلمان کی ہونی چاہئے۔ اس طرح ہمیں اپنے ایمان، اخلاق، اتحاد، خدمت اور انسانیت دوستی کے ذریعہ شہادت حق کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔ یہی ایک مسلمان کا مقصد حیات ہے اور یہی امت مسلمہ کا مشن ہے جس پر اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس کو مامور کیا ہے۔ ہے کوئی جو سنے اور مانے اور دین کی گواہی دینے کے لئے اپنے گھروں، بستیوں اور شہروں سے نکل کر اجنبی انجان اور دور دراز علاقوں میں پہنچ کر اخلاص کے ساتھ صحیح علم کی روشنی میں اپنے قول و عمل سے اللہ کے دین کی گواہی پیش کرے! صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے!

قرآن اور ہندوستان

ہندوستان اور قرآن کا رشتہ

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ قرآن ایک آفاقی اور ابدی کتاب ہدائت ہے۔لہذا قران کو کسی خاص زمانے یا ملک تک محدود کرنا عملی اور تاریخی طور پر غلط ہے۔قرآن تمام انسانوں کے لئے کتاب ھدایت ہے لہذا جس طرح عربوں کے لئے اس کتاب میں ھدایت ،رحمت اور شفا ہے اسی طرح ہندوستان کے لئے بھی یہ کتاب رحمت ،ھدایت اور شفا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی پاکؐ نے اپنے مشن کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ''جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ اس دین اور دعوت کو ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''اس بات کو امت نے ساری دنیا کے لئے اور قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کے حق میں ایک وصیت مانا اور پھر اس دین و دعوت کی تبلیغ و اشاعت میں ساری دنیا میں پھیل گئے۔ہندوستان جنت نشان بحر عرب کی دوسری ساحل پر تھا جہاں سے عربوں کے قبل از اسلام ہزاروں سال سے تجارتی اور ثقافتی روابط تھے چنانچہ اس ملک تک نہ آنا اور یہاں اسلام کی دعوت نہ پہنچانا کیسے ممکن تھا؟ بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کی بین الاقوامی جماعت میں جہاں ایک طرف صہیب رومی ،بلال حبشی ،سلمان فارسی تھے وہیں ایک ہندوستانی صحابی بھی تھے۔یہ اس لئے کم مشہور ہوئے کیونکہ واقعہ شق القمر کے بعد یہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان لاکر پھر اپنے مقام پر لوٹ آئے۔ مالابار کے علاقے میں راجہ پیرومل غالباً پہلے ہندوستانی مسلمان تھے۔بلاد عرب کے بعد غالباً ساحل مالابار پر بنی مسجد ساری دنیا میں سب سے پہلی مسجد ہے اسلام ہندوستان میں مسلمان حملہ آوروں کے آنے سے بہت پہلے آچکا تھا۔عرب حملہ آور تو سندھ تک آکر رک گئے۔اس کے بعد ترک ،منگول اور افغان نسل کے مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور ۱۱۹۲ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک یعنی باضابطہ دہلی پر انگریزوں کی حکومت قائم ہونے تک بہت سے مسلمان خاندانوں نے اس ملک کے طول و عرض پر شمال اور جنوب میں حکومتیں کیں۔یہ حکومتیں مسلمان حکومتیں تو تھیں کیونکہ ان

کے فرمانروا مسلمان تھے لیکن یہ اسلامی حکومت نہیں تھی کیونکہ ان حکومتوں کا دستور قانون اسلامی نہیں تھا۔ مسلمانوں پر اسلامی شریعت نافذ ہوتی تھی مگر غیر مسلموں پر اس شریعت کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ غیر مسلم رعایا اپنے مذہبی اور سماجی معاملات میں اپنے مذہبی احکام اور سماجی ضابطوں کی پابند تھی ۔ چونکہ یہ حکومتیں اسلامی نہیں تھیں اس لئے مسلمان حکمرانوں نے اپنے سیاسی فائدے یا شرارت نفس کی وجہ سے غیر مسلموں اور مسلمانوں دونوں پر ظلم ڈھائے ۔ لیکن ان مظالم کو اسلام کے کھاتے میں لکھنا اور اس کی بنا پر آج کے مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانا یہ دوسری طرح کا ظلم ہے۔ ۔ ہمیں ان تاریخی تلخیوں سے باہر نکل کر بالکل معروضی انداز میں نئے سرے سے قرآن اور اسلام کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس بحث سے یہ واضح ہے کہ قرآن اور ہندوستان کا رشتہ فطری اور تاریخی دونوں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن ہندوستان کے لئے اجنبی بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کی زبان عربی ہے اور اس ملک میں عربی جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر چونکہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے اور دنیا کے تمام انسانوں کی زبان عربی نہیں ہے اور یہ ایک مشکل کام ہے کہ جب تک لوگ عربی نہ جانیں قرآن کی دعوت سے واقف نہیں ہو سکتے ۔ لہذا اس بات کا شروع سے اہتمام کیا گیا کہ قرآن کی دعوت کو ان کی اپنی زبانوں میں لوگوں تک پہنچایا جائے ۔ اس کا سلسلہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے زمانے میں شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے عہد میں اپنے آس پاس کے بہت سے حکمرانوں کو خطوط لکھوائے اور چند ذہین نوجوان صحابہ کو کوئی دوسری زبانیں سیکھنے کی ھدایت کی ،جس پر انہوں نے عمل کیا اور اس طرح آپ کی دعوت مختلف زبانوں کے ذریعہ ان لوگوں تک پہنچی جو عربی زبان سے واقف نہیں تھے۔

جب مسلمانوں کے فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی حکومتیں بلاد عرب سے باہر پھیلنے لگیں تو ظاہر ہے مختلف قوموں اور زبانوں کے ساتھ تجارتی اور ثقافتی تعلقات کے علاوہ ہر سطح پر تعلق استوار ہوئے جس کے نتیجے میں عربوں نے غیر عربی زبانیں سیکھیں اور غیر عربوں نے عربی زبان سیکھی ۔ جو غیر عرب مسلمان ہوئے انہوں نے عربی ایک مذہبی فریضے کے طور پر پڑھی اور سیکھی کیونکہ نماز میں قرآن کی تلاوت فرض تھی ۔ لہذا قرانی سورتوں کو یاد کرنا اور ان کا پڑھنا ضروری تھا۔ دین کی

اچھی واقفیت کے لئے قرآن ،حدیث ،فقہ اور دیگر علوم کا جاننا ضروری تھا۔لہذا کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے علم دین حاصل کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ یہ عالم دین کہلائے ، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دین کو عربی ماخذ سے سیکھا اور پھر اپنی مقامی زبانوں میں لوگوں کو سکھایا اور بتایا۔ یہیں سے ترجمہ اور تشریح کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مجھے اس کا علم تو نہیں ہے کہ سب سے پہلے غیر عربی زبان میں قرآن کا مکمل ترجمہ کس زبان میں اور کب ہوالیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان جہاں گئے انہوں نے اسلامی تعلیمات کو مقامی زبانوں اور بولیوں کے ذریعہ مقامی آبادیوں تک پہنچایا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت صوفیہ کا طریق دعوت ہے جس میں انہوں نے مقامی بولیوں اور محاوروں میں ہی نہیں بلکہ مقامی ثقافتی اداروں کے ذریعہ دین کی دعوت ،عام لوگوں تک پہنچائیں ۔ ہندوستان میں اس طرح کی ہزاروں نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں قرآن کا مکمل ترجمہ کیا چونکہ اس وقت فارسی ملک کی سرکاری زبان تھی لہذا ہندوؤں اور مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگ فارسی زبان سے واقف تھے اور اپنا تمام سرکاری اور علمی کام فارسی زبان میں انجام دیتے تھے۔شاہ ولی اللہ کا زمانہ مغلیہ دور کا آخری زمانہ تھا۔ جب انگریزوں کی حکومت ملک میں قائم ہوگئی اور فارسی کا چلن کم ہونے لگا تو شاہ ولی اللہ صاحب کے بیٹوں اور پوتوں نے اردو زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا اور اس طرح قرآنی تعلیمات کو عام لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔دلی پر براہ راست انگریزوں کے غلبہ نے ملک کی سیاسی صورتحال کو بالکل بدل کرر کھ دیا۔اب مسلمانوں کو اپنی جان ومال کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے دین کے تحفظ کی بھی فکر لاحق ہوگئی۔لہذا مولانا قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو اسلام کی دعوت ،اشاعت اور استحکام کا ایک مضبوط قلعہ بنادیا۔اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی اور اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن اور مولانا احمد رضا خانصاحب نے قرآن پاک کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا اور اس کی تفسیر لکھی۔ اس کے بعد اردو میں قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر کا دور شروع ہوگیا اور اس طرح کی سیکڑوں تفسیریں منظر عام پر آئیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس وقت دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن کا ترجمہ اور اس کی تشریح موجود ہے۔ آزادی کے بعد گرچہ ہندوستانی مسلمان سخت حالات سے دوچار رہے اور جان و مال کے تحفظ اور اپنی بقا و شناخت کے مسئلہ سے باہر نکل کر کچھ زیادہ سوچنے اور کرنے کا موقعہ ان کو نہیں ملا تاہم اس دور پُر آشوب میں جماعت اسلامی ہند نے ایک ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے جس کی گونج صدیوں تک سنائی دے گی اور آنے والی صدیوں میں اس کو ایک سنگ میل اور ٹرننگ پوائنٹ مانا جائے گا۔ ۱۹۴۶ میں آزادی سے قبل مولانا مودودی نے اپنے خطبہ مدراس میں اسلامی لٹریچر کو ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے اور تیار کرنے کا مشورہ دیا تھا اور جماعت اسلامی نے اس سلسلے میں عمل کرتے ہوئے ہندی کے علاوہ تمام ریاستی اور دستوری زبانوں میں قرآن، حدیث، سیرت اور دیگر اسلامی لٹریچر کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ بلکہ اب ان زبانوں میں اوریجنل اسلامی لٹریچر کی تیاری بھی کی جارہی ہے تاکہ ان زبانوں کی ثقافت اور محاوروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی دعوت پیش کی جاسکے۔ اور جو لوگ ان زبانوں کے ماہرین اور اہل زبان ہیں ان کو ترجمہ کی اجنبیت محسوس نہ ہو اب اس کام کو دستوری زبانوں کے علاوہ مقامی بولیوں میں بھی کرایا جارہا ہے جس کا رسم الخط موجود ہے تاکہ ان قبائل اور علاقوں تک بھی اس دعوت اور پیغام کو پہنچایا جاسکے۔

یہ مختصر جائزہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ قرآن اور ہندوستان کا رابطہ بہت گہرا اور قدیم ہے جس کو مثبت انداز سے وسیع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا ہندوستان سے ایک لمبا تاریخی اور عملی رابطہ ہے۔ تاہم یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ نظری اعتبار سے قرآن آج بھی ملک کے ایک بڑے طبقہ کے لئے بند کتاب ہے جس پر غلط فہمیوں کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی اکثریت جاہل اور اَن پڑھ ہے۔ لہذا ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے طبقے کو معلوم نہیں کہ قرآن کیا ہے اور اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ عام لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی تھی مگر ایک دور کے بعد وہ سلسلہ رک گیا۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہیں ان کی واقفیت اور سمجھداری بہت محدود ہے۔ ایک طبقہ ہے جو غیر سنجیدہ ہے اور دوسرا طبقہ ہے جو متعصب ہے۔ لہذا ان دونوں نے مل کر ایسی فضا بنائی ہے جس میں کسی بات کو صحیح تناظر میں جاننا اور سمجھنا مشکل

ہے۔غلط فہمی اگر غیر مسلموں میں ہوتو اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے لیکن جب اسلام کے ماننے والے اور اس کے وکیل اور داعی ہی غلط بات کی تبلیغ کریں گے اور اس کو بہ تکرار پھیلائیں گے تو عام آدمی کا غلط فہمی میں مبتلا ہونا فطری ہے۔مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اسلام کو صرف مسلمانوں کا دین مانتا ہے اور قرآن کو مسلمانوں کی مذہبی کتاب کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔اسلام مسلمانوں کا دین ہے اور قرآن مسلمانوں کی کتاب ہے کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔مگر قرآن اور اسلام کی دعوت تمام انسانوں کے لئے عام ہے۔جس میں عربی عجمی ،کالے گورے، چھوٹے بڑے عورت مرد، بچے بوڑھے، جوان ،ایرانی تورانی ،امریکی افغانی ، ہندوستانی چینی ، ہندو مسلمان ،سکھ عیسائی ، پارسی شودر برہمن کسی کی کوئی قید نہیں ہے۔ جو اسلام کو مانے گا اور جو قرآن سے ھدایت طلب کرے گا یہ سب کا دین ہے سب کی کتاب ھدایت ہے ۔قرآن ایک نسخہ شفا ہے جو بھی اپنائے گا شفا پائے گا۔ یہ مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔سورج چاند، زمین، ہوا، پانی کی طرح تمام انسانوں کا مشترکہ ورثہ ہے،اس پر عام انسانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی مسلمان کا۔اس لئے قرآن کو صرف مسلمانوں کی کتاب مان کر نہیں بلکہ اللہ کی کتاب کے طور پر دیکھنا اور اپنانا چاہئے ۔ظاہر سی بات ہے خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا خدا ہے اور خدا کی چیز پر خدا کے تمام بندوں کا حق ہے۔اگر آپ اس نقطہ نظر سے قرآن کو ایک بار پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا یہ آپ ہی کی کتاب ہے جو آپ سے مخاطب ہے اور جس میں آپ کا ذکر ہے جو آپ کی ھدایت اور فلاح وخسران سے بحث کرتی ہے۔

ہم نے اوپر کے مباحث میں قرآن کی آفاقی دعوت کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میں اس حصہ میں قرآن کے حوالے سے کچھ چیزیں پیش کروں گا جس سے ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ سے مخاطب ہے اور آپ کی فلاح کی بات کرتا ہے۔

قرآن کی دعوت میں جبر نہیں ہے بلکہ قرآن کا انداز استفہامی (Argumentative) ہے۔ قرآن اپنی بات ترغیب ،ترہیب ،نصیحت دلائل ،شواہد ، امثال ،قصص اور انذار وتبشیر کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگر اللہ کو جبراً کسی کو کوئی بات منوانی ہوتی تو انسان کی سرشت ہی ایسی بناتا

کہ ایک شخص کو اس کے ماننے بغیر چارہ نہیں رہتا پھر نہ رسول بھیجنے کی ضرورت تھی نہ کتاب لیکن اللہ نے ایسا نہیں کیا اس کا مطلب ہے کہ کسی سے زور زبردستی تلوار کی دھار پر کوئی بات منوانی نہیں ہے۔قرآن صاف اعلان کرتا ہے کہ یہ ایک نصیحت ہے ۔جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔اور اپنے نبی سے کہتا ہے کہ آپ کسی کو ھدایت نہیں دے سکتے۔ھدایت دینا خدا کا کام ہے۔اس لئے اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو اس کے لئے اپنی جان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کا کام اس دین و دعوت کو اچھی طرح کھول کر پوری محنت اور جانفشانی کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دینا ہے تا کہ شہادت کا حق ادا ہو جائے اور کل جب خدا کی عدالت قائم ہو تو کوئی یہ نہ کہے کہ ہم تک یہ بات پہنچائی نہیں گئی۔اس لئے میں اس کو کیسے مانتا؟ رسول کے جانے کے بعد اب یہ ذمہ داری اس امت پر ہے جس نے اس دین کو اس شہادت کے نتیجے میں مانا ہے۔قرآن کہتا ہے رسول تم پر گواہ ہیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

قرآن کی دعوت کوئی نرالی اور عجوبی دعوت نہیں ہے بلکہ یہ دعوت ایک طرف تو اس کی فطرت سے میل کھاتی ہے دوسرے یہ وہ دعوت ہے جو ہر دور میں اور ہر قوم میں مختلف انبیاء اپنے اپنے وقت میں دیتے رہے ہیں۔قرآن کا الزام ہے کہ لوگوں نے اس دعوت کے بڑے حصے کو یا تو بھلا دیا یا چھوڑ دیا۔دوسرا اس کی صورت اتنی بدل دی کہ اس کی اصلیت ضائع ہوگئی۔پھر بھی اس دعوت کے کچھ باقیات موجود ہیں جو اس کی اصل کا پتہ دیتے ہیں اس سے قرآنی تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے۔چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔قرآن اپنی بات نفی سے نہیں بلکہ تصدیق سے شروع کرتا ہے اور مسلمات کی بنیاد پر وسیع تر اتحاد کی دعوت دیتا ہے ۔قرآن کا اعزاز دو ہے ۔پہلا اس نے مقامی اور وقتی حقیقتوں کو جوڑ کر آفاقی بنا دیا ہے دوسرا اس کو مکمل اور دوامی بنا دیا۔قرآن کی رو سے انسان روحانی اور وجدانی اعتبار سے ارتقا کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں دین مکمل ہو جاتا ہے ۔یہی وجہ کہ یہاں آ کر کتاب اور رسالت کا سلسلہ پورا ہو جاتا ہے۔چنانچہ قرآن خدا کی آخری کتاب اور حضرت محمد رسول اللہؐ خدا کے آخری رسول ہیں۔اب نہ کوئی آسمانی کتاب آئے گی اور نہ کوئی خدا کا رسول آئے گا۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سائنس کی ارتقا رک جائے گی۔ٹکنولوجی کی ترقی تھم جائے گی، گردش لیل ونہار ختم ہو جائیں گے بلکہ

انسان زمین، سمندر، پہاڑ، چاند، مریخ، سورج اور اس سے آگے بھی اپنا سفر جاری رکھے گا اور قرآن اس سفر کو مہمیز دینے کے لئے ہی یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ زمین و آسمان، چاند سورج اور ستارے سب تمہارے لئے مسخر کر دئے گئے ہیں۔ تم اس کائنات کے خلیفہ ہو، اس دھرتی پر اپنے علم اور اختیار سے کام لے کر سب کو اپنے قبضہ میں کرو، سب سے فائدہ اٹھاؤ۔ قرآن نے مخلوق پرستی اور شرک کی جڑ کاٹ دی ہے اور بتایا کہ اس کائنات کا بس ایک خدا ہے باقی سب مخلوق ہیں اور ان مخلوقات میں کوئی بھی معبود و مسجود نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام مخلوقات میں چاہے وہ سورج ہو چاند ہو تارے ہوں، دریا پہاڑ اور سمندر ہوں، جانور اور پیڑ پودے ہوں سب انسان کے تابع ہیں۔ کوئی انسان سے اوپر کیا اس کے برابر بھی نہیں ہے۔ انسان ان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اس لئے ان میں سے کسی کی عبادت کرنا پوجا کرنا نذر چڑھانا انسان کے مقام و مرتبہ سے فروتر ہے اور خدا کی شان میں گستاخی ہے۔ ایک بغاوت ہے۔ ایک ظلم اور گناہ ہے۔ دنیا میں جتنی بھی گمرہی پھیلی ہے اس کی صرف ایک یہی وجہ کہ انسان غلط علم و تربیت کے نتیجے میں شرک میں مبتلا ہو گیا۔ لہذا شرک سے توحید کی طرف واپسی ہی صحیح معنوں میں جہالت سے علم کی طرف اور اندھیر سے روشنی کی طرف واپسی ہے۔ قرآن قندیل ہدایت لے کر صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کوئی قندیل جبر نہیں کرتی صرف رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر کوئی روشنی میں چلنے سے انکار کر دے اور اندھیرے میں ہی چلنا چاہئے تو اسے روکا ٹوکا، سمجھایا اور بتایا تو جا سکتا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر زبردستی اس راستے پر کھینچ کر نہیں لایا جا سکتا اور نہ اسے اس راستہ پر چلنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ جب خدا نے اسے خود فکر و عمل کی آزادی دی ہے تو کسی کو داروغہ ہدایت بننے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ہے قرآن کا وہ اسلوب دعوت جو اس نے اختیار کیا ہے اور رہتی دنیا تک اسی طریق دعوت کے تحت لوگوں کو اس راستے کی طرف بلانے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآن کا موضوع انسان ہے۔ اس کا مقصد انسان کی ھدایت اور فلاح ہے۔ لہذا وہ انسان کو فرداً فرداً اور قوموں اور گروہوں کی بحیثیت قوم خطاب کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے انسان اصل میں ایک ماں باپ کی اولاد ہے لیکن لوگوں نے رنگ، زبان، نسل علاقے اور عقیدے کی بنیاد پر الگ الگ قوم، گروہ اور برادریاں بنالی ہیں۔ جس میں کوئی گروہ اپنے علم، دولت، اقتدار اور کچھ دوسری

وجوہات سے خود کو برتر اور دوسرے کو کم تر سمجھتا ہے۔قرآن نے اس وہم کو توڑا ہے اور تمام انسانوں کو بتایا ہے کہ تم سب کی اصل ایک ہے اس لئے تم سب برابر ہو،کوئی کسی سے بڑا ہے اور نہ چھوٹا ہے بلکہ سب حقوق میں،اختیار میں برابر ہیں آدم کے گھرانے کا ہر فرد خواہ وہ کسی قوم اور برادری سے تعلقات رکھتا ہے شرف وتکریم میں برابر ہے۔تاہم قرآن نے مادہ کے بجائے اخلاق کو فوقیت دی ہے اور بتایا ہے کہ دنیا میں تو سب برابر ہیں اور برابر سمجھے جائیں گے مگر اللہ کے نزدیک جو صاحب تقویٰ ہیں وہی صاحب اکرام ہیں۔

قرآن نے لسانی،لونی اور نسلی اعتبار سے جو لوگ خود کو الگ قوم اور برادری کے طور پر پیش کرتے ہیں اور برتر سمجھتے ہیں یہ کہتے ہوئے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ یہ محض پہچان کے لئے ہیں۔اس بنیاد پر کسی کو کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔مگر قرآن عقیدے کی بنیاد پر لوگوں کو الگ الگ گروہ اور قوم مان کر خطاب کرتا ہے۔جیسے قرآن نے کثرت کے ساتھ بنی اسرائیل جو عرف عام میں یہودی کہے جاتے ہیں ان سے خطاب کیا ہے۔اسی طرح اس نے عیسائیوں اور دیگر اہل کتاب کو بھی مخاطب کیا ہے۔ساتھ ہی کفار،مشرکین،صابی،مجوسی اور دیگر اقوام کو بھی مخاطب کیا ہے۔

قرآن صرف اقوام اور افراد سے ہی بحث نہیں کرتا بلکہ اس کی دعوت کے نتیجے میں کچھ ایسے گروہ بھی پیدا ہوئے ہیں۔جیسے منافقین،مذبذبین،کمزور ایمان والے،موقع پرست،جاہلین، غافلین،اور اپنی نفسوں پر ظلم کرنے والے ان سب سے بھی خطاب کرتا ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن نے کسی فرد اور گروہ کو نہیں چھوڑا ہے۔لہٰذا ہر شخص اور ہر قوم قرآن کے آئینے میں اپنی تصوویر دیکھ سکتے ہیں۔اس لئے قرآن انسانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر وہ خود کو قرآن میں تلاش کرنا چاہے تو اسے قدم قدم پر اپنی شناخت اور پہچان ملے گی۔اس عمومی بحث کے پسِ منظر میں ہم قرآن میں ہندوستانی اقوام کو دیکھنے اور جاننے کی کوشش کریں گے۔

اس وقت عقائد کی بنیاد پر ہندوستان میں ہندو مسلمان،سکھ،بودھ،جین،عیسائی،پارسی، یہودی،اور آدی باسی اقوام پائی جاتی ہیں۔جن کو دو بڑے خانوں یعنی مشرک اور موحد میں بانٹا جاسکتا ہے۔مسلمانوں کے علاوہ باقی جتنی قومیں ہیں باوجود اس کے کہ توحید کی قائل ہیں مگر انہوں نے شرک کو بطور دین قبول کرلیا ہے اور ایک خدا کے علاوہ مظاہر قدرت کی تمام چیزوں کی

پرستش کرتی ہیں۔اس لئے ہندوستانی اقوام کی غالب اکثریت جس میں ہندوسکھ، بودھ،جین ، پارسی اورآدی باسی آتے ہیں خالص مشرکانہ عقیدہ رکھتے ہیں اوراس اعتبار سے یہ مشرک اقوام ہیں ۔ قرآن نے مشرکین اورکفار کے سلسلے میں جوبھی خطاب فرمایاہے اس کاپوراطلاق ان اقوام پرہوتاہے ۔عیسائی اور یہودی شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں تاہم ان کے یہاں آسمانی ھدایات کے باقیات کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔قرآن ان کے عقیدے کی تصدیق نہیں کرتا تاہم ان کواہل کتاب کہہ کرخطاب کرتاہے اوراپنی باقی تعلیمات کی بنیاد پردین حنیف کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتاہے۔اس اعتبار سے قرآن کا خطاب اب ساری دنیااور دنیا کی ساری قوموں سے ہے ۔چونکہ یہ اقوام کسی نہ کسی جغرافیائی خطے میں رہتی ہیں جس کی وجہ سے وہ علاقہ اورملک مخصوص ناموں سے موسوم ہوتاہےاس لئے اس کا خطاب ان قوموں سے بھی ہے۔

کسی ملک کی جغرافیائی سرحدکوئی مستقل چیزنہیں ہوتی بلکہ وقت اورحالات کے ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔

لہذا اس کی تاریخی اور سیاسی جو اہمیت ہوعقیدے کی طرح اس کوکوئی تقدس حاصل نہیں ہے۔۱۵راگست ۱۹۴۷ سے قبل برصغیر کا جوجغرافیہ تھا وہ اس کے بعد بالکل بدل گیا۱۹۷۱ تک اس خطہ میں صرف دوآزادخودمختار ممالک تھے۔۱۹۷۱ کے بعد تین ہوگئے ۔تاہم نسل ، زبان ، رنگ اورعقیدہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے دنیاکے اقوام کی دائمی ہیئت بنتی ہے اورلوگ بالعموم خودکوانہی چیزوں سے منسوب کرتے ہیں۔مثلاً جرمن ، ایرانی اور ہندوستانی خودکوآریائی نسل کے مانتے ہیں۔اسی طرح عربی ،سامی ، یونانی ،منگول ،اینگلوسیکسن اورافریقی نسل کےلوگ الگ الگ ملکوں میں آباد ہیں۔مگرانہیں اپنی اسی پہچان سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔مگر رنگ ، زبان ،نسل ، عقیدہ ،تہذیب وثقافت جوبھی ہو، یہ تمام گروہ انسان ہیں۔آدم کے کنبے کےافراد ہیں اوراس اعتبار سےقرآن کےمخاطب ہیں۔قرآن پکارپکارکرکہتاہے۔

’’اے انسانوں !بندگی کرواپنے رب کی جوتمہارااورتم سے پہلے جولوگ ہوگزرے ہیں ان سب کا خالق ہے،تمہاری بچنے کی توقع اسی صورت سے ہوسکتی ہے۔وہی توہےجس نے تمہارے لئے زمین کافرش بچھایا،آسمان کی چھت بنائی ،اوپر سے

پانی برسایااوراس کے ذریعہ سے ہرطرح کی پیداوارنکال کرتمہارے لئے رزق بہم پہنچایا،پس جب تم جانتے ہوتو دوسروں کواللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ۔'' (۲:۲۱-۲۲)

یہاں قرآن یا ایھا الناس کہہ کرخطاب کرتا ہے جس کو اگر انسانی آبادیوں میں تقسیم کردیا جائے تو اس کا مطلب ہو گا اے ہندوؤں! اے مسلمانوں! اے سکھو! اے عیسائیوں! اے یہودیوں! اے مجوسیوں! اے آدی باسیوں! اے برہمنوں! اے پچھڑوں! اے اگرو! اے کمزورو! اے عورتو! اے مردو! اے بوڑھو! اے مسافرو! اے مقامیوں! یعنی انسان کی جتنی قسمیں، شکلیں، روپ، رنگ، گروہ، برادریاں، زبانیں، نسلیں یا اس کی جو بھی ہیئت ہیں اس سب پر اے انسانوں! کا اطلاق ہو رہا ہے اور یہ دعوت ان سب سے خطاب کرتی ہے، بحث کرتی ہے، دعوت دیتی ہے اور ان سب کو ان کی ھدایت، نجات اور فلاح کی طرف بلاتی ہے۔

قرآن گرچہ تمام انسان خواہ وہ کسی قوم، ملک اور زمانے میں رہتے ہوں کے لئے کتاب ہدائت ہے، مگر کتاب ہدایت ہونا ایک چیز ہے اور کتاب ہدایت ماننا دوسری چیز ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر آدمی قرآن کو کتاب ہدایت تسلیم کر کے اس پر ایمان لائے اور اس کی پیروی اختیار کرے۔ قران نے بالکل ابتداء میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ کتاب صرف ان لوگوں کو ہدایت دے گی جن کے اندر تقویٰ کی صفت ہوگی اور جو اس جوہر سے خالی ہوں گے ان کے لئے یہ کتاب ہمیشہ بند کتاب رہے گی۔ وہ کان رکھ کر بھی کچھ نہیں سنیں گے۔ آنکھ رکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ پائیں گے اور ذہن و دل رکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھ پائیں گے۔ بلکہ وہ اس میں ٹیڑھ ہی نکالنے کی کوشش کریں گے اور اپنی گمراہی میں دور تک نکلتے چلے جائیں گے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے او دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے اور اپنی اس گمرہی پر خوش بھی ہوں گے۔ بلکہ حق کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں گے اور اس میں ملی کامیابی پر پھولے نہیں سمائیں گے۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ حق کو نیچا دکھانے کے لئے ہوگی۔ قرآن صاحب ایمان کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا والوں کی جلت پھرت سے تم مایوس اور دل شکستہ نہیں ہو۔ تمہارا کام حق پہنچا دینا ہے۔ اگر تم نے اپنا فریضہ سہی ڈھنگ سے انجام دیا تو تمہارے لئے کسی غم اور رنج کا موقع نہیں ہے تم ناکام ہو کر بھی کامیاب ہو کیونکہ بالآخر سارے معاملات کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے وہاں تمہیں تمہارے ایمان اور کاوش کا پورا پورا بدلہ اللہ کی

رضا اور اس کے انعام یعنی جنت کی شکل میں دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم، ہر ملک ۔ ہر زمانے اور ہر نسل وعہد میں کچھ لوگوں کے اندر تقوی کی صفت رکھی ہے جو خود بھی حق کے متلاشی ہیں اور اپنی فطرت کی پکار پر دعوت حق کو قبول کرنے کو تیار ہیں ۔صرف ان تک پہنچنا ہے ۔ ہندوستان کے تناظر میں ہمیں اس وقت یہی کرنا ہے۔ اس ملک میں قرآن کی دعوت ٹھہری ہوئی ہے ۔ بالعموم لوگ مسلمانوں میں ہی درس وتعلیم کو محدود رکھتے ہیں ۔ غیر مسلم آبادیوں میں جا کر ان تک خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے ۔اور اپنی کوتاہیوں پر قومیت کا عصبیت کا ۔تعصب کا لبادہ اڑھا دیتے ہیں ۔ لوگ یہ مان کر بیٹھے ہیں کہ ہندوستان میں اب کوئی اور اس دین کی طرف نہیں آئے گا ۔کبھی کبھی قبول اسلام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کش مکش سے بھی ڈرتے ہیں ۔ان کو لگتا ہے کہ مسلمانوں پر ایسے ہی کم آفت ہے کہ ایک اور آفت کو دعوت دی جائے ۔شاید اس وجہ سے ہمارے علماء کرام نے بھی اس کام میں دلچسپی نہیں لی ہے ۔

انہیں یہ فکر بھی ستائے جا رہا ہے کہ خود مسلمانوں کا ماحول اور معاشرہ اتنا پراگندہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کون ایک پس ماندہ قوم کا حصہ بننا چاہے گا اور خود ہتک وتحقیر کے لئے آمادہ کرے گا ۔مسلمانوں میں دین کا کام کرنے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنے اور ان کو معاشی سیاسی اور دیگر معاملوں میں اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے سے کس نے روکا ہے؟ اس کام کو آپ جتنی تندہی کے ساتھ کر سکتے ہیں کریں اور قوم کو اس کے منہاج پر واپس لانے کے لئے اپنی صفوں میں اتحاد فکر وعمل پیدا کر کے آگے بڑھیں ۔ایسا کرنے میں سوائے اپنی ذہنی تنگی کے اور کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

رہا بیک لیش کا خوف ۔ یہ تو آج بھی جاری ہے اور کسی نہ کسی بہانے جاری رہے گی ۔کبھی تہذیبوں کی کش مکش کے نام پر تو کبھی دہشت گردی کے نام پر ۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی رہے گی ۔ ہم کسی جارحیت اور تشدد کی بات نہیں کر رہے ہیں ۔ ہم تو صرف لوگوں کو قرآن کی دعوت پہنچانے کی بات کر رہے ہیں ۔ ہمیں نہ کسی کا دین خریدنا ہے نہ لالچ دینا ہے اور نہ جبر سے کام لینا ہے ۔جھوٹ فریب، دھوکہ، دھونس دھاندھلی ان سے بچتے ہوئے ایک نصیحت تمام لوگوں تک پہنچانی ہے جس کا جی چاہے قبول کرے ۔جس کا جی چاہے رد کرے ۔ ہمارا کام صرف پہنچا دینا ہے اب اگر ہم یہ بھی نہیں کر سکے تو یہ ایک ظلم ہوگا جس کی گرفت سے ہم نہیں بچ سکتے ہیں ۔

قرآن نے واضح کیا ہے کہ ایک گروہ کبھی ایمان نہیں لائے گا وہیں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک گروہ ضرور ایمان لائے گا۔ جو لوگ ایمان نہیں لائیں گے اس کو بھی اس نے دو بڑے گروہوں میں بانٹا ہے۔ ایک وہ گروہ ہوگا جو لڑنے مرنے کو تیار ہوگا اور ہر ممکن طریقے سے اپنی دشمنی نبھائے گا۔ یہ متحارب گروہ ہے۔ قرآن نے ان کے سلسلے میں اولاً تو صبر وضبط سے کام لینے کی ہدایت دی ہے۔ پھر حکمت اور ذہانت کے ساتھ ان کے مقاصد کو ناکام کرنے کا طریقہ بتایا ہے اور اس وقت تک ہاتھ روکے رکھنے کی ہدایت دی ہے جب تک اتنی قوت حاصل نہ ہو جائے کہ ان سے مقابلہ کیا جا سکے اور اگر انہوں نے جنگ مسلط ہی کر دی ہے تو پھر پیٹھ دکھانے سے منع کیا ہے اور اپنی طاقت بھر ان سے بھرپور مقابلے کی تلقین کی ہے تاکہ فتنہ مٹ جائے اور حق غالب آجائے۔ دنیا میں ایسی کوئی جنگ نہیں ہوتی جس میں ہمیشہ حق کی جیت ہوتی ہے۔ شہادت اور شکست کا منہ بھی دیکھنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن بہرصورت اپنے مقصد سے اعراض نہیں برتا جا سکتا ہے زندہ عقیدے کے حاملین ہمیشہ یہی طریقہ اپناتے رہے ہیں اور یہی قرآن کی سنت ہے۔

دوسرا گروہ ہوگا جو اس دعوت کو مانے گا بھی نہیں مگر لڑے گا بھی نہیں۔ اس کو قرآن نے غیر متحارب گروہ کہا ہے۔ ان سے کسی قسم کا تعرض کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کے لئے ان کا دین ہے اور تمہارے لئے تمہارا دین۔ ان کے دین سے نہ تم کوئی چھیڑ چھاڑ کرو اور نہ تمہارے دین سے وہ چھیڑ چھاڑ کریں اس طرح بقائے باہم کے اصول پر دونوں اپنی اپنی جگہ پر امن طریقے سے رہیں گے۔

ایک مشترک سماج میں جہاں اہل ایمان اور اہل کفر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی روش پر گامزن رہا جائے۔ جھوٹ۔ بغی اور فتنہ فساد سے بچا جائے۔ برائی کا جواب بھلائی سے دیا جائے۔ ظلم اور زیادتی سے ہر حال میں پرہیز کیا جائے۔ ہر حال میں انصاف کی روش پر قائم رہا جائے۔ فریق معاملہ اپنے ہوں یا غیر کسی حال میں اور کسی معاملہ میں انصاف کرنے سے باز نہ رہا جائے۔ قرآن عدل اور احسان کی تلقین کرتا ہے اور تمام اقرباء اور کمزور طبقات کے ساتھ فراخ دلی کا معاملہ کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ کسی قوم کی دشمنی اس کے ساتھ انصاف اور احسان کرنے سے نہ روکے۔ کبر اور ریا سے بچا جائے۔ بھوکا، ننگا، بیمار، ضرورت مند اور محتاج خواہ

کوئی ہو اس کی مدد اور خبر گیری بغیر فرق اور امتیاز کے کیا جائے۔ یہ وہ اخلاق حسنہ ہیں جس کو اگر صاحب ایمان گروہ اپنا طرز عمل اور اپنا اجتماعی کلچر بنا لے تو جو لوگ آج کٹر دشمن بنے ہوئے ہیں وہ مخلص دوست بن جائیں گے۔ مشترک معاشرہ میں اہل ایمان کو بالاستیعاب ان اخلاق حسنہ سے متصف کر کے لوگوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کرنا چاہئے تاکہ جن کے دل نرم ہیں اللہ ان کا رخ ان کی طرف پھیر دے۔

تیسرا گروہ منافقین کا ہوگا۔ یہ باہر کے نہیں اندر کے دشمن ہیں۔ لہٰذا خود ملت کو ان سے نپٹنے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ چوتھا گروہ مذبذبین اور کمزور ایمان والوں کا ہوگا۔ ان کی صحیح تعلیم، صحیح تربیت مضبوط اجتماعی قوت،، کفالت، اعانت، دل سوزی کے ساتھ اصلاح تبشیر اور تنذیر کے ذریعہ راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ سرحد پر کھڑے ہوں گے اور حالات کے مطابق کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر کی پالیسی پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ اگر وہ منافق نہیں ہیں بلکہ کسی ذاتی کمزوری اور مفاد کی خاطر یہ طرز عمل اختیار کئے ہوئے یا اپنی کمزوری طبع کی وجہ سے یا ایک ایسی جگہ رہنے کی وجہ سے جہاں ان کو کھل کر اسلام پر عمل کرنے میں خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ ہماری اعانت و ہمدردی کے مستحق ہیں بصورت دیگران سے سختی سے پیش آیا جائے گا تا انکہ اگر وہ کفر میں جانا چاہتے ہیں تو وہاں چلے جائیں۔ منافقین، مذبذبین اور ڈھل مل لوگوں کے ذریعہ اپنی عددی قوت میں اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن جس بات کا قائل ہے کہ کسی بھی مومن و مسلم کو دائرہ اسلام سے خارج نہ کیا جائے بلکہ حالت اضطرار میں اس کے منہ سے اگر کوئی کلمہ کفر نکل بھی گیا ہے اور وہ دل سے اسلام کی طرف واپسی کا جذبہ رکھتا ہے یا اپنی اس حالت سے توبہ کرتا ہے تو اس سے اس کا ایمان خارج نہیں ہوتا بلکہ مصلحتاً اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو اس کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے۔ ہاں جو لوگ تھوڑی سی قیمت کے عوض اپنے دین کو بیچنے کے لئے تیار رہتے ہیں یا تھوڑے فائدے کے بدلے تمام مسلمات سے دست بردار ہونے کو تیار رہتے ہیں ایسے لوگ گمراہی میں بہت دور نکل جانے والے ہیں اور ان کا فیصلہ خدا کے حضور ہوگا۔ وہ اپنی چرب زبانی سے جتنا کام لیں ان کا کھوٹ واضح ہو کر رہے گی۔

قرآن جس طرح مردوں کے لئے کتاب ھدایت ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی

کتاب ھدایت ہے۔لہذ ا خواتین بھی قرآن کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح مرد مخاطب ہیں۔قرآن کے مطابق عورت مرد کے مقابلے کوئی فروتر مخلوق نہیں ہے بلکہ شرف خلافت میں برابر کی شریک ہے اور تکریم بنی آدم میں برابر کی حقدار ہے جو فرائض و واجبات مردوں پر عائد کی گئی ہیں وہی فرائض و واجبات عورتوں پر بھی عائد ہوتی ہیں۔جو مردوں کے لئے حرام اور منکرات ہیں وہ عورتوں کے لئے بھی حرام اور منکرات ہیں۔اللہ کا وعدہ اور انعام جس طرح مردوں کے لئے عام ہے اسی طرح عورتوں کے لئے عام ہے۔کچھ معاملوں میں اگر مردوں کو فضیلت دی گئی ہے تو کچھ معاملوں میں عورتوں کو فضیلت دی گئی ہے۔دونوں کے حقوق اور اختیارات متعین اور معلوم ہیں۔ایک خاندان اور معاشرے میں دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔مرد کے بغیر عورت ادھوری ہے اسی طرح عورت کے بغیر مرد ادھورا ہے۔خاندانی نظام میں مرد قوام ہے۔کفالت کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔جسمانی طور پر بالعموم مرد،عورت کے مقابلے قوی ہوتا ہے۔علم وذہانت میں دونوں برابر بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہتر بھی۔اسلام میں شادی ایک مقدس معاہدہ ہے۔شادی دونوں کی آزادانہ مرضی،اجازت اور پسند سے ہوگی۔معاملہ بگڑنے اور نباہ نہ ہونے کی صورت میں طلاق اور خلع کے ذریعہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کی اجازت ہے۔اس کے لئے ثالثی اور طہر کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی ناخوش گوار صورت حال سے بچا جا سکتا ہے۔بچوں کی تربیت ماں باپ کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔خود کو اور اپنے بچوں کو جہنم کے آگ سے بچانا تربیت کا پہلا نکتہ ہونا چاہئے۔

ماں باپ کے حقوق تمام دوسرے انسانوں کے مقابلے سب سے زیادہ ہیں۔ماں باپ کے بعد جو لوگ رحم کے رشتے میں جتنا قریب ہیں ان کا حق اتنا زیادہ ہے۔مال میں صرف صاحب مال کا ہی حق نہیں ہے بلکہ رشتہ دار اور دیگر ابنائے نوع کے ساتھ ساتھ تمام محروم محتاج کا متعین حق ہے۔ جو چیزیں حلال ہیں وہ بھی واضح ہیں اور جو حرام ہیں وہ بھی واضح ہیں۔لہذ ا چاہے خورد ونوش ہو یا حصول مال و دولت اس اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے تمام کمزور افراد اور طبقات کی خبر گیری بحیثیت فرد اور ملت واجب ہے۔انسان اور مسلمان ہونے کا بنیادی تقاضہ ہے۔

ایک مختصر سے مضمون میں قرآن کے تمام عنوانات اور تعلیمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا

ہے۔ یہاں صرف ایک جھلک پیش کی گئی ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کا پیغام کتنا جامع اور جانفزا ہے اگر واقعتاً ان تعلیمات پر چلتا پھرتا فرد اور معاشرہ تشکیل دیا جائے تو ملک وملت کی بگڑی سنواری جاسکتی ہے اور جس سے قبول حق کی راہیں بھی کھل سکتی ہیں۔

ہندوستان کے تناظر میں عقائد اور معاشرت کی سطح پر چند حقائق توجہ طلب ہیں جس جانب ہمیں قرآن کے مطابق حکمت ، اچھی نصیحت اور جدال احسن کے ذریعہ قرآن کی دعوت پیش کرنی ہے۔

(۱) شرک بنام توحید

ہندوستان میں اس وقت جتنے مذاہب ہیں ان میں بہواشورداد یعنی شرک اوراصنام پرستی عام ہے۔ہم جانتے ہیں کہ خداایک ہے۔مگر جولوگ مختلف چیزوں کوعقیدت کے ساتھ خدامان کر پوجتے ہیں ان کوتوحید کی دعوت دینی ہے اس سلسلہ میں قرآن نے ایک بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ ان کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہا جائے بلکہ اصولی طور پر توحید سے واقف کرایا جائے۔ ہندوستانی ذہن ومزاج کا طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان کے دلائل بدلتے رہتے ہیں اور قائل ہونے کے بعد بھی وہ جلدی اپنے طرز عمل کی اصلاح کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں آریہ سماج نے شرک اوراصنام پرستی کے خلاف زبردست تحریک چلائی ، وید، پران ، گیتا مہابھارت اوررامائن میں ایسے دسیوں بیانات مل جائیں گے جن سے توحید کا اثبات ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ شرک پر پوری شدت سے قائم ہیں اور یہ ہندوستانی قوم کی سب سے ابھری ہوئی پہچان ہے۔اس معاملہ میں ہندو، بودھ، جین، سکھ یہاں تک کہ عیسائی اور پارسی بھی کسی نہ کسی بت کی پوجا کرتے ہیں۔لہذا عملی طور پر توحید کا قائل بنانا مشکل کام ہے۔

(۲) آواگون بنام آخرت

ہندوؤں کے یہاں لوک پرلوک ،نرک اورسورگ کا تصور پایا جاتا ہے لیکن وہ آخرت کے تصور سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔وہاں آدمی مرنے کے بعد پھر سے مختلف ہیئت اور حیثیت میں جنم لیتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کو موکچھ پراپت

نہیں ہوجاتا۔موکچھ ملنے کے بعدآتما پر ماتما میں ویلین ہوجاتی ہےاوریہی نجات ہے۔

جبکہ اسلام کاتصورآخرت یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہےتو اب قیامت کے بعد ہی اٹھایا جائے گا۔ پھرحشر برپاہوگا اس کے تمام اعمال کاحساب کتاب ہوگا اور ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہوگا کہ یہ فرد خدا کی رضا اوراس کی جنت کا مستحق ہے یانہیں یاوہ خدا کےغضب اورجہنم کا سزاوار ہے۔عقیدہ آخرت صالح اعمال کی کنجی ہے۔عقیدآخرت جتنا مضبوط اورزندہ ہوگا آدمی کے اندراتنا ہی تقویٰ،اخلاق اوراخلاص کے جوہر پیدا ہوں گے۔عقیدہ آخرت کمزور ہےتو اس کوظالم اورسفاک بننے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی ہے۔انسانی تاریخ اوراسلامی تاریخ اس حقیقت پردلالت کرتی ہے۔لہذ الوگوں کوعقلی اورمنطقی طریقوں کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ عقیدہ آخرت کس طرح کفارہ اورتناسخ کےعقیدے سے بہتر ہےاوراس عقیدےکو مان لینے کے بعدفرداورمعاشرے پرکیسےخوشگواراثرات پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) اوتارواد بنام رسالت

ہندو مصلحین اوردھرم گرواس بات پرفخر کرتے ہیں کہ ہندودھرم کسی ایک کتاب اورکسی ایک پیغمبر پریقین نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس دھرم میں ہزاروں دیوی دیوتا اور ہزاروں رشی منی ہیں جس میں کسی ایک کو ماننا ضروری نہیں ہے ۔ دھرم دھارن کرنے والی چیز ہے۔اورہم کچھ بھی دھارن کرسکتے ہیں وہی ہمارادھرم ہوگا۔چنانچہ آستک اورناستک سب کے لئے گنجائش موجود ہے۔لیکن یہ اپنے آپ میں ایک مجہول بات ہے۔خدانے زمین اورآسمان اوروہ تمام چیزیں پیدا کیں ہیں جس سےاس دھرتی پرانسان کوحیات وبقامیں مدد مل سکے۔ یہ بات بعیدازقیاس ہے کہ جودنیااس حکمت اورمضبوط نظم کے ساتھ تشکیل دی گئی ہے اس میں انسان کی ھدایت کاسامان نہ کیاجاتا ۔اب یہ سامان تین طرح سے ہوسکتا تھا۔ایک انسان کی فطرت ہی ایسی بنادی جاتی کےاس میں ردوقبول کی اجازت نہیں ہوتی ۔اس کوجیسااورجس کام کے لئے بنایا گیاہےوہ ویساہی ہوتا جیسےسورج،چاند،ہوا، پانی، دھرتی اورآکاش ہے۔پھرانسان میں اورمظاہر کائنات میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا کہ خداماں کے پیٹ سےجنم لیتایا اوترت اور پرکٹ ہوتااورسب کواپنی بھکتی اوراُپاسنا

کی ھدایت دیتا۔ یہ بات خدا کی حکمت اور قدرت سے بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس تصور میں وہ جو لامحدود ہے اس کو محدود ہونا ہوتا۔ پھر وہ فانی وقتی اور مقامی ہوگا۔ جو خدا کے صفات سے بعید تر ہیں۔شاید انہی باتوں کا ادراک کرتے ہوئے گرو ونانک دیو نے کہا تھا'' کہ اس کی زبان سڑ جائے جو کہتا ہے کہ خدا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔'' تیسرا طریقہ یہ تھا کہ خدا انسانوں میں سے کچھ لوگوں کو چنتا، ان کو علم وھدایت دیتا اور ان کے ذریعہ انسانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کا انتظام کرتا۔ اگر ان تینوں متبادل پر غور کیا جائے تو رسالت کا تصور زیادہ قرین عقل اور منطقی لگتا ہے۔

لہذا ہندوستانی عوام کو توحید رسالت اور آخرت کے تصور سے واقف کرانے کی ضرورت ہے تاکہ حق تک ان کی رسائی ہو سکے۔

ورن واد بنام وحدت ومساوات

اگر آپ ہندوستان کی مقدس مذہبی کتابوں کو دیکھیں تو اس میں طبقاتی سماج کا تصور پایا جاتا ہے جس میں ایک طبقہ پیدائشی طور پر پاک ،اعلیٰ اور اشرف ہے اور دوسرا طبقہ پیدائشی طور پر ذلیل ناپاک اور شودر ہے۔اس لحاظ سے چونکہ اس سماج میں مساوات کا تصور نہیں پایا جاتا ہے اس لئے انصاف اور بھائی چارہ کا تصور بھی نہیں ہے قرآن اس تصور کی تردید کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ تمام انسان چاہے وہ جس رنگ اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہیں کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ آدمی چاہے چینی، جاپانی، امریکی ، افریقی یا ہندوستانی ہوں سب آدم کے گھرانے کے فرد ہیں اور حقوق وواجبات میں برابر ہیں۔ یہ تصور بھارت میں رائج ورن آشرم کی نفی کرتا ہے جس کے تحت تمام انسانوں کو چار خانوں میں بانٹا گیا ہے جس میں برہمن سب سے اوپر ہے کیونکہ وہ برہما کے سر سے پیدا ہوئے ہیں دوسرے درجہ میں چھتری یہ ہیں جو برہما کے دست و بازو اور سینہ سے پیدا ہوئے ہیں، تیسرے درجہ میں وشیہ ہیں جو برہما کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں اور چوتھے درجے میں شودر ہیں جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ۔ یہ ہندو سماج کا سب سے نچلا طبقہ ہے جو اچھوت مانا جاتا ہے اور یہ اوپر کے تمام طبقات کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

قرآن اس طبقاتی تقسیم کو غلط اور غیر حقیقی مانتا ہے۔قرآن کی رو سے تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں جن کے درمیان نسل، زبان، رنگ، جنس اور مقام پیدائش کے اعتبار سے کوئی برتری نہیں ہے۔اس طرح سماج میں رائج طبقاتی تصور کو مسمار کر کے وحدت آدم کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ چاہے دنیا نے قرآن کی دعوت کو براہ راست تسلیم نہیں کیا ہو لیکن قرآن نے عالمی تہذیب ومعاشرت پر جو اثرات ڈالے ہیں اور سیاست مدنیہ کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ قرآن کے وحدت آدم کے تصور سے واضح ہے۔یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہو یا فرانس کا انقلاب، روس کی بول شیوک کرانتی ہو یا دنیا بھر کی آزادی کی تحریکات۔اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہو یا دستور اصلاحات کی کوششیں ہمیں سب جگہ وحدت آدم اور انسانی مساوات کا تصور ملتا ہے جو واضح طور پر قرآن کی تعلیمات کا نتیجہ ہیں کیونکہ اسلام سے پہلے دنیا میں کبھی کسی مذہبی کتاب نے اس تصور کو اس انداز سے نہ واضح کیا تھا اور نہ اس کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔آج کی دنیا میں وحدت آدم کا تصور ایک ایسا مسلمہ اصول ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا ہے۔نتیجہ ہے کہ نہ صرف جدید مصلحین مدنیہ بلکہ تمام روایتی مذاہب کے لوگ جو کل تک اپنی طبقاتی شناخت پر ناز کرتے تھے اور اپنی برتری ظاہر کرنے کا اہتمام کرتے تھے آج ان کی وحدت و مساوات کے قائل نظر آتے ہیں اور اپنی مذہبی کتابوں کی جدید تشریح وتفسیر کے ذریعہ وحدت آدم کے حق میں ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ایسے دلائل اور شواہد لا رہے ہیں جس سے وہ بتا سکیں کہ یہ نظریہ ان کے یہاں بھی موجود ہے۔بہرحال قران نے وحدت آدم کا صور اس زور سے پھونکا ہے کہ طبقاتی سماج میں برتری کے صنم خانے کے تمام بت اپنے منہ کے بل گرے پڑے نظر آرہے ہیں اور زبان حال سے انسانی وحدت ومساوات کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔آزادی کے بعد ہندوستان کا دستور اس آئیڈیل کا ایسا دستاویز ہے جہاں آپ کو انسانی مساوات اور انسانی حقوق کے باب میں قرآنی تعلیمات کی بازگشت سنائی دے گی۔

بھارت کی آزادی کے بعد بھارت کا جو دستور بنا اس نے انصاف، مساوات، بھائی چارہ، بنیادی انسانی حقوق اور قانون کو جدید ریاست کی بنیاد قرار دیا اور جمہوری عمل کے ذریعہ ان حقوق کی حصولیابی اور استحکام کی کوشش شروع کی، تاہم سیاست مدنیہ سے الگ جب سماج کے چلن پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو تمام تر جاہلی عصبیتیں پورے شد ومد کے ساتھ قائم ہیں جس کی وجہ سے کمزور طبقات کے

استیصال اوراستحصال کاعمل ہنوز جاری ہے۔اسلام نے ایک طرف تمام انسانوں کوخلافت ارضی کامشترکہ حقدار بنایاہے وہیں اس نے تکریم انسانیت کی تعلیم دی ہےاورتمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولادقرار دے کرتمام نسلی،لونی،لسانی اور مادی برتری کےعلی الرغم انسانی مساوات اوراخوت کاغلغلہ اتنے زور سے بلند کیا ہے کہ نسلی اورلونی تفاخر کے سارے بت منہ کے بل دھڑام سے گرکو چو چور ہوجاتے ہیں۔قرآن کی اخوت ومساوات کی تعلیم اوراس پرمبنی حق،عدل اورحقوق ومراعات کی تقسیم نیز قانون کی حکمرانی کااصول دستور ہنداوراس کے آئڈیل سے ہم آہنگ ہے بلکہ دستورتو محض ایک قانونی ضابطہ ہے۔اسلام اس کوعقیدہ کے طور پرتسلیم کرتا ہےاوراس بنیاد پرحقوق العباد کا پورا باب ترتیب دیتاہے جس پرآخرت میں پوچھ کچھ ہوگی۔لہذا اگر اسلام کاتصور مساوات اورتصور اخوت سماج اورسیاست کاچلن بن جائےتو ہندوستانی سماج جس ظلم اورناانصافی کی چکی میں پس رہی ہےاس سےنجات کی صورت نکل آئے گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی تعلیمات اوراس کے آئڈیل کواہل ملک کے سامنے قولی اورعملی ہردوحیثیت سے پیش کیاجائےتو نہ صرف بھٹکی ہوئی انسانیت کوصراط مستقیم کا پتہ ملے گا بلکہ ملت کی موجودہ ذلت ونکبت بھی دور ہوگی۔اس وقت یہ ملین ڈالرکاسوال ہے کہ کیا ہندوستان کی مسلم ملت اپنی یہ قرآنی ذمہ داری اداکرنے کے لئے تیار ہے؟

عقیدۂ آخرت قرآن کی روشنی میں ایک مطالعہ

توحید، رسالت اور آخرت دین حنیف کے تین اساسی تصورات ہیں جن پر ایمان لا کر ہی ایک شخص سچا مومن و مسلم ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے تینوں عقائد کی اتنی واضح تشریح کی ہے کہ ان میں کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے اور ایک آدمی کامل ایمان اور یقین کے ساتھ اپنی زندگی گذارنے کے لائق بن سکے۔ اچھے اعمال اور اخلاق کی پختگی کے لئے عقیدۂ آخرت پر زندہ اور مضبوط ایمان ضروری ہے۔ زندہ اور مضبوط ایمان کے حصول کے لئے قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنا ایک لازمی شرط ہے۔ قرآن کلام الٰہی ہے اور سرچشمہ ھدایت ہے۔ ہم اس ھدایت کو جتنا اچھی طرح پڑھیں اور سمجھیں گے ہمارے لئے اس پر عمل کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔ اس سے ہمارا ایمان بھی مضبوط ہوگا اور ہمارے عمل بھی بہتر ہوں گے۔ دنیا اور حیات دنیا میں ہماری حیثیت مقام، رول اور ذمہ داری وغیرہ کی جانکاری ملے گی۔ دنیا میں ہمیں کیسی زندگی گزارنی چاہئے؟ ہمارا رب ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اس نے دنیا میں ہم کو کس کام کے لئے بھیجا ہے؟ ہم پر کن کی کیسی اور کتنی ذمہ داری ہے؟ ان تمام باتوں کا علم ہم کو قرآن پاک سے ہوگا۔ ہمیں یہ قرآن اللہ نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کے توسط سے وحی کے ذریعہ عطا کیا ہے۔ اس لئے قرآن اور صاحب قرآن دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضور پاک نے صرف قرآن ہم تک پہنچایا نہیں ہے بلکہ آپ نے اس کے ساتھ کتاب اور حکمت کی تعلیم بھی دی ہے۔ یعنی آپ نے ہم کو قرآن سمجھایا بھی اور اپنی زندگی اور قول و عمل سے اس کو بتایا بھی ہے کہ قرآن کی کس آیت کا کیا مفہوم ہے اس سے کیا احکامات نکلتے ہیں اور اس کی کس طرح پیروی کی جائے گی؟ اس لئے قرآن کو مجرد قرآن سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے حضور کی حدیث اور آپ کی سیرت وسنت کا بھی گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ اس طرح قرآن وسنت دونوں کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ ہم یہاں قرآن پاک میں عقیدہ آخرت کی کس طرح تشریح کی گئی ہے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے تاکہ آخرت کا عقیدہ پوری جامعیت کے ساتھ آپ کے سامنے آجائے اور آپ اس عقیدے کے تمام پہلوؤں سے روشناس ہوجائیں جس سے یہ

معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ اسلام کے نظام عقائد میں کتنا کلیدی اہمیت رکھتا ہے اور انسان کے مجموعی سیرت وکردار پر کیا اثر ڈالتا ہے۔

عقیدہ آخرت کی تشریح

قرآن نے آخرت کے عقیدے کو بنیادی عقائد میں شمار کیا ہے جس کے بغیر قرآن پاک سے رہنمائی اور ھدایت حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔ لہذا جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب یعنی قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے آخرت پر ایمان لانا ضروری ہے۔

آپ قرآن پاک کھولئے۔ اس میں سب سے پہلی سورۃ الفاتحہ ہے۔ جس کو ہم ہر نماز میں اور اس کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ بغیر سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے نماز نہیں ہوتی ہے چاہے وہ فرض نماز ہو یا سنت اور نفل۔ سورہ فاتحہ میں کل سات آیتیں ہیں۔ اس کی ابتدائی تین آیتوں میں اللہ وحدہ لاشریک کی صفات عالیہ بیان کی گئی ہیں۔ جس میں پہلی صفت یہ ہے کہ اللہ تمام جہانوں کا رب ہے یعنی پالنہار اور پروردگار ہے۔ دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے یعنی اپنے تمام بندوں اور مخلوقات کے ساتھ اس کا معاملہ رحمت وعنایت کا ہے جس کے بغیر نہ تو کوئی مخلوق وجود پذیر ہوسکتی ہے اور نہ زندہ رہ سکتی ہے۔ اس کائنات کا جو حیات بخش نظام (Life promoting system) ہے وہ اس کی ربوبیت اور رحمت کی واضح دلیل ہے۔ لیکن قرآن نے اللہ کی تیسری صفت کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ ہے مالک یوم الدین یعنی وہ روز جزا کا ملک ہے۔ یہیں سے عقیدہ آخرت کی بنیاد شروع ہوتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رب اور رحیم ہی نہیں ہے بلکہ وہ منصف بھی ہے۔ اگر انسان نے اس کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری کی اور اس کا غلط استعمال کیا، اس نے خلق خدا کو تکلیف پہنچائی، نظام کائنات کو بگاڑا، فتنہ فساد برپا کیا اور اللہ نے جس حق کی تعلیم وتلقین کی تھی اس کو بدل کر ظلم وگمرہی اختیار کی تو وہ خدا کے غضب اور عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک روز جزا مقرر کی ہے جس دن وہ سارے انسانوں اور پوری کائنات کو اکٹھا کرے گا اور انسان اپنے تمام اقوال واعمال کو اس کے تمام ترا ثرات وعواقب کے

ساتھ پوری جامعیت میں دیکھ سکے گا۔اس دن وہ اس کا پورا حساب لے گا۔اس طرح انسان کو جو زندگی ،وسائل ،اختیار اور آزدی دی گئی ہے اس کے ساتھ اس کی جوابدہی بھی طے کردی گئی ہے۔ جوابدہی کے بغیر کوئی آزادی بے معنی ہے اس سے آزادی نہیں بلکہ انارکی پھیلے گی اور جو کمزور اور بے وسائل ہوں گے ان پر ظلم واستحصال ہوگا۔ایسے تمام لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک روز ان کو مرنا ہے۔لیکن وہ مرکر مٹی نہیں ہوجائیں گے جیسا بظاہر نظر آتا ہے، بلکہ قیامت کے بعد جس کا آنا صرف اللہ کو معلوم ہے، انہیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کھلی عدالت میں تمام انسانوں کے سامنے تمام انسانوں کا حساب کتاب لے گا۔ جو اس کے آخری فیصلے میں کامیاب ہوں گے وہ ان کو اپنے فضل وخوشنودی اور اپنی نعمتوں بھری جنت میں دائمی لطف وعنایت کے ساتھ جگہ دے گا اور جو لوگ اس کے آخری فیصلے میں ناکام ہوں گے وہ خدا کے غضب اور عذاب کے مستحق ٹھہرائے جائیں گے اور دائمی عذاب کے گھر جہنم میں پھینک دئے جائینگے۔اسی دن اور اسی عذاب سے بچنے کے لئے اللہ نے اپنی کتاب نازل کی اور اپنے رسول بھیجے تاکہ لوگ اس کی پیروی کرکے خدا کی خوشنودی اور اس کے دائمی انعام کے مستحق ہوں۔ یہ ہے وہ فکر جو قرآن نے بالکل ابتدائی آیات میں بتادیا ہے۔

اس کے بعد سورۃ البقرہ شروع ہوتی ہے جس کی ابتدائی پانچ آیتوں میں قرآن نے یہ بتایا کہ یہ کتاب کیا ہے۔اس سے کون لوگ ھدایت پاسکتے ہیں۔اس کتاب سے ہدایت پانے کے کیا شرائط ہیں۔پہلی آیت میں بتایا کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔اس کا دومفہوم ہے پہلا یہ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے یعنی یہ کتاب حضرت محمدؐ ضرور پیش کررہے ہیں۔مگر یہ ان کے ذہن وفکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف سے وحی کی گئی ہے جس کو وہ من وعن لفظ بہ لفظ اسی طرح پیش کررہے ہیں جیسی کے ان پر اتاری گئی ہے۔آج بہت سے لوگ اور اس وقت بھی جس وقت یہ کتاب نازل ہورہی تھی سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کتاب حضورؐ اپنی طرف سے پیش کررہے ہیں۔قرآن نے پہلے جملہ میں ہی ایسی تمام باتوں کی تردید کردی اور بتایا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے جس میں کوئی شک نہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے جو قادر مطلق ہے زمین ،آسمان اور کائنات کا خالق ومالک ہے۔جو علیم وخبیر ہے جس سے

کائنات کی نہ تو کوئی چیز پوشیدہ ہے اور نہ اس کی گرفت اور علم سے باہر ہے اس لئے اس کتاب میں جو بات پیش کی گئی ہے وہ ہر شک اور شبہہ سے بالاتر ہے۔اس بنیادی بات کو ذہن نشیں کرنے کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس کتاب سے کون لوگ ھدایت پا سکتے ہیں۔ ھدایت کی پہلی شرط تقویٰ ہے۔یعنی جس کے دل میں اللہ کا خوف ہے اور جو گمرہی سے بچ کر زندگی گذارنے کا خواہش مند ہے جو لوگ اس صفت سے خالی ہوں گے وہ اس کتاب سے ھدایت حاصل نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اس کو پڑھنے کے بعد بھی وہ گمرہی میں بہت دور نکل جائیں گے۔آج کل آپ ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ قران پڑھتے ہیں یا انہوں نے قرآن پڑھا ہے۔مگر انہیں ھدایت نہیں ملتی بلکہ وہ الٹے گمرہی میں بہت دور نکل جاتے ہیں اور قرآن کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں اس لئے ھدایت کے حصول کے لئے دل کا تقویٰ ہونا یعنی اس کا اللہ کی طرف سے رہنمائی کے لئے رجوع ہونا ضروری ہے۔اس کے بعد قرآن نے چار اور باتوں کا ذکر کیا ہے جو ھدایت کے لئے لازم ہے۔اس میں پہلی بات ایمان بالغیب ہے۔کائنات وہی نہیں ہے جس کو ہم کھلی آنکھوں سے یا دوربین سے دیکھتے ہیں بلکہ ایک پوری کائنات ہے، جس کا ہم اس دنیا میں مشاہدہ نہیں کر سکتے ہیں۔جن حقائق کا ہم دنیا میں مشاہدہ نہیں کر سکتے ہیں۔مگر جس کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں اور رسول نے اپنی حدیث میں ذکر کیا ہے، اس پر ایمان لانے کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔لہذا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ایمان بالغیب کے بعد قرآن سے ھدایت ورہنمائی کے لئے نماز کا قیام اولین شرط ہے ۔نماز بندے کا اللہ سے تعلق جوڑتی ہے۔جب اللہ سے تعلق ہوگا تبھی تو ایک بندہ اللہ کی ھدایت کا جویا اور اس پر عامل ہوگا۔بجلی کے بلب کا کنکشن اگر پاور ہاؤس سے نہیں ہوگا تو اس میں روشنی نہیں ہوسکتی ہے۔اسی طرح ایک شخص نماز کا پابند نہیں ہوگا تو اللہ سے اس کا رشتہ استوار نہیں ہوگا اور اس کو رہنمائی میسر نہیں ہوگی۔

ھدایت کی تیسری شرط انفاق ہے یعنی جو کچھ اللہ نے رزق اور وسائل عنایت کئے ہیں اس میں اپنا اور دیگر ابنائے نوع کا جو حق ہے اس کے پیش نظر اس پر خرچ کرتے ہیں۔

ھدایت کی چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ حق اور ھدایت کو غیر منقسم مانتے ہیں اور حضور سے

پہلے جو بھی انبیاء آئے اور جو کتابیں آئی ہیں اور دنیا بھر میں جس قوم اور جس زبان میں اللہ نے اپنی رہنمائی بھیجی ہے ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور ھدایت کی پانچویں اور آخری شرط یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

آخرت کا مطلب کیا ہے؟ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنی طبعی عمر پوری کر کے، جس کا علم صرف اللہ کو ہے، ختم ہو جائے گی جس کو قیامت کہتے ہیں۔ جب قیامت قائم ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا کو اور پورے انسانوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا اور یوم جزا قائم کرے گا۔ جہاں تمام انسانوں کے عقیدے، افکار اور اعماال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔ جو اس حساب میں کامیاب ہوگا وہ انعام پائے گا اور جو ناکام ہوگا وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ اس طرح عقیدۂ آخرت مندرجہ ذیل باتوں پر دلالت کرتی ہے۔

(۱) انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام افکار اور اعمال کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

(۲) یہ دنیا ابدی نہیں ہے بلکہ ایک مدت خاص کے بعد ختم ہو جائے گی۔ یہ کب ختم ہوگی اس کا علم صرف خدا کو ہے اس نے اس کا یہ علم کسی کو نہیں دیا ہے۔ نبی نے صرف اس کے ہونے کی خبر دی ہے کب ہوگی اس کی کوئی خبر نہیں دی ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے اپنے نبی کو بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ دنیا کب ختم ہوگی اور کب حساب کتاب کا دن مقرر ہوگا۔ اس لئے اس سلسلے کی کوئی قیاس آرائی فضول ہے۔

ہمیں قیامت کے وقوع اور آثار قیامت کے پیش نظر قیاس آرائیاں کرنے کے بجائے اپنے اعمال پر دھیان دینا چاہئے کیونکہ ہماری قیامت اسی دن سے شروع ہو جاتی ہے جس دن ہماری موت واقع ہوتی ہے اور قیامت چاہے بہت دور ہو مگر موت تو ہر شخص کے گھات میں ہے اس لئے اس جانب زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت ہے۔

(۳) اس عالم کے بعد اللہ تعلیٰ دوسرا عالم بنائے گا اور دنیا کے شروع ہونے سے لے کر دنیا کے خاتمے کے آخری دن تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہوں گے ان سب کو دوبارہ پیدا کرے گا اور جمع کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب لے گا اور پھر اس کے مطابق انہیں پورا پورا

بدلہ دے گا۔

(۴) جولوگ خدا کے آخری فیصلے میں نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو بد ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔

(۵) کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار موجودہ دنیا کی مادی خوشحالی یا بدحالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیاب وہ شخص ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب قرار پائے جو دنیا میں بظاہر کامیاب ہیں مگر وہ اگر آخرت میں ناکام ٹھہرتے ہیں تو انہیں کامیاب نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح قرآن کی رو سے عقیدہ آخرت کا یہ مفہوم ہے۔اس عقیدے کا جتنا اچھا اور گہرا استحضار ہوگا اتنا ہی ایک آدمی کے قول وعمل میں نکھار اور اصابت پیدا ہوگی اور گمرہی وضلالت سے بچتے ہوئے وحی اور رسالت کی روشنی میں خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرے گا۔اس طرح عقیدۂ آخرت کو اسلام کے عقائد اور نظام اخلاق واعمال میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

آخرت کا انکار دراصل خدا کا انکار ہے:توحید رسالت اور آخرت تینوں اس طرح باہم مربوط (Interwoven) ہیں کہ ایک کا انکار لازما دوسرے کا انکار ہے۔قرآن نے ان تینوں عقائد کو اسی طرح پیش کیا ہے۔چنانچہ قرآن سورۃ الرعد (۱۳) آیت نمبر ۵ میں اعلان فرماتا ہے۔

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَ اُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (۵) (13:5)

اب اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ''جب ہم مرکر مٹی ہوجائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے۔''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرکر مٹی ہوجائیں گے اور انہیں دوبارہ اٹھایا نہیں جائے گا وہ دراصل اللہ کی ذات سے کفر کررہے ہیں یعنی اس کی قدرت

اور نظام حکمت کو نہیں مان رہے ہیں اور محض اپنی خام خیالیوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ کتنی تعجب کی بات ہے کہ جہاں وہ پوری کائنات میں زبردست نظم وضبط دیکھتے ہیں اور ہر چیز وجہ واثر (Cause & effect) کے ایک ٹھوس نظام میں بندھی ہوئی ہے اس کے بعد بھی وہ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو اللہ نے مال واولاد سے نوازا ہے اور وہ دنیوی مال ودولت اور قوت وجلال کے اعتبار سے بہت سے لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کے دن پر یقین نہیں رکھتے اور اس طرح اللہ کے کامل اقتدار کو نہیں مانتے ہیں۔ ایسے لوگ جب اللہ کی گرفت میں آتے ہیں تب انہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے تھے اور جو مادی سہارے انہوں نے بنا رکھے ہیں جن پر ان کو بڑا ناز تھا وہ سب ان کی کوئی مدد نہیں کرسکے۔ ایک شخص بظاہر خدا کے وجود کا قائل ہے مگر وہ تکبر اور فخر وغرور میں مبتلا ہے اور انکار آخرت کرتا ہے تو قرآن نے اس کو اللہ سے کفر سے ہی تعبیر کیا ہے سورہ الکھف آیت ۳۲ تا ۴۴ میں دو شخص کے حوالے سے اللہ نے اس حقیقت کو سمجھایا ہے۔ ایک وہ شخص تھا جس کو مال اور نفری طاقت نصیب تھی اور دوسرا اس کے مقابل ایسی دولت وقوت نہیں رکھتا تھا۔ پہلا شخص اپنے مال وطاقت کی بنا پر سمجھتا تھا کہ اس کی دولت کبھی فنا نہیں ہوگی اور قیامت کی گھڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس عقیدے اور احساس نے اسے متکبر بنا دیا تھا جبکہ دوسرا ایمان رکھتا تھا۔ لیکن جب پہلے شخص کا ثمرہ مارا گیا اور اس کا باغ لٹ گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے غلط عقیدے نے اس کا سارا کیا کرایا ملیامیٹ کردیا۔

آخرت کا انکار دراصل خدا کا انکار ہے

اس طرح عقیدے آخرت کا انکار خدا کی قدرت کاملہ اور اس کے نظام انصاف کا انکار ہے اس کے بعد اگر ایک شخص خدا پر ایمان بھی رکھتا ہے تو اس کے ایمان کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایک اندھی قوت کو مانتا ہے جو قوت تو ہے مگر اس کو اپنی خلق پر کوئی کنٹرول نہیں ہے اور کوئی اس کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو خدا کی ذات بے اختیار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کائنات کا سارا منطقی تانا بانا بکھر جائے گا۔ لہذا قرآن صاف

صاف اعلان کرتا ہے کہ جولوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ دراصل اللہ پر اس اس کی قدرت کاملہ پر بھی ایمان نہیں رکھتے جو کفر ہے۔لہذا آخرت کا انکار دراصل خدا اوراس کی قدرت وحکمت کا انکار ہے۔

آخرت کا انکار رسالت کا انکار ہے

عقیدہ آخرت کا رسالت سے گہرا تعلق ہے ۔یہ رسول ہی ہے جس کے ذریعہ ہمیں معرفت الٰہی کا علم ہوتا ہے۔اس کے صفات سے واقفیت ہوتی ہے اوراس کے اسکیم اور مرضی کی جانکاری ملتی ہے ۔اللہ نے دنیا تخلیق کی اور دنیا میں مختلف طرح کی مخلوقات کو پیدا کیا ،مگر جو مقام ومرتبہ، عقل وشعور،قوت گویائی اورفکر وعمل انسان کو عطا کی ہے وہ اس نے کسی مخلوق کو نہیں دی اس اعتبار سے انسان اس پوری کائنات میں اشرف المخلوقات ہے۔لہذا اس نے جہاں دنیا میں جینے اور رہنے کے تمام انتظامات کئے وہیں اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے ۔اس کی کیا ذمہ داری ہے اور وہ اس ذمہ داری کو وہ کیسے ادا کرسکتا ہے اس کے لئے اس نے رسول بھیجے اوراپنے رسولوں کے ذریعہ ایک تسلسل کے ساتھ ان امور سے واقف کرایا۔اس کو خاص طور سے یہ باور کرایا گیا کہ وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔لہذا اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔اسی کے لئے موت وحیات کی تخلیق کی گئی ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔۔قرآن سورۃ الملک (٦٧) آیت ٢ میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (١) الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (٢)

ترجمہ: نہایت بزرگ وبرتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے،تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگذر کرنے والا بھی۔(٦٧:٢-١)

اس طرح دنیا میں حیات وموت کی تخلیق انسان کے امتحان کے لئے کی گئی ہے۔مگر یہ

امتحان بے معنی ہوتا اگر یہ معلوم نہ ہو کہ نصاب کیا ہے، سوال کس چیز سے پوچھا جائے گا۔ اس نصاب کی تعلیم کون دے گا۔ لہذا اللہ نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے وحی اور رسالت کا نظم کیا جس کے ذریعہ دنیا میں انسان کی زندگی، اس کا مقصد اور اچھے برے عمل کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کیا سوالات ہوں گے اور یہ امتحان کب اور کہاں منعقد ہوگا۔ اب ایک آدمی غیر سنجیدہ طالب علم کی طرح ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دے اور غفلت میں پڑا رہے تو بہر حال اسے ناکامی ہاتھ لگے گی جس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ اللہ نے اپنی اسکیم واضح کرتے ہوئے قرآن سورہ بنی اسرائیل (۱۷) آیت ۱۵ میں صاف صاف فرما دیا کہ۔

ترجمہ: جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کا وبال اسی پر ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ایک پیغام بر نہ بھیج دیں۔ (۱۵۔۱۷)

اس آیت میں واضح طور پر تین باتیں کہیں گئی ہیں پہلی یہ کہ کوئی راہ راست اختیار کرتا ہے یا گمراہ ہوتا ہے یہ اس کا ذاتی فیصلہ ہے اس لئے اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ دوسرا کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یعنی ہر شخص انفرادی حیثیت سے خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اور تیسری اور آخری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس کی خبر دے دی ہے۔ اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں ان امور کی جانکاری نہیں دی گئی۔ اب اگر وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے سزا کے مستحق ہوتے ہیں تو یہ ان کی اپنی کرنی کا نتیجہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی سے پکڑ لیا (الحاقہ (۶۹) ۱۱۔۱۰) قرآن نے جہنم میں ڈالے جانے والوں کا نقشہ کھینچا ہے جب جہنم میں کوئی انبوہ ڈالا جائے گا تو جہنم کے کارندے اس سے پوچھیں گے۔

ترجمہ: کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا، وہ جواب دیں گے ہاں خبردار کرنے والا آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا کہ اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے۔ تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔ وہ کہیں گے کاش ہم سنتے اور سمجھتے تو آج

اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے ۔اس طرح وہ اپنے قصور کا خوداعتراف کرلیں گے ۔لعنت ہےان دوزخیوں پر۔(الملک (۶۷)۱۱۔۹)

ان آیات کے استحضار سے معلوم ہوتا ہے کہ انکار رسالت کے نتیجہ میں ہی انکار آخرت ہوتی ہے ۔اگر ایک شخص رسول پر ایمان لاتا ہےتو اس کا مطلب ہے کہ رسول نے جن عقائد کی تعلیم دی ہےاس پر بھی ایمان لائے گا۔مگر جس نے رسول کا انکار کردیا تو گویا اس نے اس کے پیش کردہ عقائداور تعلیمات کا بھی انکار کردیا۔اس طرح رسول کے انکار سے آخرت کا انکار لازم ہوجاتا ہے اور رسول پر ایمان سے آخرت پر ایمان بھی لازم ہوجاتا ہے۔

اس طرح عقیدہ توحید،عقیدہ رسالت اور عقیدہ آخرت باہم مربوط ہیں ۔ایک کا انکار باقی تمام چیزوں کا انکار ہے۔اس لیے قرآن نے ان آیات میں واضح کیا ہے کہ کس طرح آخرت کا انکار خدا کا انکار ہے اور کس طرح رسول کے انکار سے آخرت کی جزا وسزا کا انکار لازم ہوتا ہے۔اس طرح اسلام کے نظام عقائد میں عقیدہ آخرت کو کلیدی اہمیت حاصل ہے جس پر ایمان ویقین سے ہی اطاعت واصلاح کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

قرآن نے عقیدہ آخرت کو تمام تفصیلات کے ساتھ پیش کیا ہے اور ہرطرح کی خام خیالیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے تاکہ یہ عقیدہ پوری جامعیت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے اوراس میں کسی طرح کا ابہام (Confusion) باقی نہ رہے۔

عقیدے آخرت کے مختلف پہلو

بہت سے لوگ اپنی دنیوی کامیابی،رزق کی فراوانی،دولت واقتدار اور دیگر امور کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فلاح یافتہ ہیں اورانہیں دنیا کی طرح آخرت میں بھی ایسے ہی فلاح وکامیابی میسر ہوگی ۔قرآن نے اس طرح کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے بتایا کہ آخرت کی فلاح کا مدار کثرت رزق پرنہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔قرآں نے صاف صاف بتادیا ہے کہ قیامت کے دن پرہیز گار لوگ ہی عالی مقام ہوں گے۔سورہ البقرہ (۲) آیت ۲۱۲۔۲۱۱) میں ارشاد ہے۔

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے،ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی محبوب اور دل

پسند بنادی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔
مگر قیامت کے روز پرہیز گار لوگ ہی ان کے مقابلے عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا
کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب دے۔(۲:۲۱۲۔۲۱۱)
اس لئے وہاں کا انجام کسی کی خوش خیالیوں پر موقوف نہیں ہے۔

قرآن نے عقیدہ آخرت کے بارے میں دوسری اہم بات یہ بتائی ہے کہ وہاں ہر فرد اپنی آزادانہ حیثیت میں جواب دہ ہے۔(۶:۹۴) وہاں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہوگا جو کسی کی حمایت ونصرت اور سفارش کرسکے اور نہ کوئی کسی کا جوابدہ ہوگا (۶۔۵۱) تاہم قرآن نے یہ اعلان کردیا ہے کہ وہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا نیکوکاروں کو دس گنا اجر ملے گا مگر جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۶:۱۶۰)

آخرت کے وقوع کی ایک بڑی منطقی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اللہ نے انسانوں کو فکر وفہم عطا کیا ہے اور قول وعمل کی آزادی بخشی ہے۔ لہذا لوگوں نے اپنے طور پر بہت سے عقائد ونظریات گڑھ لئے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ برحق ہیں اور اس اعتبار سے لوگوں کے درمیان بہت سے اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ ان عقائد ونظریات میں کون حق ہے اور کون باطل اس پر ہر کوئی اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے قائم کئے ہوئے ہے اور اس پر عمل بھی کررہا ہے۔ مگر حتمی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہے کہ فی الواقع کون سا عقیدہ اور عمل برحق ہے اور کون باطل۔ ہم اس وقت دنیا میں بے شمار مذاہب اور نظریات دیکھتے ہیں اور ہر کسی کا دعویٰ ہے کہ وہی برسرحق ہے جس کی وجہ سے اکثر ان کے درمیان نزاع واختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کا فیصلہ دنیا میں کرنا محال ہے عقیدہ آخرت کی ایک منطقی دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن جب کائنات کے سارے راز کھول دئے جائیں گے اور تمام حقیقتیں لوگوں کے سامنے واشگاف ہوکر آجائیں گی اس وقت لوگوں کو واضح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ وہ جن باتوں میں آپس میں لڑ رہے تھے ان میں صحیح اور اصل بات کیا ہے۔ اس طرح اس دن حقیقت نفس الامری پوری طرح واضح ہوجائے گی۔ قرآن کہتا ہے۔

آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں بتادے گا جس میں تم

اختلاف کرتے رہے ہو۔(۴:۴۸)

لہذا انسانوں نے جواختلافات پیدا کرلئے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلس مناظرہ میں ہوگا نہ کسی عدالت اور پارلیامنٹ میں اور نہ یہ میدان جنگ کی جیت ہار سے ہوگا۔اس کا آخری فیصلہ تو خدا کی عدالت میں ہوگا اور یہ عدالت قیامت کے دن قائم ہوگی۔قرآن کے بقول پھر تم سب کواپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا(۶:۱۶۴)اس طرح آخرت اچھے اور برے اعمال کے حساب کتاب کے لئے ہی نہیں ہوگی بلکہ عقائد،افکار اور نظریات میں جو گمرہی اور زُور ہے اس کو واضح کرنے کے لئے بھی قائم ہوگی۔

قرآن پاک نے عقیدہ آخرت کے سلسلے میں دو باتیں بہت وضاحت کے ساتھ بتائی ہیں ایک یہ کہ آدمی مر کے مٹی نہیں ہوجائے گا بلکہ اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اس کے تمام افکار واعمال کا حساب لیا جائے گا۔

اس لحاظ سے دنیا کی یہ زندگی ایک امتحان ہے اور تمام انسان ایک امتحان گاہ میں ہیں۔لہذا ہر شخص کو دنیا کی اس زندگی کو پوری سنجیدگی، سمجھداری اور ذمہ داری کے ساتھ نبھانی چاہئیے اس لئے کہ اس کا حساب ہوگا۔

دوسری بات قرآن نے واضح کی ہے کہ دنیا کی یہ زندگی عارضی ہے دنیا اپنے انجام اور عواقب کے اعتبار سے بہت اہم ہے کیونکہ دنیا میں کئے گئے اعمال کی بنیاد پر ہی آخرت میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔مگر ہم سب کو ایک مدت خاص کے بعد اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے۔ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص ایک مدت خاص کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا دائمی قیام کی جگہ نہیں ہے۔دائمی قیام کی جگہ آخرت ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔دنیا کی زندگی ایک عارضی کھیل تماشہ ہے حقیقت میں آخرت ہی کا قیام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہے۔(۶:۳۲)

آخرت دائمی قیام کی جگہ ہے جب آدمی دوبارہ زندہ کیا جائے گا پھر اس کے بعد اسے موت نہیں آئے گی (۳۷:۵۹۔۵۸)اور اگر وہ خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی نعمتوں بھری جنت میں جگہ پائے گا جس کا بہت ہی دلکش خاکہ(Graphic Description)

قرآن نے سورہ ص میں۵۴-۵۰ آیات میں پیش کیا ہےاور جولوگ ناکام ہوں گےانہیں کس اذیت ناک عذاب میں مبتلا رکھا جائے گا اس کی بھی تفصیل اس سورہ کے۶۴-۵۵ آیات میں پیش کی گئی ہے یہاں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ چاہے انعام ہو یا سزا یہ دونوں دائمی ہوں گے۔اس لئے آخرت ہی اصل جائے قرار ہے۔جن لوگوں کے اندر اس کا جیسا شعور پایا جائے گا اور ان کی جیسی سمجھ ہوگی اسی کے مطابق ان کا عمل بھی ہوگا اور اسی کے مطابق وہ اس کا انجام بھی دیکھیں گے۔

قرآن اپنی اصل میں ھدی الناس ہے۔یعنی یہ کتاب تمام انسانوں کی ھدایت اور رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔انسانی سماج میں امیر، غریب، طاقتور، کمزور، ظالم ومظلوم ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں، قرآن ہر انسان چاہے وہ کسی حیثیت کا آدمی ہو اس کو ایک مستقل منفرد اور ذمہ دار وجود مان کر اس سے خطاب کرتا ہے۔سماج کے برے لوگ اکثر کمزور لوگوں کو دبا کر رکھتے ہیں۔مگر کمزور لوگ بھی اپنی نفس کی کمزوریوں کی وجہ سے ان سے دب کر رہتے ہیں۔اگر وہ اپنے وجود کے اظہار پر آمادہ ہو جائیں تو بظاہر جو طاقت ور لوگ ہیں ان کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔چنانچہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر شخص اپنے وجود کا خود مالک ہو اور اپنے بارے میں آزادانہ فیصلہ لے۔نہ تو باپ دادا کے غلط عقائد کی پیروی کرے (۱۷۳:۷) اور نہ ظالموں کا زور سہے۔خدا کی زمین وسیع ہے اس میں اپنے لئے جائے قیام تلاش کرے (۹۷:۴) لیکن جو واقعی بے بس ہیں ان کی معافی ہوسکتی ہے (۹۸:۴) آخرت میں ان تمام امور کا فیصلہ ہوگا۔کس کی مجبوری Genuine ہے اور کون بہانے بنا رہا ہے اس کا علم اللہ کو ہے لہذا اللہ ان سب سے حساب لے گا اور ان سب کا حساب لے گا۔اس لحاظ سے آپ دیکھیں تو عقیدہ آخرت کے گوناگوں پہلو ہیں۔وہاں کا انجام کسی کی خوش خیالیوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا ٹھوس ضابطہ ہے۔لہذا ہر شخص کو چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہئے۔

قرآن نے اہل کتاب کے حوالے سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

> تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ ملا ہے، ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے

ہیں آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ملے گی بھی تو بس چند دنوں کے لئے۔ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پور بدلہ دے دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔(۳:۲۵۔۲۲)

عقیدہ آخرت کے باب میں قرآن نے جو تفصیلات بتائی ہیں ان میں ایک بات تو یہ ہے کہ وہاں انسانیت اخلاق و اعمال کی بنیاد پر تقسیم ہوگی (۳۰:۱۶۔۱۴) وہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔مگر جو لوگ خدا کے آخری فیصلہ میں مجرم ٹھہریں گے ان کے حق میں نہ کوئی دوستی کام آئے گی۔نہ وہاں کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔وہ دن یقیناً بیحد سخت ہوگا۔اس دن خدا کی رحمت کے سوا کوئی چیز مددگار نہیں ہوگی۔

لہذا اس عقیدے کا تقاضہ ہے کہ آدمی اپنے وجود اور مقصد وجود کے بارے میں حساس ہو اور اللہ کے حضور حاضری کا احساس رکھتے ہوئے دنیا میں اپنی زندگی گذارے ورنہ وہ دائمی خسران سے محفوظ نہیں ہوسکتا ہے۔اللہ ہم سبھوں کو آخرت کے عذاب سے محفوظ رکھے اور ہمارا شمار اپنے صالح بندوں میں کرے جس پر اس کا انعام ہوا ہے۔آمین۔

عقیدہ آخرت کی اہمیت اوراس کے امکان کے دلائل

عقیدے آخرت کی اہمیت

قرآن پاک میں اللہ نے بتایا کہ ہم نے انسان کوزمین میں خلیفہ بنا کر پیدا کیا ہےاوراس کی زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے ۔خلیفہ کا مطلب ہے بااختیارمخلوق جس کوفکروعمل کی آزادی دی گئی ہے۔آزادی کا مطلب ہے وہ اچھے کام بھی کرسکتا ہےاور برے کام بھی کرسکتا ہے۔مگراللہ نے دنیامیں بھیج کراندھیرے میں بھٹکنے کے لئےنہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے انسانوں کی ھدایت کے لئے نبی اوررسول بھیجےاوراپنی کتاب نازل کی اورانسانوں کو بتایا کہ اللہ کےنزدیک کون ساعقیدہ صحیح ہےاورکون سےاعمال بہتر ہیں اللہ کن چیزوں کو پسند کرتا ہےاورکن چیزوں کوناپسند کرتا ہےایک انسان کے لئے کون ساطرزعمل صحیح ہےاورکون سےاعمال بہتر ہیں۔خدا کے بتائے ہوئے طریقے کےمطابق زندگی گذارنے کو بندگی رب کہتے ہیں۔دراصل یہی بندگی رب انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔خلافت کا فریضہ بندگی رب کے ذریعہ ہی ادا ہوگا ورنہ اسے اختیاروآزادی کا غلط استعمال مانا جائے گا۔مثال کےطور پرایک شخص ایک ملک کا شہری ہے۔اس ملک کا ایک دستوراورقانون ہے۔ ملک کے ہرشہری کودستور اورقانون کے تحت اختیار اورآزادی حاصل ہے۔لیکن اس اختیار اورآزادی کے ساتھ اسے یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ قانون کے مطابق کون ساعمل جائز ہےصحیح ہے، پسندیدہ ہےاورکون ساعمل ناجائز ہے۔غلط ہےاورناپسندیدہ ہے۔ایک شہری کی حیثیت سےاس کےاختیارکیا ہیں اوراس کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں،اگراس نے قانون کا احترام کرنے والےشہری کی حیثیت سےایک ذمہ دارانہ زندگی گذاری تواس کا شمار باعزت شہریوں میں ہوگا۔لیکن اس نے دی گئی اختیاراورآزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کی قانون میں جوکام غلط اورجرم مانے جاتے ہیں اس کا ارتکاب کیا تو اس کے ساتھ ایک مجرم کی طرح برتاؤ کیا جائے گااوروہ سزا کا مستحق ہوگا۔اس مثال سےآپ دنیامیں انسان کی حیثیت اورالٰہی اسکیم کوسمجھ سکتے

ہیں انسان ایک آزاد اور خود مختار وجود ضرور ہے مگر وہ خدا کے سامنے اپنے جملہ افکار واعمال کے لئے ذمہ دار ہے۔قرآن نے اس بات کو متعدد مقامات پر اسلوب بدل بدل کر مگر کھول کھول کر بتادیا ہے تا کہ آخرت کے وقوع اور حساب کتاب کے ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہ رہے۔اب ان واضح ھدایات کے بعد بھی کوئی اگر غفلت وانکار کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے وبال سے بچ نہیں سکتا ہے۔

قرآن سورہ المومنون (۲۳) آیت ۱۱۵ میں سوال کرتا ہے

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟ (۲۳:۱۱۵)

اور قرآن سورۃ الملک آیت دو میں موت وحیات کا پورا فلسفہ سمجھاتے ہوئے بتاتا ہے کہ

''نہایت بزرگ وبرتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔'' (۶۷:۱۔۲)

اس طرح اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس میں انسانوں کو اختیار وآزادی یعنی خلافت کے منصب پر فائز کرتے ہوئے دنیا میں اس کی پیدائش ایک سنجیدہ فیصلہ ہے یہ کوئی فعل عبث نہیں ہے اور اسی سنجیدہ فیصلے کا منطقی نتیجہ ہے کہ اس کے اعمال کا حساب کتاب لیا جائے اور اسی غرض کے لئے حیات وموت کی تخلیق کی گئی ہے۔یہ حساب دنیا میں نہیں ہوگا بلکہ یہ حساب مرنے کے بعد آخرت میں ہوگا۔دنیا عمل کی،امتحان کی جگہ ہے۔آخرت اس کے Evalution اور Result کا دن ہے۔اس طرح وقوع آخرت کا وجوب اور اس کی غرض واہمیت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے

اب جولوگ آخرت اور یوم حساب کو ماننے والے ہیں دنیا میں ان کے افکار واعمال ان لوگوں سے مختلف ہوں گے جو اس کا انکار کرتے ہیں وہ الٰہی ہدایات کے جویا ہوں گے اور اس پر عمل کریں گے لیکن جو وحی اور رسالت کی روشنی میں اپنی زندگی گذارنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ اپنے اختیار آزادی کو ایک Outlawed کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں ظاہر سی بات ہے کہ اگر ان

کا حساب کتاب نہیں ہوگا ان کی Scrutiny نہیں ہوگی، ان کے غلط اور صحیح کا جائزہ نہیں لیا جائے گا گویا جس نے اچھا کیا اور جس نے برا کیا دونوں برابر ہوں گے جو انصاف اور منطق کے خلاف ہے۔قرآن نے ایسے تمام لوگوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ کسی خام خیالی میں نہ رہیں۔قیامت آئے گی اور ضرور آئے گی اور اس لئے آئے گی کہ جو لوگ ایمان اور نیک عمل کرنے والے ہیں ان کو اچھا بدلہ ملے اور جو آیات الٰہی کو نیچا دیکھانے والے ہیں ان کو سزا دے۔قرآن سورہ سبا آیت ۳ سے ۵ اس حقیقت کو اس طرح واضح کرتا ہے۔

> ''منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے۔کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے گی۔اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی۔سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔اور یہ قیامت اس لئے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم۔اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے لئے زور لگایا ہے، ان کے لئے بدترین قسم کی دردناک عذاب ہے۔'' (۳۴:۳۔۵)

اس طرح یہ آیات آخرت کے وجوب اور اس کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں۔شیطان انسان کو بھٹکا تا رہتا ہے اور آخرت کے وقوع کے باب میں شک میں مبتلا رکھتا ہے۔(۳۴:۲۱) اور اس کو بدعقیدگی اور خوش فہمیوں کے جال میں پھنسا کر رکھتا ہے۔اس طرح جو منکرین آخرت ہوتے ہیں ان کے کرتوت ان کو خوشنما لگتے ہیں اور اس خوش گمانی میں وہ بھٹکتے چلے جاتے ہیں (۲۷:۴)

لیکن وہ آخرت کی سزا اور خسران سے نہیں بچ سکتے (۲۷:۵) لہٰذا قرآن آخرت کی اہمیت اس کے وقوع اور اس کے حساب کا ذکر کرتے ہوئے سورہ زلزال میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔

> ''پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔'' (۹۹:۸)

ان واضح ھدایتوں کے بعد بھی اگر کوئی شخص غلط عقیدہ کا شکار ہو کر آخرت کے وجوب اور اس کے حساب کتاب کا انکار کرتا ہے تو وہ اس کے وبال اور برے انجام سے بچ نہیں سکتا۔قرآن

نے صرف آخرت کے وجوب کی اہمیت ہی واضح نہیں کی ہے بلکہ اس کے امکان کے دلائل بھی دئے ہیں جن کا آگے ذکر کیا جائے گا۔ یہ ہے عقیدہ آخرت کی اہمیت جس پر ہر سمجھدار آدمی کو غور کرنا چاہئے اور اپنے فکر وعمل کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کیسی زندگی گذار رہا ہے اس لئے کہ اسے اسی زندگی اور اس میں کئے گئے کاموں کا حساب دینا ہے۔

آخرت کا امکان اور اس کے دلائل

قرآن کتاب ھدایت ہے لیکن یہ نزارول بک نہیں جس میں صرف امرونہی (Dos & Don'ts) دیئے گئے ہیں بلکہ اس نے عقائد واحکام دیئے ہیں اس کی حکمت غایت اور دلیل بھی دی ہے تا کہ ایک آدمی پورے علم اور یقین کی کیفیت کے ساتھ اس پر عامل ہو۔

جہاں تک خدا کے وجود اور اس کی ایکتائی یعنی وحدت کا سوال ہے اس پر تو ان لوگوں کو بھی اتفاق ہے جو مشرک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خدا کو ایک ماننے کے باوجود وہ بہت سے خود ساختہ خداؤں کو پوجتے ہیں مگر قیامت اور آخرت کے وجوب پر ان کو شک ہے اور وہ طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔قرآن نے عقیدہ آخرت کی تفہیم کراتے ہوئے اس کے امکان اور وجوب پر واضح اور مسکت دلائل دئے ہیں جن کا ذیل میں مختصر مگر واضح طور پر جائزہ لیا جائے گا۔

آخرت کی ضرورت

وجوب آخرت کے سلسلے میں پہلا سوال ہے کہ آخرت کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق ہے جس کے تصرف میں پوری کائنات ہے اور اسے اختیار وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔اس آزادی کا اگر محاسبہ نہیں ہوگا تو خود انسان کے اندر جو شر کے داعیات ہیں اور باہر جو شر پسند قوتیں ہیں وہ اس زمین کو ظلم وفساد سے بھر دیں گے اور ان کو دبانے اور مٹانے کی جوجد وجہد خیر پسند قوتیں کررہی ہیں ان کی کوششیں بے معنی ہوجائیں گی کیوں کہ خیر وبد اور ظلم وانصاف اگر اپنے انجام کے اعتبار سے برابر اور بے نتیجہ ہوں گے تو ساری چیزیں اندھی قوتوں کا کھیل بن جائے گا اور کائنات کی معنویت ختم ہوجائے گی۔اس لئے اللہ نے تمام ملحدین اور مشرکین کی خام خیالیوں کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ اس کائنات کی تخلیق اور

اس میں انسان کی پیدائش دراصل ایک امتحان کی غرض سے کی ہے اور اس کے فکر وعمل کا حساب بھی لیا جائے گا اور اس کے مطابق اسے انعام اور سزا بھی دی جائے گی۔

ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ایک آدمی ہر طرح کے ظلم وفساد میں ملوث ہے اور کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں ہے۔ وہ ساری زندگی اپنے طاقت کا غلط استعمال کر کے مخلوقات کا استحصال کرتا ہے اور کوئی اس سے سوال نہیں کرتا۔ اسی طرح ایسے بہت سے لوگ ہیں جو نیکی اور تقویٰ کی زندگی گذارتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی سختی اور پریشانی میں گذرتی ہے بلکہ وہ ظالم وجابر لوگوں کے لئے تختہ مشق بنے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اگر یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظلم وانصاف، نیکی اور بدی سب برابر ہیں اور ان دونوں طرز عمل کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ نقصان۔

جن لوگوں کو اس کائنات کی صحیح حکمت کا علم واندازہ نہیں ہے وہ ماورائے مادہ کچھ سوچنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے وہ اکثر شر پسند قوتوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھی اور حمایتی بن کر اپنے مفادات کے حصول میں لگ جاتے ہیں اور اس طرح خود کو کامیاب ماننے لگتے ہیں اور کچھ لوگ فکر وخیال کی نئی نئی پگڈنڈیوں میں بھٹک کر سکون تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ موت کیوں آتی ہے اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ فکر وفلسفہ اور سائنس یہ سب مادی کائنات کی سرحد تک تو انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر اس سرحد کے اس پار کیا ہے اس کا اندازہ ان کو نہیں ہوتا۔ ان میں جو لوگ محتاط ہیں وہ تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا ہمیں معلوم نہیں ہے۔

جو لوگ ڈھیٹھ ہیں وہ کہتے ہیں کہ مر کے جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔ ہم خاک میں رل مل جائیں گے۔ اور جو لوگ تشکیک پسند ہیں وہ بہت ہی خود ساختہ توہمات گڑھ کر اسی میں لگے رہتے ہیں۔ قرآن نے یہ بتا دیا۔ یہ ساری باتیں فضول ہیں۔

قرآن کے مطابق یہ کائنات اور اس کائنات میں انسان کا وجود ایک خاص مقصد کے لئے ہے۔ اسی لئے اسے زندگی، قوت، فکر وفہم، گویائی، اختیار وآزادی دی گئی ہے۔ اس دنیا میں اسے بطور امتحان بھیجا گیا ہے جہاں اس کے تمام چھوٹے بڑے عمل کا محاسبہ ہوگا اور اسے اس کے عمل کا ایک

وقت مقررہ پر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جس کو آخرت کہتے ہیں۔اس طرح فکر ونظر کا جو جہاز بے لنگر تھا اس کو ایک لنگر ڈال کر اس کو استحکام عطا کیا گیا۔جب ایک بار آدمی عقیدہ آخرت کو تسلیم کر لیتا ہے تو اسے کائنات کی منطق سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کو فکر و عمل کا سرا مل جاتا ہے۔اس کے بعد وہ اطمینان قلب کے ساتھ اپنی اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے ایک ذمہ دار مخلوق کی طرح زندگی گذارتا ہے۔جن لوگوں کو یہ سرا نصیب نہیں ہوتا وہ تا عمر گمرہی کے شکار رہتے ہیں اور اپنے وجود اور کائنات کی حکمت سے نابلد رہتے ہیں۔اس لئے قرآن نے ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو عقیدہ آخرت کی تفہیم کرائی ہے تا کہ لوگ حقیقت نفس الامری سے واقف ہو کر اپنی زندگی کی سمت درست کر لیں۔آخرت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن سب سے پہلے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھاتا ہے کہ موت وحیات کی غرض کیا ہے۔قرآن سورۃ الملک (۶۷) آیت (۱) میں بتاتا ہے کہ موت وحیات ایجاد اس لئے کیا گیا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھا جائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے (۶۷:۱) اس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ موت وحیات کی غرض ہی یہ ہے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ زندگی ایک امتحان ہے اور جب امتحان لیا گیا ہے تو اس کا رزلٹ بھی نکالا جائے گا۔اس طرح آخرت امتحان کے انجام کو ظاہر کرنے کا دن ہے۔اس لئے قرآن نے اس کو یوم حساب، یوم تغابن وغیرہ ناموں سے پکارا ہے۔

قرآن نے آخرت کی ضرورت پر بھر پور تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

> منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے۔کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آکر رہے گی۔اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہوئی ہے اور نہ زمین میں، نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی، سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے اور یہ قیامت اس لئے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ہیں۔ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم۔اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لئے زور لگایا ہے۔ان کے لئے بدترین عذاب ہے۔(سبا۳۴:۳۔۵)

اوپر کی دو آیتوں میں منکرین کے خوش فہمیوں کی تردید کی گئی ہے اور اللہ کے علم وقدرت

کا اعادہ کیا گیا ہے پھر اس کے بعد قرآن نے قیامت کی غائت یہ بتائی کہ یہ اس لئے آئے گی کہ اللہ جزا دے اپنے مومن بندوں اور ان کو سزا دے جو اس کی آیات کو نیچا دکھانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جب نیک و بد برابر نہیں ہیں تو نیک و بد کا انجام بھی برابر نہیں ہوگا۔

جو لوگ آخرت کے وجوب کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل خدا کے علم کا، اس کی قدرت کا اور اس کی حکمت کا انکار کرتے ہیں اور اپنی خام خیالیوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ انہیں پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے سارے اعضا اور اجزا ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں رل مل جائیں گے تو ہم دوبارہ صحیح سالم وجود کے ساتھ کیسے پیدا کئے جاسکتے ہیں دوسرے ہمارے اعمال کا حساب کتاب کیسے ہوگا۔ وہ رکارڈ کہاں ہے اور کس کے پاس ہے۔ تیسرے اس حساب کتاب کا انجام کیا ہوگا اور اس کی غرض کیا ہے۔

ان تمام امور کا قرآن نے بہت واضح اور مسکت جواب دیا ہے۔ ہر وہ آدمی جو عقل و شعور رکھتا ہے نہ صرف اس جواب سے مطمئن ہوگا بلکہ اس پر یقین بھی کرے گا۔

قرآن پوچھتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کس نے کی؟ سب لوگ مانتے ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق اللہ نے کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے اور اس کو وجود سے عدم میں لے جاسکتا ہے تو کیا دوبارہ اسے اس عدم سے وجود میں نہیں لاسکتا۔ قرآن سوال کرتا ہے پہلے پیدا کرنا مشکل تھا یا دوبارہ پیدا کرنا۔ جو خدا اس پوری کائنات کی تخلیق کرسکتا ہے جس میں عظیم الشان تارے اور سیارے ہیں وہ کیا اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ انسان کو دوبارہ پیدا کرے۔ جو آدمی تھوڑی بھی عقل رکھتا ہے وہ مانے گا کہ یہ خدا کی قدرت سے قطعی بعید نہیں ہے۔ اب ایک آدمی اس امر کو تسلیم کرلیتا ہے تو پھر اس کے بعد ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اب خدا کب اور کیسے دوبارہ پیدا کرے گا۔ حشر و نشر کب برپا ہوگی ان سب باتوں پر قرآن نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس حساب کتاب کی غرض کیا ہے وہ بھی اس نے بتایا ہے۔ ہم یہاں چند آیات کا استحضار کر کے آخرت کی ضرورت پر روشنی ڈالیں گے کون انسانوں کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ اس نے بتایا ہے۔ قرآن اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو

بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش بھول جاتا ہے کہتا ہے ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں؟ اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی جس نے تمہارے لئے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں۔ جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جاؤ اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو (۳۶:۷۸۔۸۳)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بہت صاف اور سیدھے انداز میں حیات بعد الموت کی وضاحت کر دی ہے۔ کیسے ایک معمولی نطفہ سے وہ ایک صحیح سالم جسم والا مضبوط اور توانا انسان کی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ انسان ایک طرف اپنے نطفہ پر غور کرے اور دوسری طرف اپنے وجود پر تو تمام حقائق خود بخود روشن ہو کر اس کے سامنے آ جائیں گے۔ پھر وہ موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کے امکان سے جو لوگ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ تو انہیں جواب دیا جا رہا ہے وہی جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا۔ پھر وہ ایک تجربی اور ایک منطقی جواب دیتا ہے۔ تجربی مثال یہ ہے کہ کیسے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا ہوتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز میں جو خاصیت چاہے پیدا کر دے پھر وہ بتاتا ہے کہ جو خدا زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں ہوگا کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے۔ قرآن دوبارہ پیدائش کے بارے میں بتاتا ہے کہ یہ اللہ کے لئے بالکل آسان ہے اتنا ہی آسان کے وہ کہے گا ہو جا اور وہ ہو جائے گا۔ قرآن دو متعدد جگہ پر دوبارہ زندگی کو اس مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے ایک مردہ پڑی ہوئی زمین بالکل سوکھی اور بنجر ہوتی ہے مگر بارش پڑنے کے بعد وہ لہلہا اٹھتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔۔ قرآن امکان اور وقوع آخرت پر دلیل دینے کے بعد اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے کہ زندہ کرنے کا مقصد انسانوں کا حساب کتاب ہے اور

اس کے لئے اس کا پورا دفتر تیار ہے جس میں تمام انسانوں کے اقوال افعال درج ہیں۔ لہذا کسی کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ وہ رکارڈ کہاں اور کس کے پاس ہے جس کی بنیاد پر حساب کتاب ہوگا۔ قرآن واضح الفاظ میں مطلع کرتا ہے کہ:

> ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں، جو کچھ افعال انہوں نے کئے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔ (یٰسین ۳۶:۱۲۔۱۳)

قرآن کہتا ہے وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں۔ پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا اسی طرح ہوگا (۳۵:۹) قرآن امکان آخرت پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ آخرت کے امکان سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو خدا کی قدرت کاملہ پر یقین نہیں رکھتے اور دوسرے وہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں جبکہ وہ اگر غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کوئی دائمی جگہ نہیں ہے وہ بھی اور چیزوں کی طرح ایک وقت مقرر تک کے لئے ہے۔ ظاہری بات ہے ایک دن یہ لپیٹ دی جائے گی پھر قیامت کے دن دوبارہ اسے پھیلا کر حساب کتاب لے لیا جائے گا۔ یہ اتنی مشکل بات نہیں ہے جس کا سمجھنا ممکن نہ ہو۔

قرآن میں اللہ تعلیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

> لوگ دنیا کی زندگی کا ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ ہی غور وفکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان برحق اور ایک مقررہ مدت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ (۳۰:۷۔۸)

اس طرح آفاق وانفس کی متعدد شہادتوں اور مثالوں کے ذریعہ وقوع آخرت کے امکان اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے جس کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد خود ایک شخص پکار اٹھتا ہے کہ

ربنا ما خلقت هذا باطلا یعنی پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔

قرآن نے عقیدہ آخرت کے وقوع کی دو غرض بتائی ہے پہلی یہ کہ لوگوں کا ان کے فکر و عمل کے مطابق محاسبہ ہو اور پھر اس کی بنیاد پر ان کی جزا یا سزا کا تعین ہو۔ اور دوسری یہ کہ جن امور میں لوگ دنیا میں اختلاف کر رہے ہیں اور یہاں ان کا کوئی حل نہیں نکل رہا ہے ان کو حتمی طور پر بتایا جائے کہ حقیقت کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اس طرح آخرت ان اختلاف کے نبٹارے کا بھی دن ہوگا۔ قرآن نے اس کو اس طرح واضح کیا ہے۔

> جو لوگ ایمان لائے اور یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا۔
>
> (الحج ۲۲:۱۷)

اس مضمون پر آگے دلالت کرتے ہوئے اللہ نے بتایا کہ یہ ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے اور اس دن منکرین کا جھوٹ واضح ہو جائے گا۔ امکان آخرت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قدرت کاملہ کی گرفت ہے۔ اسے جب کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرنا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

> یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا۔ اٹھائے گا کیوں نہیں۔ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول کر دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے (رہا اس کا امکان) تو ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں ہو جا اور بس ہو جاتی ہے۔
>
> (۱۶:۳۹۔۴۰)

قرآن وجوب آخرت کے امکان پر حتمی بحث کرتے ہوئے انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی زندگی مختلف مراحل کو بطور دلیل پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسے دوبارہ اٹھانا اس کی قدرت

کاملہ کے عین مطابق ہے جس میں کسی تعجب یا ہتک کی ضرورت نہیں ہے۔قرآن کے الفاظ میں۔

لوگوں اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تا کہ تم پوری جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکا یک وہ بھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی، اس میں شک کی گنجائش نہیں۔اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔(الحج ۲۲:۵۔۷)

اس طرح عقیدہ آخرت کی ضرورت اس لئے کہ

(۱) لوگوں کے درمیان انصاف ہو

(۲) لوگوں کو ان کے فکر و عمل کا جو پورا اور صحیح صحیح بغیر کسی ظلم کے بدلا ملے۔

(۳) لوگ اپنے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جزا اور سزا پائیں

(۴) تمام اختلافی امور کا حتمی فیصلہ ہو جائے۔

جہاں تک اس کے امکان کا سوال ہے تو

(۱) یہ خدا کی قدرت کاملہ کے عین مطابق ہے

(۲) اس کی طرف سے مقرر کردہ ضابطے کے تحت ہے

(۳) انسان کے مقام و مرتبہ کا عین مقتضی ہے۔

لہذا اس کے وقوع اور وجوب میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے۔

قرآن آخرت کے دلائل کے باب میں دو اور باتیں بتائی ہیں۔ایک یہ کہ اللہ نے دنیا میں ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔اسی طرح دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔اس طرح دنیا اور آخرت دونوں مل کر ہی کائنات کی تکمیل ہوتی ہے۔دوسری بات اس نے یہ بتائی کہ یہ پوری کائنات جو تمہاری نظروں کے سامنے ہے یہ ایک وقت مقرر تک کے لئے اس کے بعد یہ سب ختم ہو جائیں گے۔اس لئے اپنی حیات اور اس کائنات کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ تباہ کن ہوسکتا ہے۔لہذا آدمی کو ہوشیار رہنے کی ضرورت۔اسی مقام پر اسے رسول اور کتاب کی ضرورت ہے۔اس ضرورت کی تکمیل اللہ نے کر دی ہے۔اس لئے انسان اپنی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں سے باہر آ کر حقائق کو تسلیم کر لے اور اپنی زندگی اس کے مطابق گذارے کیونکہ بہرحال اسے اپنے کئے کا حساب دینا ہوگا۔

قرآن کا واضح اور صریح اعلان ہے۔

> کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے۔بہت برے کلمے ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لئے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دے دیا جائے۔جن لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔
>
> (الجاثیہ۴۵:۲۱،۲۲)

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت وخلاقیت نظام کائنات کی اندرونی شہادت ،خود انسان کا وجود اور دنیا میں نیکی اور بدی کا تصور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت کا وقوع اور وجوب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے ورنہ وہ آدمی جو اس کا منکر ہے دائمی خسارے میں رہے گا اور جو لوگ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی گذارتے ہیں انہیں بھی اپنا مسلسل احتساب کرتے رہنا چاہئے کیونکہ عقیدہ کے مطابق عمل نہیں ہوگا تو یہ بھی خسارے کا معاملہ ہوگا۔لہذا منکرین اور مومنین دونوں کو یہ عقیدہ متنبہ کرتا ہے کہ زندگی کو اس کے معاملات ومسائل کو،حاصل شدہ رزق اور وسائل کو پورے شعور اور ذمے داری کے ساتھ برتنے

کا اہتمام کریں کیونکہ وہاں ہر نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا (۱۰۲:۸) اور ذرے ذرے کا حساب ہوگا۔(۹۹: ۷۔۸)

منکرین آخرت کا استدلال اور اس کے محرکات

اسلام کے تین بنیادی عقائد توحید ،آخرت اور رسالت میں آخرت کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔یہی وہ عقیدہ ہے جس سے اس کائنات کی معنویت ظاہر ہوتی ہے۔اگر یہ عقیدہ نہ ہوتو پوری کائنات ایک فعل عبث کے سوا اور کچھ نہیں۔ بلکہ اس عقیدے کے انکار کے بعد خود خدا کا اقرار بے معنی ہوجاتا ہے بلکہ اس حد تک لغو معلوم ہوتا ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ایک شخص جب آخرت کا انکار کرتا ہے تو وہ دراصل صرف زندگی بعد موت ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ وہ خدا کی قدرت،اس کی حکمت اس کی صفت عدل کا انکار کرتا ہے۔آخرت کے انکار کے بعد خدا کا تصور محض ایک ایسی عاجز و درماندہ ذات کے تصور کے طور پر ابھرتا ہے جس کو اپنی تخلیق پر کوئی کنٹرول نہیں ہے جو کچھ تخلیق یا عمل اس سے سرزد ہوا وہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھالہذا اب وہ اس پر مطلق قادر نہیں ہے کہ وہ اس کائنات کو توڑ پھوڑ کر پھر سے دوبارہ قائم کر سکے۔یہ ایسا مجہول تصور ہے کہ جو شخص بھی خدا کو قادر مطلق ہستی کی حیثیت سے مانتا ہے اس کے لئے یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جو لوگ خدا کی اس حیثیت کے منکر ہیں وہ نہ تو خدائے واحد کی معرفت رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ قادر مطلق ہونے کا مفہوم جانتے ہیں۔لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ تاریخ کے ہر دور میں جب کبھی بھی کوئی نبی آیا اور اس نے آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی تو قوم کی قوم بوکھلا اٹھی اور طرح طرح کے استدلال کے ذریعہ آخرت کا انکار کیا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کے لائق ہے کہ منکرین آخرت،آخرت کا انکار کسی علمی دلیل، تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر نہیں کرتے تھے بلکہ ایک گمان محض تھا جس کی بنیاد پر وہ انکار کرتے۔وہ دیکھتے کہ جب کوئی انسان مرجاتا ہے تو مرکر مٹی میں اس طرح رل مل جاتا ہے کہ پھر اس کی ہڈیوں کا پتہ لگانا بھی مشکل ہوجاتا ہے ایسی صورت میں ان کے لئے یہ امر محال تھا کہ جب ایک شخص اس طرح مرکر مٹی ہوجائے گا تو پھر آخر کار وہ کیونکر صحیح وسالم جسم کے ساتھ اٹھایا جاسکتا ہے۔چونکہ وہ

خدا کی قدرت کی صحیح معرفت نہیں رکھتے وہ ایک قیاس ناقص کی بنیاد پر یہ حکم لگاتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد کوئی آخرت نہیں اور ہم ہرگز دوبارہ نہیں اٹھائے جائینگے ۔اس دلیل کو مزید تقوت پہنچانے کے لئے وہ ایک خام دلیل بطو Empirical evidence کے پیش کرتے ہیں کہ جو انسان مرتا ہے ،جو لوگ آج سے کروڑوں سال پہلے مرے ان میں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔اور اس طرح ان خام دلیلوں کی بنیاد پر وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں اور اس کے اقرار کی دعوت دینے والے نبیوں کو مجنون یا جھوٹا تصور کرتے ہیں۔

قرآن نے جگہ جگہ ان کے ان استدلال کا ذکر کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منکرین آخرت کیسی بدگمانی ،ناقص فہم ،کیسی گمرہی میں مبتلا ہیں اور خدا وآخرت کے بارے میں ناقص گمان رکھتے ہیں۔

قرآن منکرین آخرت کو اصولی حیثیت سے دو گروہوں میں بانٹتا ہے۔ایک بہت ہی قلیل گروہ وہ ہے جو ذہن کے کسی گوشے میں یہ ہلکا سا گمان رکھتا ہے کہ ممکن ہے ہم پھر مر کر زندہ کئے جائیں یا آخرت برپا ہو،لیکن ان کا یہ گمان اتنا ہی کمزور ہے کہ وہ اس بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے تیار نہیں ہیں چنانچہ ان کے عملی رویہ میں اس شخص کے بالمقابل جو سرے سے ویسا کوئی گمان بھی نہیں رکھتا کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لہذا انجام کے طور وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں جس انجام سے آخرت کا ایک کٹر منکر ہوگا۔قرآن نے اس قلیل گروہ کا صرف ایک جگہ سورہ جاثیہ آیت ۳۲ میں اس انداز سے تذکرہ کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِى مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (الجاثیہ ۳۲)

ترجمہ: اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے،ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں۔یقین ہم کو نہیں۔

یہاں ایک بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ گمان کبھی علم کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا لہذا کسی گمان کی بنیاد پر کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔کفار مکہ یا منکرین آخرت کا سب سے بڑا جرم یہ

تھااور ہے کہ وہ اس گمان پر ایک قطعی حکم لگاتے ہیں کہ آخرت کا آنا ناممکن ہے اوران کا دوبارہ اٹھایا جانا ایک امر محال اس لئے وہ اس شخص کو جس کے جھوٹا اور مجنون ہونے کا کوئی ثبوت وہ فراہم نہیں کر سکتے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹا اور مجنون کہتے ہیں تا کہ وہ لوگ جوان سے اب تک صحیح طور پر واقف نہیں ہیں بدگمان ہو جائیں اور انکار کی روش اختیار کر کے ان کے ہم مشرب بن جائیں ۔چونکہ اللہ نے فیصلے کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی علم کسی انسان کو نہیں دیا گیا ہے اس لئے وہ اور بھی بدگمانی میں مبتلا ہوتے چلے گئے اورانہوں نے اس عقیدہ اور خیال کو افسانہ ہائے پارینہ سمجھنا شروع کیا کیونکہ ہر نبی نے اپنی قوم کو اس بنیادی عقیدے کی دعوت دی اوراس آنے والے دن سے ڈرایا۔وہ یہ دیکھتے تھے کہ ایک زمانہ قدیم سے اس بات کا اعلان کیا جارہا ہے کہ آخرت ہوگی ،قیامت قائم ہوگی اورانسانوں کوان کے اعمال کے مطابق سزا وجزا دی جائے گی لیکن ان میں سے اب تک کچھ بھی نہیں ہوالہذا وہ ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ۔

قَالُوْا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۸۲) لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۸۳) المومنون.

ترجمہ: وہ کہتے کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہے۔

منکر آخرت کے اس تعجب اور خام خیالی پر اللہ تعالیٰ اظہار تعجب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ (الرعد.۵)

اور تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔

یہاں رب سے کفر کرنے والے سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو سرے سے خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی قدرت وحاکمیت کا صحیح احساس نہیں رکھتے اسی لئے وہ

نادانی اور جہالت میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے ۔ چنانچہ اگر ان کو خدا کے قادر مطلق ہونے اور اس کے زبردست وحکیم ہونے نیز اس کے صاحب عدل ہونے کا احساس ہوتا تو وہ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکالتے ۔ غالبا سورہ جاثیہ آیت ۳۲ میں جن لوگوں کا تذکرہ اس حیثیت سے آیا ہے وہ بس ایک گمان سا رکھتے ہیں وہ کچھ اس قسم کے مدعیان توحید ہیں ۔

منکرین آخرت اصولی حیثیت سے دو گروہ میں تقسیم ہیں ایک وہ جو خدا پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن اس کی صفات کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے گمان میں مبتلا ہیں ۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو سرے سے خدا کو تسلیم نہیں کرتا لہذا آخرت کو بعید از عقل وامکان سمجھتا ہے ۔ اس کے نزدیک انسان کی زندگی اور موت محض گردش ایام کا نتیجہ ہے ۔ یہ کائنات اور اس کا نظام کسی حکمت کا متقاضی نہیں ہے لہذا آخرت کی فکر تو کیا اس کا خیال بھی محض فلسفیانہ اور سفلی ذہن کی پیداوار ہے ۔ اس کے نزدیک انسان کی زندگی کی مثال اس گھڑی جیسی ہے جو حرکت کر رہی ہو اور موت جیسے یہ گھڑی چلتے چلتے رک جائے ۔ ان کا یہ گمان محض اس وجہ سے ہے کہ وہ حقیقت کا علم نہیں رکھتے ۔ جب ان سے ان کے گمان کے ثبوت میں کوئی واضح دلیل لانے کو کہا جاتا ہے تو وہ جھٹ بول اٹھتے ہیں ''اٹھالاؤ ہمارے باپ داد کو اگر تم سچے ہو'' ۔ ان کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۲۴) وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵) سورہ جاثیہ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے ۔ یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو'' درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں ۔ اور جب ہماری واضح آیات، جو آخرت پر دلالت کرتی ہیں انہیں سنائی جاتی ہے تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو ۔

چنانچہ ایسے دہریے اور منکر آخرت لوگ مذاقا یہ بات کہتے ہیں ۔

يَقُوْلُوْنَ ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ (۱۰) ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً

(۱۱)قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ (۱۲)

یہ لوگ کہتے ہیں کیاواقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لوٹیں گے ۔کیاجب ہم کھوکھلی بوسید ہڈیاں بن چکے ہونگے ۔کہنے لگے یہ واپسی بڑے گھاٹے کی ہوگی۔

قرآن نے ان کے اس تعجب اورحیرت نا کی کوبار بارمختلف انداز سے پیش کیاہے اور پوری قطعیت کے ساتھ فرمایایقیناً اگلے اورپچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جائینگے جس کا وقت مقرر ہے۔چنانچہ سورہ الواقعہ آیت ۴۷تا۵۰ میں ارشادہوا ہے۔

وَکَانُوْا یَقُوْلُوْنَ اَءِ ذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا اَئِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۴۷)اَوْ آبَاؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۴۸) قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ (۴۹)لَمَجْمُوعُوْنَ اِلٰی مِیقَاتِ یَوْمٍ مَعْلُوْمٍ (۵۰) واقعہ

اور وہ کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرکر خاک ہوجائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر بن کررہ جائیں گےتو پھراٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اورکیاہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائینگے جو پہلے گذر چکے ہیں (اے نبیؐ) ان لوگوں سے کہو یقیناً اگلے پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔

اس طرح عقیدۂ آخرت کے انکارکی ان کےنزدیک تین وجوہات تھیں اور ہیں۔اولاً وہ اس کوایک ناممکن شےاورنا قابل فہم عقیدہ سمجھتے تھےاور ہیں۔یہ اس وجہ سے کہ خدا کے متعلق ان کا تصور انتہائی ناقص اورحددرجہ لغو تھا۔دوم وہ اس کا بھی ثبوت چاہتے تھے ۔وہ اس عقیدے کی تردید میں کہا کرتے تھے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَیَقُوْلُوْنَ (۳۴)اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ (۳۵)فَاْتُوا بِآبَائِنَا اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (۳۶)الدخان

یہ لوگ کہتے ہیں ’’ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔اگر تم سچے ہوتو اٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو۔

یہ دراصل ان کی سب سے قوی دلیل تھی حالانکہ سراسرمہمل تھی۔آخران سے یہ کس نے کہا تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہوکراس دنیامیں آنے والے ہیں اور نبیؐ اورکسی مسلمان نے کب

یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔

ایک تیسری دلیل وہ یہ دیتے کہ یہ سب اساطیر الاولین یعنی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ چونکہ عقیدہ توحید دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور تمام انبیاء نے اس کی دعوت یک زبان ہو کر دی ہے اس لئے قدیم زمانے سے لوگ یہ سنتے اور کہتے چلے آ رہے ہیں کہ آخرت ہوگی اب جب کہ اس پر ایک زمانہ گذر گیا اور وہ چیز اب تک وقوع پذیر نہیں ہوئی تو عاجلہ پسند طبیعتیں سمجھ بیٹھیں کہ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں اور فرسودہ کہانیاں ہیں حالانکہ اس دعویٰ کا ایک قدیم زمانے سے دنیا کے سچے انسانوں اور صاحب صدق وصفا شخصیتوں کے ذریعہ پیش کیا جانا ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ بات عین حق ہے یہ کوئی قیاسی اور فرسودہ باتیں نہیں ہیں۔ لیکن ہٹ دھرمی کا کوئی جواب نہیں۔ ایک صالح والدین کے ذریعہ قرآن میں ایک مکالمہ نقل ہوا ہے جس میں ایک باپ نے اپنے بیٹے کو عقیدہ آخرت کو تسلیم کرنے کی دعوت دی لیکن وہ اسے اگلے وقتوں کی کہانیاں کہہ کر رد کر دیتا ہے ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَا اَتَعِدَانِنِیْ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ وَهُمَا یَسْتَغِیْثَانِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَافَیَقُوْلُ مَا هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (17)

اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا اف تنگ کر دیا تم نے کیا تم مجھے خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد پھر قبر سے نکالا جاؤں گا۔ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گذر چکی ہیں ان میں سے تو کوئی اٹھ کر نہیں آیا ماں باپ نے اللہ کی دوہائی دیتے ہوئے کہا ارے بدنصیب مان جا اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر وہ کہتا ہے یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔

(سورہ احقاف۔۱۷)

ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فیصلہ سناتا ہے انھم کانوا خاسرین ۔ بیشک یہ گھاٹے میں جانے والے لوگ ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ منکرین آخرت اپنے انکار کے سلسلے میں کوئی واضح دلیل نہیں رکھتے ساتھ ہی ساتھ اس معاملے میں ان کے مختلف گروہوں میں

سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ تمام لوگ ایک گمان محض کی پیروی کرتے ہیں اس لئے کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے جس پر سب کا اتفاق ہو۔

ان کے انکار کا سب سے بڑا محرک یہ ہے کہ وہ چھوٹ چاہتے ہیں۔ آخرت کا اقرار آدمی پر کچھ پابندی عائد کرتا ہے وہ کچھ اخلاقی اصولوں کی بجا آوری لازمی قرار دیتا ہے اور خدا کی شریعت کا کامل اتباع کا مطالبہ کرتا ہے بالفاظ دیگر ایک ذمہ دار مخلوق ہونے کی حیثیت سے خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہے اور عقیدے کی شکل میں ایک ایسا غیر محسوس سپاہی اس کے نہاں خانہ دل میں بٹھا دیتا ہے جو ہر دن اس کو حدود اللہ کا پابند رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اور بندگی نفس سے روکتا ہے لہذا منکرین آخرت یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو مان لینے سے ہماری ساری آزادیاں ختم ہو جائیں گی اور دنیا کی زندگی میں کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ چنانچہ قرآن سورہ القیمہ آیت ۵۔۶ میں ان کے اسی نفسیاتی کمزوری پر گرفت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵) يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (۶)

مگر انسان چاہتا ہے کہ کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن۔

ان کے منکر آخرت ہونے کی دوسری وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ چنانچہ سورہ السجدہ آیت ۱۰ میں ارشاد ہوا۔

وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (۱۰)

اور یہ لوگ کہتے ہیں جب ہم مٹی میں رل مل چکے ہونگے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

وہ اپنے رب کی ملاقات کے کیوں منکر ہیں اس کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے ''یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو'

لہذا وہ اس کائنات میں کسی قادر مطلق ہستی کی قدرت وحکمت کے قائل ہی نہیں ہیں اور

اسی چیز نے انہیں فکر وعمل کی گمراہیوں میں مبتلا کر دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ وقوع آخرت کو قطعی خلاف عقل بعید از امکان سراسر دیوانگی بلکہ قابل مضحکہ سمجھتے ہیں اور لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ(۷)اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ(۸)سبا

منکرین لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کرائے جاؤ گے۔ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گڑھتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے۔

لہذا یہی وہ استدلال ووجوہات ہیں جن کی بنا پر منکرین آخرت کا انکار کرتے ہیں اور اپنے گمان کو علم کا نام دے کر قطعیت کے ساتھ آخرت کے نہیں ہونے کا حکم لگاتے ہیں حالانکہ اگر علمی حیثیت سے وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کے مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہیں ہے اس سلسلے میں ہمیں واضح علم وحی کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے جس کے لئے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن رسالت کے اقرار وانکار کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

منکرین آخرت کی خصوصیات اوران کا عملی رویہ

درخت اپنے بیج سے پہچانا جاتا ہے، جیسی بیج ہوتی ہے اسی لحاظ سے پھول اور پھل آتے ہیں۔عقیدہ بھی ایک بیج کی طرح ہے۔جیسا عقیدہ ہوگا اسی طرح انسان کی سوچ، اخلاق اور اعمال ہوں گے۔عقیدہ اور فکر سے نہ صرف انسان کے اخلاق کردار پر اثر پڑتا ہے بلکہ اس سے اس کی تہذیب ومعاشرت، تمام تر تمدنی ادارے، معیشت وسیاست اور بین الاقوامی تعلقات سب متاثر ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے شخصیت اور کردار کی تعمیر میں عقیدے کی کلیدی اہمیت ہے۔جس طرح آنکھ والا اور بے آنکھ والا، عالم اور جاہل، سیاہ اور سفید ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح ایک آدمی جو عقیدۂ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور جو اس پر یقین نہیں رکھتا ہے وہ دونوں اپنے فہم وکردار، اخلاق

معاملات میں ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔

قرآن نے جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کی کیا خصوصایات ہیں اور ان کا عملی رویہ کیا ہے اس کی نشاندہی کی ہے تا کہ ایک شخص اچھی طرح واقف ہو جائے کہ آخرت کے انکار سے ایک فرد کی زندگی میں کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور اس کے فکر و اخلاق کی کیا صورت رہتی ہے۔

(۱) شرک کا دلدادہ

قرآن نے منکرین آخرت کی سب سے بڑی خصوصیت کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شرک میں پوری طرح ڈوبے اور سرمست ہوتے ہیں۔ جب اکیلے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل کڑھتے ہیں اور جب خدا کے ساتھ دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے چہرے کھل اٹھتے ہیں قرآن اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتاتا ہے۔

> جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں۔ اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر آتا ہے تو یکا یک خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ کہو خدایا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے حاضر اور غائب کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ (الزمر (۳۹:۴۵۔۴۶)

اس طرح انکار آخرت اور شرک لازم و ملزم ہیں۔ یہ محض ایک نظری بات نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے مشرکین کا رویہ اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ شرک میں مبتلا ہونے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ایک آدمی آخرت کا انکار کرتا ہے اور اپنی دنیوی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس لئے جو اس کی دنیوی زندگی میں کسی درجہ میں بھی مددگار یا مفید معلوم ہوتا ہے اس کے سامنے بہت جلدی اور بڑی آسانی سے سر جھکا دیتا ہے اور پھر اس کی ستائش اور پرستش میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ خدائے واحد کا خیال بھی نہیں آتا بلکہ اللہ کو چھوڑ کر نہ جانے کن کن چیزوں کو پوجتا ہے اور اس پر اس کو ٹوکا جاتا ہے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسی نفسیاتی جال میں پھنسا ہوتا ہے جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا اور اسی کو حقیقت نفس الامری سمجھ کر اس میں مگن رہتا ہے یہاں تک کے کسی بتانے

اور ڈرانے والے کی بات چاہے کتنی ہی معقول ہو اور کیسی دلسوزی کے ساتھ کہی گئی ہو اسے مان کر نہیں دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکار آخرت کرنے والے بالعموم مشرک ہوتے ہیں۔ اب وہ شرک کی وجہ سے انکار آخرت کرتے ہیں یا انکار آخرت کی وجہ سے شرک کرتے ہیں یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں عقائد ایک دوسرے کا تکملہ ہین اس لئے جہاں انکار آخرت ہے وہاں شرک کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔

(۲) انبیاء کا منکر

منکرین آخرت نہ صرف خدا کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس سلسلہ ھدایت کے بھی منکر ہیں جسے اللہ نے انسانوں کی ھدایت کے لئے قائم کیا ہے اور وہ اس باب میں جس طرح کے دلائل دیتے ہیں اس سے ان کی سفلی ذہنیت اور ان کا اوچھاپن واضح ہوجاتا ہے۔ ایک سیدھی بات یہ ہے کہ انسانوں کی ھدایت کے لئے انسان نہیں آئے گا تو کون آئے گا اور اگر وہ انسان ہوگا تو اس کی انسانی خصوصیات بھی ہوں گی۔ یہ کوئی تعجب کی بات تو نہیں۔ یہ دیکھنے کے بجائے کے پیغام بر کون ہے یہ دیکھنا چاہئے کہ پیغام کیا ہے؟ اور اس کے میرٹ اور منطق کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنا چاہئے نہ کہ اس کی شخصی حیثیت اور حسب ونسب۔ دراصل انبیا کا انکار اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انبیا جس نظام عقیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اور جس جوابدہی کی خبر دیتے ہیں اس کو ماننے کے بعد نفس پرستی کی آزادی ختم ہوجاتی ہے اور اسے خدا کے احکام کا پابند ہونا ہوتا ہے جو بہت سے لوگوں کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ لہذا وہ انبیا کا انکار کرکے اس پورے معاملے سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ مگر انہیں خبر نہیں کہ جو حقیقت ہے وہ ہمیشہ رہے گی اور کسی کی خوشگمانی سے وہ ٹل نہیں سکتی ہے بلکہ اپنے وقت مقرر پر جس کا آنا طے ہے جس کا علم صرف خدا کو ہے، واقع ہوکر رہے گی۔ قرآن نے انکار انبیاء کی ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

> پھر ان میں خود انہیں کی قوم کا ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا جن کو دنیا کی زندگی میں ہم نے

آسودہ کر رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے میں ہی رہے۔ یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے بعید بالکل بعید ہے۔ یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کچھ نہیں بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ رسول نے کہا پروردگار ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے اس پر اب تو ہی نصرت فرما جواب میں ارشاد ہوا قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ (المومنون ۲۳: ۳۲۔۴۰)

ان آیات میں پوری حقیت واضح کر دی گئی ہے۔ انکار آخرت انکار توحید اور انکار رسالت دونوں کو مستلزم کرتا ہے اور جب ایک شخص خدا اور اس کے رسول کا انکار کر دے پھر آخرت کے اقرار کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ ظاہر سی بات ہے آخرت تو ایک خبر ہے اور یہ خبر رسول کے ذریعہ دی جا رہی ہے اب اگر رسول کا ہی انکار کر دیا جائے گا تو فطری طور پر اس کے ذریعہ دی گئی خبر کا بھی انکار ہے۔ اس انکار کے پیچھے ذہنیت اور دلیل کیا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا بالکل بعید ہے۔ دوسری زندگی بس دنیا کی زندگی ہے اور ایک فطری نظام کے تحت زندگی اور موت ہوتی ہے۔ یہاں قرآن نے ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ عقیدہ آخرت اور رسول کا انکار کرتے ہیں وہ آسودہ حال اور خوش حال لوگ ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خوشحالی کی وجہ سے وہ جس غیر ذمہ دارانہ زندگی کے عادی ہیں رسول اور آخرت کو ماننے کے بعد اس پر روک لگے گی دوسرے ان نعمتوں کو پانے کے بعد اتنا مگن ہیں کہ انجام پر غور کرنے کی نہ فرصت ہے اور نہ ضرورت محسوس کرتے ہیں بلکہ توجہ دلانے کے بعد بھی اس کو حقارت سے ٹال دیتے ہیں۔ اس طرح انکار آخرت نفسیاتی اور عملی سطح پر گوناگوں کیفیات، طرز فکر اور طرز عمل پیدا کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا اہم اور اساسی تصور ہے جس کے ماننے اور نہ ماننے سے آدمی کے پورے فکر و کردار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بہرحال قرآن کے بقول منکرین آخرت مشرک ہونے کے ساتھ منکر رسالت بھی ہوتے

ہیں۔

(۳) حق سے پھرا ہوا

قرآن جو لوگ عقیدہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ حیات وکائنات کے بارے میں مختلف الخیال ہیں ان کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ حق سے پھرے ہوئے لوگ ہیں کیونکہ ایک تو خود ان کو صحیح بات کا علم نہیں ہے دوسرے جب وحی اور رسالت کے ذریعہ انہیں اس کی خبر دی جارہی ہے تو ماننے کو تیار نہیں ہیں واضح ہے کہ ان کے اندر حق پسندی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کا قیاس وگمان رکھتے ہیں اور غفلت میں پڑے ہوتے ہیں۔قرآن کے بقول۔

> حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے۔قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۔ مارے گئے قیاس وگمان سے حکم لگانے والے جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں۔(الذاریت۔۵۱:۵۔۱۰)

لہذا جزائے اعمال سے غفلت کی ٹھوس علم کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ایک قیاس وگمان ہے ظاہر ہے وحی الٰہی کے آجانے کے بعد جس کا برحق ہونا عقل ونقل ہر طرح سے ثابت ہے پھر اس سے منہ موڑنا حق سے حد درجہ برگشتگی کی علامت ہے جو انکار آخرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔

(۴) حد سے گذرنے والا بدعمل

جو لوگ منکر آخرت ہیں اور کسی حساب کی توقع نہیں رکھتے ہیں(۲۷:۷۸) ان کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بتایا کہ وہ حد سے گذرنے والا اور بدعمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عقیدۂ آخرت کا انکار کرتا ہے اور اسے اگلے وقتوں کی کہانیاں قرار دیتا ہے۔قرآن کے الفاظ میں۔

> تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لئے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گذر جانے والا بدعمل ہے اسے جب ہماری آیات

سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ دراصل
ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔
(المطففین (۸۳:۱۴۔۱۵)

اس آیت میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا جس کی وجہ سے حد سے گذرنے اور بدعملی کرنے مین انہیں مزہ آتا ہے اور چونکہ وہ منکر آخرت ہیں اس لئے بے روک ٹوک گمراہی کے راستے پر دوڑے چلے جارہے ہیں۔

(۵) اللہ کی رحمت سے مایوس

قرآن کریم میں آخرت کی ایک زبردست نفسیاتی کیفیت کا ذکر آتا ہے جب وہ حیات بعد موت اور اللہ سے ملاقات کی کوئی امید نہیں رکھتے ہیں کہ اللہ سے ان کو کوئی توقع بھی نہین ہے۔ وہ خدا کی رحمت اور مغفرت کے جذبے سے خالی بلکہ مایوس ہیں تبھی تو اس طرح کا طرز فکر رکھتے ہیں اور اللہ کی آیات اور اور اس سے ملاقات کو جھٹلاتے ہیں قرآن کے مطابق۔

جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت
سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ (العنکبوت (۲۹:۲۳)

اس طرح قرآن نے ان لوگوں کی خصوصیات گنائی ہیں جو منکر آخرت ہیں۔ وہ شرک کے دلدادہ ہوتے ہیں، رسولوں کا انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ حق سے پھرے ہوئے ہوتے ہیں، حد سے گذرنے والے بدعمل اور خدا کی رحمت سے پوری طرح مایوس ہوتے ہیں۔ آپ اگر سابقہ قوموں کی تاریخ اور موجودہ منکرین آخرت کے ذہن ونفسیات اور طرز فکر وعمل کا جائزہ لیں گے تو یہ کردار آپ کو ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آجائیں گے۔ یہ تو تھی ان کی ذہنی وفکری خصوصیات اب میں آپ کے سامنے قرآن نے منکرین آخرت کے عملی رویہ کا جس طرح ذکر کیا ہے اس کا جائزہ پیش کروں گا تاکہ ان کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کا سیرت وکردار بھی پوری طرح واضح ہوکر سامنے آجائے۔

منکرین آخرت کا عملی رویہ

اللہ کی وحدانیت اور وقوع آخرت پر ایمان آدمی کی فکر و عمل شخصیت اور کردار میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جب کہ اس کے انکار سے اس کے فکر، عمل کردار اور شخصیت میں منفی اثرات پیدا ہوتے ہیں بالخصوص حق کے معاملے میں اس کا رویہ حد درجہ منفی ہوتا ہے۔قرآن نے انکار آخرت کے نتیجہ میں منکرین کا جو عملی رویہ ہے اس کی نشاندہی کی ہے جس کا ایک مختصر مطالعہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

(۱) تشکیک

قرآن کے بقول چونکہ منکرین خدا سے ملاقات میں شک رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ قرآن کی دعوت کو مان کر نہیں دیتے۔اس شک کی بنیاد کوئی حقیقی علم نہیں ہے بلکہ گمان محض ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

> عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے (حم السجدہ (۴۱:۵۳۔۵۴)

جب آدمی شک میں مبتلا ہوتا ہے تو آنکھوں دیکھی حقیقت پر بھی یقین کرنے میں تامل کرتا ہے جبکہ اس کے سامنے جو شواہد ہیں اس سے پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔مگر چونکہ اس کو رب سے ملاقات میں شک ہے اس وجہ سے وہ ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور یہ رویہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کردار کی بنیادی خصوصیت بن جاتی جس کی وجہ سے وہ حق کا لگاتار انکار کرتا رہتا ہے۔

(۲) تکبر

تکبر اطاعت اور سپردگی کے خلاف ہے۔یہ ایک شیطانی صفت ہے۔ابلیس نے اسی تکبر کی بنا پر اللہ کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔جس فرد کے اندر تکبر پیدا ہو جاتا ہے وہ حق سے بہت

دور نکل جاتا ہے اور اس کا نفس کسی حق بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔فرعون میں تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا تھا اور ان پر مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ اللہ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجا تو نہ صرف اس نے حقارت سے ان کی دعوت ٹھکرادی بلکہ ان کی قتل کے درپے ہوگیا۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی جو بات کہلوائی ہے اس سے ایک منکر حق کی ذہنیت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔قرآن کے الفاظ میں۔

موسیٰ نے کہا، میں تو ہر متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا ہے اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے۔(المومن۔۴۰:۲۷)

اس آیت میں صاف کہا گیا کہ ایک شخص تکبر کی بنا پر ہی یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔اس طرح اس کے اندر کا تکبر اس کو قبول حق اور اطاعت الٰہی سے باز رکھتا ہے چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کے سامنے جوابدہی نہیں کرنی ہے۔لہذا وہ اپنے قوت اقتدار، دولت، علم، جسمانی قوت عددی برتری اور ہر وہ چیز جو اس نفس کو موٹا کرتی ہے کی بنا پر متکبر اور جبار بن کر زندگی گذارتا ہے۔تکبر ہی اسے جبار بناتی ہے آپ دنیا بھر کے مشرکین کو دیکھیں گے کہ ان کے اندر کبر اور جبر کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو لازماً انکار آخرت کا نتیجہ ہے۔

(۳) عاجلہ پسندی

منکرین آخرت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان اندر عاجلہ پسندی بہت ہوتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ جس چیز کی خبر دی جارہی ہے وہ جلد واقع ہوجائے تب وہ اس کو مانیں گے۔ان کو صاف صاف اور کھول کھول کر بتایا جارہا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو ایک وقت مقرر تک کے لئے وجود بخشا ہے پھر اس کے بعد وہ اس کو لپیٹ دے گا اور پھر دوبارہ اس کو جلا اٹھائے گا اور تب حساب لے گا۔اس درمیان اپنی حیات ولمحات کو اللہ کی اطاعت میں گذارنے کا حکم دیا جاتا ہے کہ جب خدا کے حضور حاضری ہو تو تم کامیاب ہو۔مگر آدمی اپنے اندر صبر نہیں پاتا اور خوش گمانیوں میں جینا چاہتا ہے۔حالانکہ خود اس کی مدت حیات بہت محدود ہے، مگر وہ چاہتا ہے کہ جب وہ دنیا سے رخصت

ہوں حساب کتاب ہو جائے تب وہ اس حقیقت کو مانے گا۔مگر اللہ نے اپنی حکمت سے اس کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔لہذا قیامت کے لئے جلدی مچانے کے بجائے اپنے ایمان اور عمل کی فکر کرنی چاہئے۔چونکہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس لئے وہ جلدی مچا رہا ہے جو اس انکار کی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے ابھی نہیں تو کبھی نہیں جو محض ایک خام خیالی ہے منکرین آخرت زیادہ تر دنیا پرست لوگ ہوتے ہیں اور جلد حاصل ہونے والے فائدے پر ریجھتے ہیں اور اس کے لئے اخلاقی حدود کو پھاندنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔بہر حال عاجلہ پسندی منکرین آخرت کے عملی رویہ سے نمایاں اور ظاہر ہوتی رہتی ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

> ''وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی ہے۔اور تمہیں کیا خبر شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ گئی ہو۔جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لئے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔خوب سن لو، جو لوگ اس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔'' (الشوریٰ (۴۲: ۱۷-۱۸)

(۴) نفس کی بندگی

ایک شخص آخرت کا انکار اس وجہ سے نہیں کرتا ہے کہ اسے یہ علم ہے کہ آخرت واقع نہیں ہوگی۔بلکہ اس کے انکار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نفس پرست انسان ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔آخرت پر ایمان اس کو اخلاقی حدود کا پابند بناتا ہے جو اس کو ناگوار ہے۔لہذا وہ اس کا انکار کر کے خود کو ان تمام بندشوں سے آزاد رکھنا چاہتا ہے اور اپنی بداعمالیاں جاری رکھنا چاہتا ہے۔اس لئے آخرت کا انکار کرتا ہے۔قرآن آخرت کے وقوع اور اس کی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اس ذہنیت پر بھی تبصرہ کرتا ہے تاکہ اس کی فہم و شخصیت کا جو نقص ہے وہ واضح ہو جائے۔قرآن میں ارشاد ہے۔

> ''نہیں میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں ملامت

کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے آخر کب آنا ہے قیامت کا دن؟ پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا کہاں بھاگ کر جاؤں۔ ہرگز نہیں وہاں کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ اس روز تیرے رب کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ اس روز انسان کو اس کا اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی معذرتیں پیش کرے۔" (القیامہ ۷۵:۱۔۱۵)

ان آیات میں آخرت کی کیفیت کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے اور خدا کی قدرت سے واقف کرایا گیا ہے انسان کے خود کی گواہی کو آخرت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسان کے اندر نفس لوامہ موجود ہے جو اسے برائی پر اندر ہی اندر روکتا ہے، مگر وہ اس کو دبا کر برائی پر برائی کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ چاہے اپنی صفائی میں جو کہے مگر وہ خود جانتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ غلط ہے، گناہ ہے۔ مگر چونکہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس لئے بداعمالیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح آخرت سے انکار اس کو گناہوں پر ڈھیٹ بنا دیتا ہے۔ یہ تمام منکرین آخرت کی خاص پہچان ہے۔ اگر آپ مشرکین، ملحدین اور منکرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو پائیں گے کہ ایسے تمام افراد اور اقوام جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں نفس پرستی ان کا کلچر اور طرز عمل ہے۔ جس پر وہ شاداں اور نازاں ہیں۔ اس طرح انکار آخرت اور نفس پرستی ایک دوسرے کا لزوم ہیں۔ قرآن نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کے مرض کی تشخیص کر دی ہے لہذا ان کی ظاہری چمک دمک سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۷) ہٹ دھرمی

قرآن کتاب الٰہی ہے اور حضورؐ اللہ کے نبی ہیں۔ قرآن نے ان دونوں حقیقتوں کو پوری

وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور رسول کی زندگی ان کے سامنے ایک کھلی کتاب ہے جو روز روشن کی طرح شہادت دے رہی ہے کہ آپ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے مگر منکرین ہیں کسی بات کو مان کر نہیں دیتے اور پوری ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہہ کر کہ یہ جادو ہے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔قرآن کا ارشاد ہے۔

''ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آجاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ کھلا جادو ہے۔کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے ان سے کہو اگر میں نے اسے خود بخود گھڑ لیا ہے تو مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے، جو باتیں تم بتا رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لئے کافی ہے اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔'' (الاحقاف ۸۔۷:۴۶)

اس طرح منکرین کے رویہ میں ہٹ دھرمی ایک واضح طرز عمل ہے جو ان کے قول و عمل سے ظاہر ہے۔

(۶) سرکشی

جب انسان خدا کی ہدایت اور آخرت کا انکار کرتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ اس کی سرکشی ہے اور یہ سرکشی اس وجہ سے ہے کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس کو کوئی روکتا ٹوکتا نہیں ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی نگراں نہیں ہے اور اس کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا ہے۔جبکہ اس کا یہ خیال محض ایک غلط فہمی ہے۔قرآن اس کی نفسیاتی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے حالانکہ پلٹنا یقیناً تیرے رب کی ہی طرف ہے۔

اس طرح دنیا میں ظاہری چھوٹ اور ڈھیل اس کو سرکش بنا رہی ہے کیونکہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

(۷) اخلاقی گراوٹ

آخرت کا انکار کرنے والا صرف یہی نہیں کہ خدا اور اس رسول کا منکر ہوتا ہے بلکہ وہ کئی طرح کی شخصی ناہمواریوں (Personality Disorder) کا شکار ہوتا ہے مثلاً اس میں کبر نفس پرستی، حق سے بے پروائی جیسی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ ایک شخص کئی طرح کے اخلاقی خرابیوں میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ اس کے اندر سے رحم دلی ختم ہو جاتی ہے وہ مال و دولت کا حریص ہوتا ہے اور جائز اور ناجائز ہر ذریعہ سے مال سمیٹنا چاہتا ہے۔ وہ اگر کچھ کرے گا بھی تو اس کے اندر ریاکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزوں کو بھی دینے میں بخل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ منکرین آخرت کی اخلاقی خرابیوں کا تذکرہ قرآن نے مختلف جگہوں پر مختلف انداز سے کیا ہے۔ ہم یہاں صرف سماج کے کمزور ترین طبقے کے باب میں منکرین آخرت کا جو رویہ ہے اس پر قرآن نے جس طرح تبصرہ کیا ہے اس کا ذکر کریں گے۔

> ''ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔'' (الفجر ۸۹: ۱۷۔۲۰)
>
> تم نے دیکھا اس کو جو آخرت کی جزا اور سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے نہیں اکساتا پھرتا ہی ہے نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز میں غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں دینے سے گریز کرتے ہیں۔ (الماعون ۱۰۷: ۱۔۷)

ان دونوں حوالوں پر غور کریں تو آپ کو سماج میں منکرین آخرت کے اخلاقی اور انسانی رویہ کا ایک جیتا جاگتا نمونہ آپ کو مل جائے گا۔

(۱) یتیم کے ساتھ سلوک

یتیم سماج کا سب سے کمزور طبقہ ہے جو ہر طرح کی رحم وہمدردی کا مستحق ہے۔ یتیم اس چھوٹے اور نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اور وہ بے سہارا ہے ایسی

صورت میں ضرورت ہے کہ اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا جائے اور اس کو ہر طرح کے ظلم واستحصال سے محفوظ رکھتے ہوئے اس کے لئے باعزت کفالت کا انتظام کیا جائے۔

خاص طور سے خاندان کے بڑے اور خوشحال لوگوں پر لازم آتا ہے کہ یتیم کی کفالت کریں۔ اور اگر خاندان میں اب کوئی نہیں ہے تو سماج پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کی باعزت کفالت کا نظم کرے۔ مگر جو آدمی منکر آخرت ہوتا ہے وہ نہ صرف اس کے ساتھ شفقت اور محبت کے ساتھ پیش نہیں آتا بلکہ وہ اس کو دھکے دیتا ہے جو انتہا درجہ کی شقی القلبی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتا وہاں کے جزا اور سزا کو نہیں مانتا۔ اس طرح آخرت کا انکار اس کی انسانی حسیت (Human sensibility) کو بھی چھین لیتی ہے۔

(۲) مسکین کے ساتھ سلوک

مسکین ایسے ضرورت مند کو کہتے ہیں جو حد درجہ ضرورت مند تو ہوتا ہے مگر وہ اپنی غیرت کی وجہ سے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا مگر اس کی ظاہری حالت دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس درجہ محتاج اور ضرورت مند ہے۔ ایسے کسی شخص کو ایک وقت کھانا کھلا دینا اتنا کافی نہیں ہے بلکہ سماج میں ایسا نظم اور ایسا چلن ہونا چاہئے کہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ منکر آخرت میں اس درجہ خود غرضی ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں سے بے پرواہوتا ہے اور معاشرے میں باہمی کفالت یا اجتماعی کفالت کی کوشش نہیں کرتا۔ بھوک ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس کے بعد کسی اخلاق اور اقدار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی اس لئے اس مسئلہ پر توجہ نہ دینا گویا انکار آخرت کی دلیل ہے۔ کمیونسٹوں کے یہاں ایک مثل مشہور ہے جب ایک بھوکے شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس کا جواب ہوتا ہے چار روٹیاں۔ اس کو چاند میں بھی روٹی نظر آتی ہے کیونکہ وہ بھی روٹی کی طرح گول نظر آتا ہے اس سے انسانی احتیاج اور اس کی حسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھوکوں کو کھانا کھلانے پر بہت زور دیا ہے اور اس کو عقیدہ آخرت سے جوڑا ہے۔ سورہ قریش میں قرآن نے چار انسانی احتیاج کا ذکر کیا ہے ایک موسم کے لحاظ سے سفر وحضر دونوں حالتوں میں کپڑوں اور رہائش کی فراہمی دوسرے بھوک سے نجات تیسرے خوف سے حفاظت اور چوتھا

حالت امن کا قیام تا کہ سفر اور حضر دونوں حالتوں میں امن میسر ہو اور لوگ بے خطر آ جا سکیں یہ وہ کم سے کم ہے جو خدا کی عبادت سے ایک فرد اور قوم کو حاصل ہونا چاہئے جو اس کا حق ہے (قریش۔۶)

(۳) ہوس مال

منکر آخرت بالعموم یہ مانتا ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں یہی ہے۔اس لئے دنیا کے مال و دولت کو وہ ساری چیزوں سے اہم سمجھتا ہے۔مال کمانا ہے چاہے وہ جس ذریعہ سے اور جہاں سے حاصل ہو جائے۔وہ جائز ہے ناجائز ہے۔ظلماً حاصل کیا ہوا ہے۔دھوکہ دے کے حاصل کیا گیا ہے۔ملاوٹ کی گئی ہے۔چوری کی گئی ہے ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔کم تولا گیا، جمع خوری کی گئی ہے۔غرض جس طرح بھی حاصل کیا گیا ہے وہ سب اس کے لئے جائز ہے صحیح ہے یہاں تک کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا میراث کا مال بھی ہڑپ کر کھا جاتا ہے۔اس طرح منکر آخرت کی یہ سب سے بڑی پہچان ہے کہ اس کے اندر ہوس مال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور وہ بندوں کے حق کو مار کھانے میں بے باک ہوتا ہے۔

(۴) ریاکاری

منکر آخرت کا ذہن و دل اخلاص کی کیفیت سے خالی ہوتا ہے اس لئے اولا تو وہ طبعا بخیل ہوتا ہے اور اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو دکھا کر احسان جتا کر لینے والے کو ذلیل کر کے اس کے عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کا احسان مانیں، اس کی تعریف کریں۔اس کی بڑائی کا اعلان کریں اور اس کی جائز اور ناجائز باتوں میں اس کی حامی بھریں۔اس طرح کا مصنوعی اور دکھاوٹی کردار ہوتا ہے۔اس کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا کے حضور پیشی اور اس سے کسی اجر کی امید نہیں رکھتا ہے۔

(۵) خصاصت

منکر آخرت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی طبیعت میں خصاصت بدرجہ اتم ہوتی ہے اور وہ کسی کو اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز جس کو عام طور پر ایک آدمی استعمال کر کے پھر واپس کر دے

ایسی چیز بھی کسی کو دینے سے گریز کرتا ہے اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ اللہ تعلیٰ نے معمولی سے معمولی عمل مثلا سڑک پر پڑی کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینے، کسی سے مسکرا کر بات کرنے۔ کسی کی معمولی سی مدد کر دینے میں بھی نیکی رکھی ہے۔ وہ صرف وہی کام کرتا ہے جس میں اس کو کچھ نفع یا کچھ بدلے کی امید ہو۔ چونکہ وہ آخرت کا انکار کرتا ہے گویا وہ اس بات سے مایوس ہے کہ اللہ کے یہاں اس کے کسی عمل کا اجر ملے گا اس لئے کچھ بھی دینے اور کرنے سے پہلے چاہے وہ کتنی ہی معمولی چیز کیوں نہ ہو یہ ضرور دیکھتا ہے کہ اس سے اس کو کچھ فائدہ ہے کہ نہیں ہے۔ اگر فائدہ ہے تو ضرور کرے گا اور اسے فی الوقت دنیا میں کوئی فائدہ ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو پھر چاہے وہ چھوٹی اور معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو اس کو کرنے سے بچے گا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انکار آخرت سے ایک آدمی کی پوری شخصیت، اس کی سوچ، کردار، عمل اور اخلاق کس طرح متاثر ہوتے ہیں یہاں دو باتیں دھیان دینے کی ہیں۔ یہاں منکرین آخرت کے جن خصوصیات اور عملی رویہ کا ذکر کیا گیا ہے اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب ان کو وحی اور رسالت کی طرف دعوت دی جائے گی تو اس وقت اس دعوت کے مقابلے ان کا یہ کردار ابھر کر سامنے آئے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر اصول کا کچھ استثنیٰ ہوتا ہے۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے یہ ان کا مجموعی کردار ہے ممکن ہے انفرادی سطح پر بعض لوگ بعض معاملات میں اچھے ہوں، مگر اس سے اس اصول عام کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی صاحب ایمان شخص اپنے نفس کے داعیات سے مغلوب ہو کر ویسی حرکت کر بیٹھے جو ایک صاحب ایمان شخص سے ہرگز امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ مگر اہل ایمان کا اجتماعی کردار اس سے بالکل مختلف ہوگا اور ہونا چاہئے ورنہ ایمان والے اور بے ایمان والے کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا۔ ہم آئندہ سکشن میں ان امور پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ جب ایک صاحب ایمان شخص کو نفاق کا روگ لگ جاتا ہے تو وہ بھی اپنے عملی رویہ میں منکر آخرت سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ لہذا ایک صاحب ایمان کو ہمیشہ اپنا احتساب کرتے رہنا چاہئے اور اپنے اعمال اور اخلاق کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ معاملہ اللہ سے ہے جو دلوں کے حال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہم دنیا والوں سے اپنا عیب چھپا سکتے ہیں اور دنیا میں کسی پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔ مگر اللہ جو علام الغیوب ہے اور جو دلوں کے راز تک کو جانتا ہے اور لوٹ کر اسی کے

پاس جانا ہے اس سے نہ چھپا سکتے ہیں اور نہ اس کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔اس لئے اللہ اور اللہ کے بندوں کا حق پہچانتے ہوئے محتاط زندگی گذارنا یہی مومن کا عمل وکردار ہونا چاہئے ۔منکرین کے اعمال اور اخلاق کا ذکر کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ایک صاحب ایمان شخص ان سے بچے کیونکہ یہ اعمال واخلاق اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں جس سے مومنین کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے ۔

عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج

میں نے اوپر کے صفحات میں منکرین آخرت کے خصوصیات اور عملی رویہ کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے اوران کے فکرو وکردار کی وضاحت کی ہے۔اس حصہ میں ہم ان کے ذہن وکردار کا جائزہ لیں گے جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔اس طرح دونوں کے فرق سے معلوم ہو سکے گا کہ کون سا مطلوب کردار ہے۔

عقیدہ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ انسان کے سیرت وکردار کی تعمیر میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ایک آدمی کی پوری شخصیت اس کے فکر وعقیدہ (Faith & Belief) اور اس عقیدہ کی بنیاد پر تعمیر شدہ جو اس کا اخلاقی نظام (Value - System) ہے اس کے ارد گرد گھومتی ہے۔بشری کمزوریوں کے تحت کبھی کسی سے گناہ کا صدور یہ ناممکن نہیں ہے مگر اسے تنبیہ یا یاددہانی کرائی جائے تو وہ اپنی غلطی اور گناہ پر اصرار کرنے کے بجائے توبہ کرتا ہے اور اللہ سے معافی مانگتے ہوئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔مومن مبرا عن الخطا نہیں ہوتا اور نہ وہ معصوم ہوتا ہے۔وہ بھی ایک انسان ہے اور انسان کی ساری کمزوریاں اس کے اندر بھی پائی جاتی ہیں۔لہذا اس کو فرشتہ سمجھنا یا جاننا غلط ہے۔مومن عام انسان کی ہی طرح ہوتا ہے اور اس سے بھی گناہ سرزد ہوتے ہیں مگر وہ منکرین آخرت کی طرح یہ نہیں سمجھتا کہ اسے خدا کے حضور نہیں جانا اور اس کے سامنے حساب کتاب نہیں دینا ہے۔جس کے نتیجے میں وہ خدا کے عذاب یا ثواب سے دوچار ہوگا۔بلکہ ایک مومن اس شعور اور ایمان کے ساتھ جیتا ہے کہ اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔اس لئے وہ اپنی دنیا کی زندگی اللہ سے ڈرتے ہوئے اور نفس اور اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے اس طرح گذارنا چاہتا ہے تا کہ اس کا رب اس سے راضی ہو۔یہ دنیا کا فائدہ نقصان

اورآخرت کے فائدہ نقصان دونوں کوسامنے رکھ کراپنی زندگی گذارتا ہے گویااس کی قلیل مدتی ویژن پرطویل مدتی ویژن(Short term vision v/s long term vision) غالب ہوتی ہے۔اس کا مطلب ہرگزنہیں ہے کہ وہ تارک الدنیا ہوتا ہے۔بالکل نہیں وہ پوری طرح دنیا اور دنیا کے معاملات میں شامل اور شریک ہوتا ہے مگراس کا نقطہ نظر صرف دنیوی فائدے تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ وہ اخروی اجروثواب کو دنیوی اجروثواب پرترجیح دیتا ہے۔یعنی وہ دنیا ترجیح آخرت کے تحت گذارتا ہے۔اس لئے دنیا میں اس کا جوحق اور حصہ ہےاس کو نہ چھوڑتا ہےاور نہ بھولتا ہےلیکن نہ وہ دوسروں کا حق مارتا ہےاور نہ کسی کواپنی حق ماری کی اجازت دیتا ہے۔اس طرح عقیدۂ آخرت اس کے فکروکردار پرمثبت اثرڈالتے ہیں جس سےاس کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

کسی مومن ومسلم کوآپ قریب سے دیکھیں تو اس کے اندرآپ کوخدائے واحد پرایمان اوراس کا خوف،رسول سے بے پناہ محبت اوراس کی اطاعت کا جذبہ اورآخرت کی جوابدہی کا احساس نمایاں طور پر ملے گا۔ایک آدمی کےعلم وایمان میں فرق کے ساتھ یہ جذبہ کسی میں کم اورکسی میں زیادہ ہوسکتا ہے۔مگروہ اگرمومن ومسلم ہےتو وہ ان داعیات سے ہرگز خالی نہیں ہوسکتا ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کوامت وسط بنایا ہے یعنی درمیانی صفات والی امت جس میں نہ تو شدت پسندی اورانتہا پسندی ہےاور نہ بالکل اباحیت بلکہ سب کچھ حداعتدال میں ہوتی ہے۔اس لئے ایک مومن ومسلم نہ تو تارک الدنیا ہوگا اور نہ دنیا پرست۔اس لئے کہ اس کومعلوم ہے کہ وہ دنیا میں خلافت اورعبادت دونوں کے لئے بھیجا گیا ہے اورآخرت کی کامیابی کا راستہ دنیا سے ہوکر گذرتا ہے بلکہ دنیا کے اعمال پرہی آخرت کی کامیابی ناکامی اوردرجات متعین ہوں گے۔خلافت مادی اعمال سے منسوب ہےتو عبادت روحانی اعمال سے۔روحانی اعمال میں جوفرض ہے وہ شارع نےمتعین کردیئے ہین جس کا بجالانا ہرصاحب ایمان کے لئے لازم ہے۔اس کے بعداپنی اپنے نفس کےحقوق۔بیوی بچوں اور دیگراہل خانہ کےحقوق جواس پرعائد ہوتے ہیں،اس کوادا کرتے ہوئے اپنے روحانی عروج کے لئے جتنا وقت نکال سکتا ہونکالےاوراللہ کی عبادت کرے۔اسی لئے رات کی تنہائی میں رات کے دوسرے اورتیسرے پہرعبادت کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ دن کے بیشتر اوقات توخلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں گذرے گی۔اس طرح دونوں کے مابین تال میل

پیدا کر کے اخلاقی حدود کے اندر یعنی شارع نے جو جائز حدود بتادئے ہیں اس کے اندر رہ کر زندگی گذارنا ہی ایمان واسلام کا تقاضہ ہے اور عملی طور پر مومن ومسلم ہونے کی دلیل۔ اس طرح منکرین آخرت اور آخرت پر ایمان لانے والے کے مطمح نظر میں بنیادی فرق ہوگا۔ منکر آخرت صرف دنیا اور دنیوی کامیابی پر دھیان دیتا ہے اور اس کے لئے ہر صحیح اور غلط طریقہ اختیار کرتا ہے اگر یہاں کامیاب ہوگیا تو خود کو کامیاب مانتا ہے اور ناکام ہوا تو ناکام سمجھتا ہے۔ اس دنیا کے بعد بھی کوئی دنیا ہے وہ اس کے احاطہ ذہن سے باہر ہے۔ جب کہ آخرت پر ایمان رکھنے والا صرف دنیا کی کامیابی کو کامیابی نہیں مانتا بلکہ آخرت کی کامیابی کو اصل کامیابی مانتا ہے اس لئے کوئی عمل کرتے وقت اس بات پر ضرور دھیان دیتا ہے کہ اس کا آخرت میں کیا انجام ہوگا اگر آخرت میں اچھے انجام کی توقع ہے تو وہ کام پورے خلوص کے ساتھ پوری محنت اور لگن کے ساتھ پوری مہارت اور سنجیدگی سے پوری ایمانداری اور خوبصورتی کے ساتھ انجام دے گا اور اگر اس کو لگے گا کہ ایسا کرنا آخرت کے نقطہ نظر سے نقصان دہ ہے تو وہ چاہے کتنی ہی فائدہ ہوا ایسا کوئی کام کرنے سے بچے گا۔ ذیل میں ہم عقیدہ آخرت کے مثبت اثرات کا مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) خدا اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہنا

آخرت پر ایمان سب سے پہلے اسے خدا اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ ایک بندۂ مومن کو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے انسانی زندگی کا سارا مقصد ہی خدا کی رضا حاصل کرنا ہے اور اسی کے لئے اللہ نے رسول بھیجا اور اپنی کتاب اتاری قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما۔ یعنی جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔ لہذا ایک شخص ہمیشہ اس کا جویا ہوتا ہے۔ اس لئے عقیدہ آخرت جو سب سے پہلا محرک اس کے اندر پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کی پکار پر ہر وقت لبیک کہنے کو تیار رہتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ اس کے اندر خود سپردگی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ خود سپردگی جتنے شعور اور خلوص کے ساتھ ہوگی اس کے اعمال اور اطاعت میں اتنا ہی حسن پیدا ہوگا۔ یہاں یہ بات دھیان رکھنے کی ہے

کہ ایسا نہیں ہے کہ ایمان لاتے ہی اس کے اندر یہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں گی بلکہ اس کو تعلیم وتزکیہ کے مسلسل عمل سے گذر کر اس متاع گراں بہا کو حاصل کرنا ہوگا جو اس کے لئے توشہ آخرت بن جائے۔

جب حضورؐ نے مکے اور مدینے میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو جن لوگوں نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا وہ تو آپ کے کٹر مخالف ہو گئے مگر جو لوگ آپ پر ایمان لائے ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خود سپردگی تھی اور یہی اسلام ہے۔ جب ایک آدمی نے ایمان کے ساتھ یعنی اس شعور کے ساتھ جس کی تعلیم رسول دے رہے ہیں آپ کی دعوت قبول کی گویا اس نے اپنی رضا سے اس بات کا اعلان کیا کہ آپ کے حکم اور ہدایت کو مانے گا اور اس کے مطابق اپنی زندگی گذارے گا۔ رسول کا بنیادی کام کیا تھا پہلا تلاوت آیات تھا یعنی ان کے سامنے کھول کر یہ بتانا تھا کہ اللہ کا کیا حکم ہے۔ دوسرا کتاب اور حکمت کی تعلیم تھی یعنی اس حکم اور ھدایت کا کیا مفہوم ہے اور اس کی بجا آوری کس طرح کی جاسکتی ہے اور تیسرا کام تزکیہ تھا یعنی انسان کے اندرر جو اچھائیاں ہیں ان کو جلا بخشنا اور جو برائیاں ہیں ان کو دور کرنا دوسرے اس کے اندر جو مثبت انرجی ہے اس کو ابھارنا اور منفی داعیات ہیں ان کو دبانا اور ختم کرنا اس طرح ایک شخص علم کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے کتاب اور حکمت کو زادراہ بنا کر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر لمحہ اپنے فکر وعمل کا احتساب کرتے ہوئے اپنی زندگی گذارتا ہے چنانچہ ایسے فرد اور ایسے افراد پر مبنی سماج کے اندر شر کی قوتیں کمزور ہوتی ہیں اور خیر کی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔

آپ احوال صحابہ کا اگر مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایمان لانے سے قبل ان کی زندگی کیسی تھی وہ کس درجہ کبیرہ گناہوں میں ملوث تھے اور اس کی وجہ سے سماج میں کتنا شر وفساد ہوتا تھا، مگر جب وہ ایمان لے آئے تو دیکھتے دیکھتے ان کی دنیا بدل گئی ان کے اعمال واخلاق میں خوشگوار تبدیلی آئی اور انہوں نے دھیرے دھیرے وہ تمام ظلم وگناہ کے کام چھوڑ دئے کیوں؟ کیونکہ ان کے اندر خدا اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہنے کی صفت پیدا ہو چکی تھی۔ لہذا اللہ کی طرف سے جو وحی آتی اور نبی پاک جس بات کی تعلیم دیتے وہ پوری طرح اس کو سنتے تھے اور مانتے تھے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے انہیں ھدایت کا چاند سورج بنا دیا اور اللہ نے اپنی کتاب میں اعلان کیا کہ وہ

اللہ سے راضی ہیں اور اللہ ان سے راضی ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ وہ اپنے رب سے ملاقات پر زندہ یقین رکھتے تھے۔

قرآن بہت ترغیبی لہجے میں ایمان والوں سے خطاب کرتے ہوئے خدا کی طرف سے بھیجی جانے والی زندگی بخش ھدایات پر لبیک کہنے کی دعوت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ تم سب کو خدا کی طرف واپس جانا ہے۔لہذا آخرت کا یہ عقیدہ ہی وہ اصل محرک ہے جو بندے کو خدا اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے ترغیب دیتا ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔(الانفال ۸:۲۴)

اس آیت میں ایک لطیف بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے یعنی وہ اس کے اندرون کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔لہذا دنیا کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔اللہ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔دوسرے سب کو سمٹ کر اسی کے پاس جانا ہے تو فرار کی یا چھوٹنے کی گنجائش نہیں ہے لہذا جب کسی کو یہ علم اور شعور ہو جائے اور وہ اس پر ایمان بھی رکھتا ہے تب اس کے اندر اطاعت وخود سپردگی کی جو کیفیت پائی جائے گی وہ تو نادر المثال ہوگی جیسا کہ ہم صحابہ کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔جو لوگ بعد میں آنے والے ہیں ان کے سامنے نظری اور عملی دونوں مثالیں ہیں۔ان کو ان کی روشنی میں اپنا احتساب کرنا چاہئیے اور اللہ کی طرف دوڑ کر اپنے رب کے دامن پناہ میں جانے کی سعی کرنی چاہیئے۔یہی اسلام کا تقاضا ہے اور عقیدۂ آخرت کا تقاضہ ہے۔

(۲) اللہ پر ایمان صبر کا محرک

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ آخرت کا عقیدہ انسان کے اندر جو مثبت انرجی ہے اس کو فروغ دینے کا بہت بڑا محرک ہے۔وہ انسان کو مشکل حالات میں پامردی دکھانے کی تلقین کرتا ہے اور اس کے اندر ہمت وحوصلہ پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ محیر العقول کارنامے انجام دے سکنے کے لائق بنتا ہے۔قرآن نے قصہ طالوت اور جالوت کے حوالے سے اس حقیقت کو واضح

کیا ہے اور ایک ایسی تاریخی سچائی پر سے پردہ اٹھایا جو کمزوروں اور کم تعداد والوں کو بہت حوصلہ دیتی ہے۔

طالوت کا لشکر ایک لمبی اور جانکاہ مسافت طے کرنے کے سبب بہت تھکا ہوا تھا اور جب دریا پار کر اس پار پہنچا تو اسے پتہ چلا کے دشمن کے پاس ایک بڑی فوج ہے اور اس کے مقابلے ان کی تعداد کم ہے لہذا ان کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کے ایک گروہ نے اپنے کمانڈر سے کہہ دیا کہ ہم آج مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے مگر جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے تھے اور اپنے رب سے ملاقات پر یقین رکھتے تھے انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ یہ کہا کہ کیا ہوا کہ دشمن کی فوج ہم سے زیادہ ہے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ ایک کثیر گروہ پر اللہ کے اذن سے غالب ہوا ہے۔ اس لئے اگر ہم نے صبر سے کام لیا اور ثابت قدمی دکھائی تو ہم اس پر غالب آئیں گے۔ لہذا آخرت پر یقین اور خدا سے استعانت کی درخواست کرتے ہوئے وہ دشمن سے بھڑ گئے اور بالآخر اللہ نے ان کو فتح یاب کیا۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ

(الف) آدمی کو اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کا حوصلہ دیتا ہے

(ب) صبر اور ہمت پیدا کرتا ہے

(ج) خوف کی نفسیات سے باہر نکالتا ہے

(د) اپنی جملہ صلاحیتوں اور وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

(ر) اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

جس مومن و مسلم کے اندر یا جس مسلمان گروہ کے اندر یہ صفت پیدا ہو جائے وہ پیش آمدہ چیلنج کا پوری پامردی سے مقابلہ کرے گا اور اللہ سے اس کی نصرت کی امید رکھتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھے گا۔ ارشاد باری ہے۔

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی دریا پار کر کے آگے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انہوں نے کہا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے اور جب وہ جالوت

اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے تو انہوں نے دعا کی اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر، آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے ان کافروں کو مار بھگایا۔(البقرہ ۲:۲۴۹۔۵۰)

اس طرح آخرت کا عقیدہ ایک مومن و مسلم کے اندر مسائل کو Head on فیس کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے اور ہر حال میں جمنے اور جمے رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔اگر کسی انسانی گروہ میں واقعی یہ جوہر پیدا ہو جائے تو وہ ناممکنات کو ممکنات میں بدل سکتا ہے۔جب ہم صحابہ کے حیات طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس ایمانی کیفیت کا عملی ثبوت ملتا ہے اور ان کی کامیابی اور حیرت انگیز کارناموں کا یہی اصلی راز ہے۔ضرورت ہے کہ ہم صرف ثواب کی نیت سے قرآن نہ پڑھیں بلکہ عمل کی نیت سے سمجھ کر قرآن پڑھیں تو ہم بھی اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کا ہنر سیکھ لیں گے اور اپنی صلاحیتوں کے بہتر استعمال کے فن سے واقف ہو جائیں گے کیونکہ بغیر Firm commitment اور Conviction کے دنیا میں کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا جو آخرت میں بھی ہماری نجات کا ذریعہ بنے۔

(۳) جذبۂ قربانی کا فروغ

دنیا میں کوئی کامیابی بغیر قربانی کے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔مقصد جتنا بڑا ہوگا قربانی اتنی ہی بڑی ہوگی۔مقصد جتنا چھوٹا ہوگا قربانی اتنی چھوٹی دینی ہوگی، مگر بغیر قربانی اور محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔قربانی وقت کی دی جاسکتی ہے، مال کی دی جاسکتی ہے۔صلاحیت کی دی جاسکتی ہے اور جان کی بھی دی جاسکتی ہے۔جب جیسے حالات ہوں اور جیسا مقصد سامنے ہو اس کے مطابق قربانی دینی ہوگی۔

اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول آسان نہیں ہے۔ایک انسان کو اس کے لئے سب سے پہلے اپنے نفس سے لڑنا ہوتا ہے۔پھر اپنے اہل خانہ اور سماج اور پھر جو صاحب اقتدار قوت ہے اس سے بھی اس طرح زندگی ایک ہمہ گیر جنگ ہے اور ہمیں اس پر فتح پانا ہے۔یہ محض آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں اور نہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر محض دعا کرنے سے حاصل ہوگا۔اس کو حاصل کرنے کے لئے جدو

جہد کرنی ہوگی۔رزق کا حصول ہو یا علم کا حصول یا حق و باطل کی کش مکش سب جگہ قربانی درکار ہے یقیناً اس کی مقدار اور نوعیت میں فرق ہوگا مگر یہ کسی بھی طرح کی کامیابی کے لئے شرط لازم ہے۔

ایمان کیا ہے؟ قرآن نے اس کو کئی طرح سے سمجھایا ہے۔ایمان ایک معاہدہ ہے بندے اور خدا کے درمیان، بندہ وعدہ کرتا ہے کہ اللہ کا حکم بجالائے گا اور اللہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کے اعمال کو قبول کرتے ہوئے اس کو بخش دے گا اور اپنی نعمت بھری جنت میں جگہ دے گا۔ایمان ایک بیع ہے۔بندہ اپنی جان اور اپنا مال جو خدا کا ہی دیا ہوا ہے اپنی خوشی سے خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور خدا اس کے بدلے جنت کا وعدہ کرتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب بندہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی جان اور اس کا مال اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اور حسب ضرورت اس کی راہ میں لٹا دینا ہی معراج زندگی ہے تو اس کے بعد وہ کسی بھی قربانی سے گریز نہیں کرے گا کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ جب وہ خدا کے حضور پہنچے گا تو خدا کی رضا اور اس کی مغفرت اور اس کا انعام اس کا استقبال کریں گے۔اس طرح آخرت کا عقیدہ اس کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ارشاد باری ہے۔

جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔(النساء۔۴:۷۴)

(۴) مشکل کام کو آسان کر دینا

ہم نے اوپر کی تفصیلات میں دیکھا کہ آخرت کا عقیدہ کس طرح مشکل حالات میں انسان کو سہارا دیتا ہے اور وہ اس کام کو ایک فطری آسانی (Natural ease) کے ساتھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔اللہ نے اپنی عبادت کے لئے کچھ چیزیں فرض کیں ہیں۔ان میں نماز سب سے بڑی اور مہتم بالشان عبادت ہے۔روزہ سال میں ایک بار ہے جو صحتمند اور مقیم پر فرض ہے۔زکوۃ اور حج مالداروں پر فرض ہے۔مگر نماز ہر مسلمان مرد و عورت عاقل و بالغ پر فرض ہے۔جو پانچ وقت کی پابندی کے ساتھ عام حالات میں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔

ظاہری بات ہے یہ ایک مشکل عمل ہے خود اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے کہ یہ ایک مشکل

کام ہے اس لئے کہ اس کا اہتمام ایک بار نہیں کرنا ہے۔ ایک دن نہیں کرنا ہے بلکہ تاعمر اور اس کے تمام شرائط ولوازم کے ساتھ ادا کرنا ہے اس لئے اس کے مشکل ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا ہے ۔مگر قرآن نے بتایا کہ جولوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس طرح آپ دیکھیں گے نماز ہو یا میدان جنگ ہر دوجگہ عقیدۂ آخرت ہی وہ خاص محرک ہے جو بندے کو اس کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ اگر یہ عقیدہ کمزور ہوگا تو نہ تو آدمی اللہ کی راہ میں اپنا جان و مال خرچ کرے گا اور نہ اس کے سامنے سربسجود ہوگا۔ اس طرح یہ عقیدہ ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر محیط ہے خالص عبادت سے لے کر زندگی کے جملہ معاملات ومسائل میں یہ ایک لازمی محرک کے طور پر کام کرتا ہے اور ہمیں سنگلاخ وادیوں کو مسخر کرنے کے لئے مہمیز دیتا ہے ۔اللہ کا ارشاد ہے۔

بیشک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگران فرماں بردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ (البقرہ۲: ۴۵)

رب سے ملنا اور پلٹ کر جانا ایسا زبردست داعیہ ہے جو صاحب ایمان میں نماز کی ادائیگی میں خشوع اور خضوع پیدا کرنے میں مددگار ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کو ہر طرح کے فحاشی اور منکرات سے بچنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔

(۵) اخلاقی گراوٹ سے حفاظت

آخرت کا عقیدہ ایک لنگر کی طرح ہے جس طرح سمندر میں جب ایک جہاز طوفانی لہروں کے درمیان گھر جاتا ہے اس وقت لنگر ڈال کر جہاز کو ڈوبنے سے بچایا جاتا ہے ۔اسی طرح کبھی کبھی آدمی نفس کی ترغیبات سے اتنا مغلوب ہوجاتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط کی تمیز کھودیتا ہے اور اس سے غلط حرکت یا گناہ سرزد ہوجاتا ہے۔ یہ بات اوپر بتائی گئی ہے کہ ایمان اور اسلام کی دعوت تو ہر کسی کو دی جائے گی اور ہر وہ شخص جو دائرے اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ پہلے دن سے ہی تمام خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ وہ تمام طرح کی منفی ترغیبات موجود رہتی ہے مگر ایمان چونکہ سمع و اطاعت کا نام ہے اس لئے جب اسے اس کی کسی غلطی پر مطلع کیا جاتا ہے اس وقت وہ ڈھیٹ بن کر

اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتا بلکہ فوراً توبہ کر کے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرتا ہے اس طرح بتدریج وہ اخلاق کے اونچے معیار پر فائز ہوجاتا ہے۔ جس آدمی میں آخرت کا خوف اور سمع اور اطاعت کا جذبہ مضبوط نہیں ہوتا اس کی اصلاح و تربیت ہونی مشکل ہے۔ اس طرح ایمان والا ہونے کے بعد بھی اس کا طرز عمل غیر ایمان والے کی طرح ہوسکتا ہے۔ جب کبھی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ایسا شخص دوسروں کے قبول حق میں مانع ہوجاتا ہے۔ اگر ہم اپنے ہم عصر معاشرے پر غور کریں اور اس میں لوگوں میں اسلام سے بدگمانی اور دوری کے اسباب تلاش کریں تو اس کی ایک بری وجہ ہمارا انفرادی اور اجتماعی کردار ہے اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ہمارے عقیدے میں ضعف پایا جاتا ہے جو ہمارے روزمرہ کے کردار اور معاملات سے واضح ہے۔

قرآن مسلمانوں کو خاص طور پر کسی کو دھوکہ دینے اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کے لئے عہد خداوندی کو توڑنے اور اخلاقی گراوٹ میں مبتلا ہونے سے روکتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ اس طرح عقیدہ آخرت اسلامی نظام تربیت میں سب اہم محرک ہے اور جس کے اندر اس پر جتنا ایمان مضبوط ہوگا وہ اتنا ہی آخرت کا خوف رکھے گا اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرنے پر آمادہ ہوگا کیونکہ آخرت کا انعام دنیا کے ہر فائدے سے بڑا ہے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا۔

> (اے مسلمانوں) تم اپنے قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنالینا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے نہ بیچ ڈالو۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہوجانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے

اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔(النمل ۱۶: ۹۴۔۹۷)

اس طرح عقیدہ آخرت آدمی کو اخلاقی گراوٹ سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور ایک بندۂ مومن کو یقین دلاتا ہے کہ اگر اس نے صبر سے کام لیا اور تھوڑے فائدے اور لالچ میں دھوکہ دھڑی اور غلط چیزوں سے خود کو بچائے رکھا تو دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں بہترین اجر سے نوازا جائے گا جو ہمیشہ اور باقی رہنے والی شے ہے۔ اس طرح عقیدۂ آخرت آدمی کو غلط کاموں سے روکتی ہے اور اچھے کاموں کو برضا و رغبت کرنے کی تحریک دیتی ہے۔

(۶) انفرادی ذمہ داری کا احساس

آخرت کا عقیدہ آدمی کو ذمہ دار اور اجوابدہ فرد بناتا ہے ہر شخص اپنے فکر و عمل کا خود ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کے اچھے برے کا حساب لیا جائے گا۔ ہر شخص بالکل اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے قول و فعل کا جواب دہ ہوگا وہ کسی کے اوپر اپنا بوجھ، اپنی ذمہ داری اور اپنا الزام نہیں ڈال سکتا ہے۔ اللہ نے ہر کسی کو جو زندگی، موقع اور مہلت عطا کی ہے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں خود فیصلہ لے اور کسی اور کے سہارے زندگی نہ گذارے۔ اس نے اگر اچھا کیا ہے تو اس کا اچھا بدلہ پائے گا اور اس نے کچھ برا کیا ہے تو اس کا ذمہ دار بھی خود ہی ہوگا۔ وہ اپنے عمل کی ذمہ داری کسی پر ڈال کر اپنی ذمہ داری اور اس کی جوابدہی سے نہیں بچ سکتا ہے۔

یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ اگر ایک شخص کو اس کا صحیح شعور ہو تو وہ کسی کے بہکاوے میں نہیں آئے گا اور اپنی زندگی، فکر و عقیدہ، اخلاق و عمل کے بارے میں خود فیصلہ کرے گا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ قرآن کا فرمان ہے۔

> جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے لئے ہی مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک (حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لئے) ایک پیغامبر نہ بھیج دیں۔ (بنی اسرائیل (۱۷: ۱۵)

اب ایک پیغام بر آ گیا اور اس نے حق و باطل کا فرق سمجھا دیا۔ پیغمبر کو جبر کا اختیار نہیں

ہے لہٰذا جواب راہ راست اور گمراہی کا ذمہ دار وہ شخص ہوگا اور وہ کسی پر الزام دھر کے اس سے بچ نہیں سکتا ہے۔اسی طرح جس نے پیغمبر کی بات سنی اور راہ راست اختیار کیا یہ اسی کے لئے مفید ہے اور یہاں بھی اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ اس کو ملے گا۔اس طرح یہ طریقہ ایک آدمی کو امپاور کرتا ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں اور اپنے فکر وعمل کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر مگر خود آزادنہ فیصلہ لے کیونکہ اس کی ساری ذمہ داری اس پر ہی ہے کسی اور پر نہیں ہے۔

(۷) آخرت کا عقیدہ بندے کے اندر اللہ کے احسان کی یاد اور احساس شکر پیدا کرتا ہے

جب انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو ایک بھری پوری حیات بخش کائنات کی گود میں پروان چڑھتا ہے جہاں اس کی چھوٹی اور بڑی سے بڑی ضرورت کی تکمیل کے سامان اور اس کے وسائل وذرائع موجود ہوتے ہیں۔پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی ضرورتیں اور مطالبات بھی بڑھتی جاتی ہیں اور قدرت اسی کے لحاظ سے اپنی نعمتیں بھی پھیلاتی جاتی ہے یہ سلسلہ اس کے وجود میں آنے سے لے کر آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔جب وہ اس مادی کائنات پر غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہ زمین وآسمان جو اس کی نظروں کے سامنے ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے چلتا پھرتا ہے ان میں سے کوئی چیز نہ اس نے بنائی ہے اور نہ اس جیسے کسی انسان نے۔آسمان سے بارش کا برسنا اور جانوروں کی اقسام پھر جب کائنات کی معنویت پر غور کرتا ہے تو معاً اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی علیم وقدیر ہستی کا کارنامہ ہے۔جیسے ہی اسے اس کا احساس ہوتا ہے اس کی معرفت کا جویا ہوتا ہے اور اس جہاں کی غائت اور اپنے وجود کا مقصد معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس مقام تک تو اس کے علم وعقل نے رہنمائی فرمادی ،مگر اس سے آگے کا علم اس کو نہیں ہے۔اسی مقام پر پہنچ کر اسے وحی اور رسالت کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اس کو سیدھے سچے راستے کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔وہ اگر وحی رسالت سے ھدایت حاصل کرنے میں ناکام ہوتا ہے پھر نہ معلوم فکر وخیال کی کن پگڈنڈیوں میں گم ہو کر اپنی منزل سے بہت دور بھٹک جاتا ہے۔

وحی ورسالت اسے کائنات کا مقصد،اس کا مقام ،اس کی ذمہ داریاں اور اس کے انجام

سے واقف کراتی ہیں اور ایک انسان کو بتاتی ہیں کہ یہ نعمتیں جو اسے دنیا میں میسر ہیں وہ ایک امتحان گاہ میں دی گئی سہولتیں ہیں تاکہ وہ اپنے حصہ کی ذمہ داری بخوبی ادا کر سکے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر بجالائے۔

جب ایک شخص کو زندگی اور اس کے مقام و منصب کا علم ہوتا ہے تو پھر اس کائنات کو دیکھنے اور اس کو برتنے کا نظریہ بدل جاتا ہے اور اس کے اندر احساس شکر پیدا ہوتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اسے ایک دن اپنے رب کے حضور پلٹنا ہے اور ان تمام چیزوں کا حساب دینا ہے اس لئے اس کے بے جا استحصال سے گریز کرتا ہے اور جب بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اللہ کا شکر بجالاتا ہے۔

قرآن نے عقیدۂ آخرت کو اس طرح پیش کیا کہ کائنات کی جملہ طاقتیں اور وسائل انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ مگر اس کے استعمال کے وقت یہ احساس جاگزیں رہنا چاہئے کہ اپنے رب کے حضور پلٹنا ہے اور اس کا حساب بھی دینا ہے۔ اس احساس سے انسان کے اندر چار خصوصیات پیدا ہوں گی۔

(۱) احساس شکر پیدا ہوگا

(۲) ان وسائل کے بہتر استعمال اور تحفظ کی کوشش کرے گا۔

(۳) اس کے استحصال اور نقصان پہنچانے سے گریز کرے گا۔

(۴) جواب دہی کے جذبے کے ساتھ اس کا استعمال کرے گا کیونکہ اس سے ہر چھوٹی بڑی نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس طرح کائنات اور انسان میں جو ربط ہے اس میں توازن پیدا کرنے میں مدد ملے گی اور یہ چیز دنیا اور آخرت دونوں میں بہتری کی ضامن ہوگی۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ وہی نا جس نے تمہارے لئے اس زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنادیئے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پاسکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کئے جاؤ گے۔ وہ ہے جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کئے اور جس نے تمہارے لئے کشتیوں

اور جانوروں کو سواری بنایا تا کہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ جس نے ہمارے لئے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ (الزخرف ۴۳: ۱۰۔۱۴) اس طرح جب آدمی قدرت الٰہی اور معرفت الٰہی سے آگاہ اور باخبر ہو جاتا ہے تو معاً اس کے اندر احساس شکر پیدا ہوتا ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے پلٹ کر اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے تو دنیا میں رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کا رویہ شکر و احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہوتا ہے۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ کائنات کی نعمتوں کو نعمت مانتے ہوئے اس کے قدر کی تلقین کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مومن و مسلم کو جب کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو فوراً وہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے اور بہت احتیاط و احترام کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے جس میں اس نعمت کے بیجا استعمال اور زیاں سے گریز شامل ہے، دوسرے ابنائے نوع کا خیال اور ہر طرح کے ظلم واستحصال سے اجتناب کی کیفیت غالب رہتی ہے۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ ضرور اس سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی (۱۰۲:۸)

(۸) آخرت کے حصول کی سعی

ایک شخص مومن ہو یا کافر، ملحد ہو یا مشرک دنیا میں زندگی سبھی گذارتے ہیں لیکن ان کے فکر و عقیدہ کی وجہ سے ان کی طرز حیات بھی الگ ہوگی اور ان کا مطمح نظر بھی الگ ہوگا۔ زندگی کو برتنے کا طریقہ اور روزمرہ کے معمولات بھی الگ ہوں گے۔ ایک آدمی جو دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اس کی سرگرمی دنیوی امور تک محدود ہوگی اور دنیا کے لطف ولذت کو ہی زندگی کی معراج مانے گا۔ مگر ایک شخص جو یہ مانتا ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اس کے سامنے جوابدہ ہے اس کے زندگی کی منہاج اس سے مختلف ہوگی وہ اپنے ہر سعی و عمل میں اس بات کو ترجیح دے گا کہ اخروی نتائج کے اعتبار سے اس کی یہ فکر اور اس کا طرز عمل کیا اس کے نجات کا ذریعہ بنے گی؟ اگر ہاں تو پھر وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام کو انجام دے گا اور اگر نہیں تو اس سے بچے گا۔ اس طرح آخرت کا عقیدہ ایک انسان کے پورے فکری اور عملی سانچے کو بدل دیتا ہے اور اسے لاابالی اور غیر ذمہ دار کے بجائے

بیحد حساس اور ذمہ دار بنا دیتا ہے ۔اور اس کے تمام اعمال ترجیح آخرت (Akhirat oriented) کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔اس طرح یہ عقیدہ انسان کوانسان رہتے ہوئے اوراپنے تمام دنیوی اعمال کے دوران حصول آخرت کی سعی پر ابھارتا ہے جودنیا سے الگ کوئی طرز عمل نہیں ہے بلکہ دنیا کو دیکھنے کا برتنے کا ایک ایسا پاکیزہ ،عدل پرور ، میانہ رو اور بندوں کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی جینے کا طریقہ ہے جس سے خلق خدا بھی ظلم واستحصال سے محفوظ رہے اور اللہ بھی راضی ہو۔اس طرح اس کی زندگی اور تمام تر سعی وجہد کا مقصد حصول آخرت ہوتی ہے۔اللہ نے قرآن پاک میں ایک شخص جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا اور ایک شخص جو آخرت پر یقین رکھتا ہے دونوں کی سوچ اور طرز عمل کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جولوگ آخرت کی سعی کرتے ہیں کیسے اللہ اپنے فضل سے ان کونوازتا ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

> جوکوئی عاجلہ کا کا خواہشمند ہوا سے ہم دیدیتے ہیں جو کچھ جسے دینا چاہیں۔ پھراس کے مقسوم میں جہنم لکھدیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہوکر۔اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسا کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہیئے ،اور ہووہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی ۔ان کو بھی اور ان کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامان زیست دئے جارہے ہیں، یہ تیرے رب کا عطیہ ہے۔اور تیرے رب کی عطا روکنے والا کوئی نہیں ہے۔مگر دیکھ لو دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی ۔(بنی اسرائیل ۱۷:۱۸۔۲۱)

ان آیات سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی ترجیح آخرت والی زندگی گذارتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں جو نعمتیں ہیں اس سے وہ محروم رہے گا بلکہ اس کو دنیا میں بھی اللہ کا فضل حاصل رہے گا اور آخرت میں اس سے کہیں زیادہ ملے گا۔ اس طرح مومن کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہوسکتا ہے اور وہ دونوں جگہ کامیاب وکامران ہوگا۔اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مومن کی نظر قلیل مدتی فائدے (Short term benefits) کے

ساتھ طویل مدتی فائدے (Long term benefits) پر بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ Long Term perspective کو دھیان میں رکھ کر اپنے فکر و عمل کے سمت اور مقصد کا تعین کرتا ہے جو عقیدۂ آخرت کا منطقی تقاضہ ہے۔

(۹) آخرت کے مقابلے دنیا کو حقیر سمجھنا

اوپر کی بحث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک مومن و مسلم ترجیح آخرت کے ساتھ دنیوی زندگی گذارتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ واضح طور پر یہ ہے کہ حیات دنیا بہت محدود اور مختصر ہے جبکہ حیات آخرت لامتناہی اور لامحدود ہے۔ ظاہر سی بات ہے جو چیز دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اس کو وقتی اور فنا ہو جانے والی چیز پر ترجیح دی جائے گی۔ اس لئے مومن کا نقطۂ نظر صاف ہے۔ وہ دنیا کی زندگی آخرت کو دھیان میں رکھ کر جیتا ہے مگر جب اس سے کہا جائے گا کہ وہ آخرت کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا کو تو وہ بلا دریغ آخرت کو ترجیح دے گا کیونکہ دنیا میں اس کا قیام وقتی ہے جبکہ آخرت کا گھر ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس لئے وہ یہاں کے فائدہ نقصان سے زیادہ آخرت کے فائدہ نقصان پر دھیان دے گا اور نفس کی ترغیبات اور حصول دنیا کی خاطر ذہن و ضمیر کا سودہ کرنے سے بچے گا۔ آخرت بیچ کر دنیا خریدنا گویا قیمت دے کر مردار جانور خریدنا ہے۔ جو کسی فائدے کی چیز نہیں ہے۔ اس لئے مومن کے نزدیک دنیا اہم ضرور ہے کیونکہ دنیا مزرعۃ الاخرۃ ہے یعنی آخرت کی کھیتی ہے یہاں جیسا بوئے گا وہاں ویسا ہی کاٹے گا اس لئے دنیا کو پوری طرح برتنے کا حکم ہے پوری اور بھر پور زندگی گذارنے کی ھدایت ہے مگر جب کبھی آخرت اور دنیا کا مقابلہ کیا جائے گا تو آخرت سمندر ہے اور دنیا محض پانی کا ایک قطرہ۔ اس طرح دریا کو ہمیشہ قطرے پر ترجیح ہوگی۔ اس لئے ایک مومن ایماناً دنیا کو آخرت کے مقابلے حقیر مانتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

> تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سرو سامان

دے دیا ہو اور پھر قیامت کے روز سزا کے لئے پیش کیا جانے والا ہو۔
(القصص ۲۸: ۶۰۔۶۱)

(۱۰) آخرت کا خوف کن اخلاقی فضائل کو فروغ دیتا ہے

ایمان اور اسلام ایک آدمی کو پوری زندگی، اس کے فکر و عمل، اس کے اخلاق و معاملات غرض اس کو اندر اور باہر سے پوری طرح بدل دیتا ہے اور وہ سراپا نیکی اور بھلائی کا جویا ہوتا ہے۔ وہ خدا کی رضا اور اس کے رسول کی اطاعت میں سرگرم ہوتا ہے۔ اس کی دوستی، دشمنی، اس کا کسی کو کچھ دینا نہ دینا۔ اس کی پسند اور ناپسند سب خدائی ھدایات کا پابند ہوتے ہیں۔ وہ خیر کا علم بردار اور شر سے بچنے والا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی اعتدال اور میانہ روی کا مرقع ہوتی ہے۔ وہ تنگی اور فراخی میں ہر وقت خدا کے احکام کا پابند ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے مومن بندوں کی تصویر کھینچی ہے اور اس کے مطلوبہ کردار کی طرف رہنمائی کی ہے جس پر اللہ نے اپنی رضا اور اپنے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ اسلام کے نظام عقائد میں عقیدۂ آخرت کا جو مقام ہے اس کا اوپر تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن نے مختلف مقامات پر مومن بندوں کے صفات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم بالخصوص عقیدہ آخرت کا ایک مسلمان کے اخلاق و کردار پر کیا اثر پڑتا ہے اس کا مندرجہ ذیل آیات کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ اللہ تعالی سورۃ المعارج میں آخرت پر ایمان رکھنے والے بندوں کے صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

> ''جو لوگ نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نمازوں کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔ جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے خوف ہو۔ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے

ہیں۔ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی گواہیوں
میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ
عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے۔(المعارج ۱۰: ۲۳۔۳۵)

اللہ تعالیٰ نے آخرت پر ایمان رکھنے والے بندوں کے یہاں چند اخلاقی فضائل کا ذکر کیا ہے جو ان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی اور اس کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان کے اخلاق کی مکمل فہرست نہیں ہے۔مگر یہاں جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا وہ اگر کسی فرد اور معاشرے کا چلن بن جائے تو بلاشبہہ وہ ایک مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔ہم یہاں متذکرہ خوبیوں کا مختصراً جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) نماز کا اہتمام

ایک مرد مومن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ نماز کا پابند ہوتا ہے، اس کا اہتمام کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔نماز اس کا تعلق اس کے رب سے جوڑنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق اپنے رب سے جڑ جاتا ہے تو اس کے احکام وھدایات پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے مومن بندے کی اس خوبی کو پورے اہتمام اور اولیت کے ساتھ بیان کیا۔دین میں نماز کا کیا مقام ہے وہ حضور کی دو حدیثوں سے واضح ہے۔ایک میں کہا گیا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو چھوڑ دیا اس نے دین کو ڈھادیا۔دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا جس میں نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں۔لہذا یہ ایک ناقابل یقین بات ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور نماز کا پابند نہ ہو۔جو آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ نماز کو اولین اہمیت دیتا ہے کیونکہ یہ دین کی اساس ہے اور اس کی سب سے ابھری ہوئی خوبی یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہے اور اس کا اہتمام کرتا ہے۔

(۲) مال میں سائل اور محروم کا حق

ایک بندۂ مومن کو جو مال ومتاع میسر ہیں اس پر صرف اس کا اور اس کے بیوی بچوں

کا حق نہیں ہے بلکہ جو لوگ سائل اور محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔ سائل کا مطلب وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو بیروزگار ہو، یا روزی کمانے کی کوشش کرتا ہو مگر وہ کافی نہ ہو یا کسی حادثے اور آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو۔ ان تمام لوگوں کا اس کے مال میں حق ہے اور ایسے تمام ضرورت مندوں کو بھیک اور احسان سمجھ کر نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ان کو دینا چاہئے اور ان پر خرچ کرنا چاہئے۔ اگر آپ عقیدہ آخرت پر مبنی معاشرہ کو دیکھیں تو یہ ایک Caring & sharing society ہوتی ہے جس میں غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری اس کا امتیازی وصف ہے جس کو یہاں آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) جنسی ڈسپلن

جنسی خواہش ایک فطری داعیہ ہے اور اس پر افزائش نسل کا سارا دارو مدار ہے۔ اس لئے اسلام نے اس کے لئے ایک دائرہ کھینچ دیا ہے تاکہ سماج میں پاکیزگی قائم رہے۔ عریانی، فحاشی اور زنا پر مکمل روک ہو۔ لہذا کسی کو ان حدود سے باہر جا کر اپنی جنسی خواہش کے تسکین کی اجازت نہیں ہے۔ جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس حد بندی کو مانتے ہوئے اپنی اس فطری ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں قرآن پاک میں اور حضور کی حدیثوں میں اس باب میں مکمل احکامات دیئے گئے ہیں جن کو جاننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴) امانتوں کی حفاظت

آخرت پر ایمان رکھنے والے بندۂ مومن کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ جو اللہ نے امانتیں اس کے سپرد کی ہیں ان کی بھی حفاظت کرتا ہے اور جو کسی بندے کی امانت اس کے پاس ہے اس کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں Most trusted person سب سے زیادہ قابل اعتماد شخص ہوتا ہے۔

(۵) عہد کا پابند

آخرت پر ایمان رکھنے والے بندۂ مومن کی دوسری سب سے نمایاں خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ عہد کا پابند ہوتا ہے۔یعنی قول وقرار کا پابند جس کی بجا آوری ہر صورت اور ہر حال میں کرتا ہے۔امانتوں کی حفاظت اور عہد کی پابندی اس کو سماج کا سب سے بااعتماد شخص بناتا ہے۔جوایک بندہ کی پہچان ہوتی ہے۔حضورؐ کا فرمان ہے جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

(بیہقی،شعب الایمان)

(۶) گواہی میں راست بازی

آخرت پر ایمان رکھنے والی ایک اور نمایاں اخلاقی خوبی یہ ہے کہ وہ سچی گواہی دیتا ہے نہ شہادت چھپاتا ہے اور نہ اس میں کمی بیشی کرتا ہے۔

اس طرح آخرت کا عقیدہ اس کا تعلق خدا سے جوڑنے میں مدد کرتا ہے۔ بندوں کا حق ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے،نفس کی پاکیزگی عطا کرتا ہے۔امانت،دیانت عہد کی پابندی اور شاہد وامین بناتا ہے۔

اگر ایک شخص کو اس عقیدے کے مفاہیم اور مطالبات کا صحیح علم ہو تو اس کی زندگی خوشگوار تبدیلیوں سے پر ہوگی جو پورے سماج اور پوری انسانیت کے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ بن جائے گی اور پورے سماج میں نیکی،خبر گیری اور شرافت واخلاق کا چلن ہوگا۔

قرآن پاک تنذیر،تبشیر اور تذکیر تینوں کی کتاب ہے۔ یہ خدا کے باغی بندوں کو برے انجام سے ڈراتی ہے۔نیک بندوں کو خوش خبری دیتی ہے اور ان تمام لوگوں کو جو بھول جاتے ہیں یا جن سے سہو ہو جاتی ہے ان کی یاددہانی کراتی ہے تاکہ وہ اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر خدا کے بتائے ہوئے راستے کی طرف لوٹ آئیں جہاں فلاح ومغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔عقیدہ آخرت ان تمام امور پر دلالت کرتی ہے۔

عقیدہ آخرت اسلام کا اہم ستون ہے چنانچہ پورے قرآن میں اس کے متعلقات اس

قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر ان پر مکمل طور پر بحث کی جائے تو پوری ایک ضخیم کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے۔ ہم اس مطالعے کو یہیں پر روکتے ہیں۔ جن لوگوں کو اور تفصیل سے اور پوری گہرائی سے عقیدۂ آخرت کا مطالعہ کرنا ہے انہیں قرآن پاک کا مکمل مطالعہ مع ترجمہ مستند تفسیر کے ذریعہ کرنا چاہئے۔ میں نے یہاں اس کے تصور اور متعلقہ مباحث تک خود کو محدود رکھا ہے اور جو لوگ اس عقیدے کو مانتے ہیں اور جو نہیں مانتے ہیں دونوں کے نظام فکر و اخلاق میں اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ظاہر ہے یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ اگر اس میں کوئی غلطی سرزد ہو تو یہ میرے فہم و مطالعہ کی غلطی ہے جس پر متنبہ ہونے پر میں ہمیشہ اپنی اصلاح کے لئے آمادہ رہوں گا۔ اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ ہمارے سیئات کو ہم سے دور کرے، اور حسنات کو قبول فرمائے اور میرے اندر بھی عقیدۂ آخرت کا زندہ شعور پیدا کرے تاکہ ہمارے اخلاق اور اعمال بھی اس کی روشنی میں بہتر ہوں اور آخرت میں رسوائی و شرمندگی سے محفوظ رکھے اور اپنی رضا اور اپنے انعام سے نوازے (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

باب دوم

موجودہ حالات اور ماحول میں سیرت کا پیغام
ایک اطلاقی مطالعہ

حضورؐ سب کے نبی : حضور سرور کونین حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی جن پر ہمارے ماں باپ قربان خیر وصلاح کا ایک ایسا منبع ہیں جو ساری دنیا اور تمام جہاں والوں کے لئے ھدایت و رحمت، صلاح وفلاح اور اخروی نجات ومغفرت کا ضامن ہے ۔اللہ تعالیٰ انسانوں سے کتنا پیار کرتا ہے اور اس نے ان کی فلاح کا کتنا اہتمام کیا ہے۔حضورؐ کی ذات اس کی علامت ہے۔اس شخص سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا جس نے حضور کو دیکھا اور حضورؐ کا زمانہ پایا اس کے بعد بھی وہ آپؐ پر ایمان لانے سے محروم رہا۔اور اس شخص کی بدقسمتی بھی قابل افسوس ہے جس تک حضورؐ کی دعوت پہنچی ،آپؐ کی سیروت وسنت سے واقف ہونے کا موقع ملا اور اس کے دل میں آپؐ کی عظمت کا احساس جاگزیں ہوگیا،مگر محض خاندانی تعصب ،قومی انا اور غلط عقائد کی ملما کاریوں کی وجہ سے یا غالب قوم کے دباؤ اور حکومت وقت کے جبر کی وجہ سے یا پھر محض اپنی شرارت نفس کی وجہ سے ایمان کی دولت سے محروم رہا۔

حضور صرف مسلمانوں یا عربوں کے نبی نہیں ہیں بلکہ آپؐ تمام جہاں والوں کی طرف نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔قرآن نے حضورؐ کی اس حیثیت کو متعدد مقامات پر بہت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے سورہ الاعراف آیت ۱۸۵ میں ارشاد فرمایا۔

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (الاعراف. ۱۸۵)

کہہ دیجئے اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔اس آیت میں دو لفظ یاایھا الناس اور الیکم جمیعا قابل غور ہے۔صرف یاایھاالناس ہی کہا جاتا تو اس سے مراد سارے انسان ہوتے مگر اس پر الیکم جمیعا کا اضافہ کرکے گویا اس بات پر زور دیا گیا کہ آپ بلا استثنا،تمام انسانوں کے نبی ہیں۔اس لئے انسانوں کا کوئی گروہ خواہ وہ کسی ملک وقوم

سے وابستہ ہو۔کسی رنگ اور جنس سے تعلق رکھتا ہو،کوئی زبان بولتا ہو اگر وہ انسان ہے اور اس پر انسان ہونے کا اطلاق ہوتا ہے گویا وہ انسانی گروہ کا فرد ہے اس صورت میں حضورؐ اس کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں لہذا آپ کی بات سننا اور جاننا اس کے لئے لازم ہے۔

قرآن نے سورہ السبا آیت نمبر ۲۸ میں اور واضح الفاظ میں حضور کی عالمگیر حیثیت کا تعارف کرایا ہے۔قرآن کے الفاظ میں

وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ(السباء.۲۸)

یعنی ہم نے آپ کو پوری انسانیت کی طرف اچھی خبر دینے والا اور برے انجام سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

اس آیت میں دو لفظ قابل غور ہیں پہلا کافۃ للناس اور دوسرا اکثر الناس لا یعلمون جس کا مطلب ہے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے یعنی To all man kind۔اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی شہر،کسی ملک،کسی قوم اور کسی زمانے کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ تمام جہاں والوں کی طرف اور رہتی دنیا تک تمام انسانوں کی طرف نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔مگر دقت یہ ہے اکثر لوگ اس حقیقت سے نابلد ہیں جس کی وجہ سے وہ آپ کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور اپنی غفلت،نادانی،جہالت،قومی اور خاندانی تعصب کی وجہ سے آپ کے دین و پیغام پر توجہ نہیں دیتے یا محض ہٹ دھرمی میں صرف نظر کر جاتے ہیں۔یہیں پر آپ پر ایمان لانے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ جہاں جس ملک اور معاشرے میں ہیں اور جو زبان وہ بولتے اور لکھتے ہیں،اس میں آپ کی ذات اور آپ کی دعوت سے ہمعصر قوموں کو واقف کرائیں اور جو بھی ذرائع و وسائل میسر ہیں ان کو بروئے کار لاتے ہوئے لوگوں تک آپ کی بات قابل فہم لب و لہجہ اور زبان و محاورات میں پہنچانے کا اہتمام کریں تا کہ آپ کی ذات اور دعوت کے سلسلے میں لوگوں کے اندر جو لاعلمی ہے وہ دور ہو جائے۔اس کے بعد وہ جو رویہ بھی اختیار کریں گے اس کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔جب تک وہ غافل اور ناواقف ہیں ہم اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔لہذا آپ پر ایمان لانے والوں پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔پہلی یہ کہ خود آپ کی سیرت وسنت کو جاننے

کا اہتمام کریں۔ پھر آپ سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنی زندگی کو اس کے مطابق گذارنے کا اہتمام کریں اور اس طرح اپنے قول اور عمل سے اپنے سچے امتی اور متبع ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ اس طرح کے قولی اور عملی شہادت سے ہی لوگوں کے سامنے آپ کی شخصیت اور دعوت کی آفاقیت واضح ہوگی اور سعید روحیں اس کو قبول کرنے کے لئے آگے آئیں گی۔

قرآن نے حضورؐ کے جس وصف پر بہت زور دیا ہے وہ آپؐ کی رحمت ورافت ہے اور یہ رحمت ورافت محض آپ کے متبعین تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ہمہ گیری، عالمیت اور آفاقیت ہے ۔قرآن کا ارشاد ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ(انبیاء.۱۰۷)

اور اے نبی ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر تمام جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر۔

یعنی آپؐ کی ذات اور آپؐ کی دعوت تمام جہاں والوں کے لئے رحمت ہے۔حضورؐ کی ذات اور آپ کی تعلیمات کس طرح جہاں والوں کے لئے رحمت ہے۔ایک تو یہ ہے کہ آپ کے دل میں تمام انسانوں اور تمام ذی روح کے لئے بے حد محبت ہے اور آپ بغیر کسی اجر کی امید کے تمام لوگوں کی بھلائی کے حریص ہیں۔دوسرے آپ جو دین لائے ہیں اس کی وجہ سے ایک آدمی دنیا میں فکر ونظر کی گمراہی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ایک پاکیزہ اور معتدل زندگی گزارنے کے لائق ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے قلب وذہن کا سکون میسر ہوتا ہے اور اس کی خارجی اور سماجی زندگی امن وسکون کا گہوارہ بنتی ہے اور سب سے بڑی بات وہ خدا کے غضب اور عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے وحی الٰہی کی روشنی میں زندگی گذارنے کا سبب خدا کی خوشنودی، اس کی معرفت اور اس کی نعمتوں بھری جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا کرم ہے جس کا کوئی حد وحساب نہیں ہے۔اور اس کے بدلے میں کیا چاہیئے بس اتنا کہ جب آپ کا نام زبان پر آئے تو محبت اور عزت کے ساتھ آپ پر درود وسلام بھیجا جائے۔نہ کوئی چڑھاوا نہ کوئی نذرانہ، نہ کوئی پوجا پاٹ۔بس اللہ کی اطاعت اور رسول سے محبت۔

حضور کی آفاقیت اور ابدیت کو قرآن نے اور کئی مقامات پر واضح کیا ہے جیسے سورہ الفرقان میں ارشاد ہے۔

تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان. ۱)

سورہ الجمعہ میں ارشاد ہے۔

وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعه . ۳)

یعنی اس رسول کی بعثت ان دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے جو ان سے ابھی نہیں ملے ہیں۔

سورہ تکویر میں ارشاد ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۷) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۲۸) تکویر

یعنی یہ قرآن تو ایک یاددہانی ہے تمام دنیا والوں کے لئے ہر اس شخص کے لئے جو تم میں راست رو بننا چاہے۔

یہ تو حضور کی آفاقیت، عالم گیریت اور ابدیت کے بارے میں قرآن کی شہادت ہے خود حضورؐ نے اپنی متعدد حدیثوں میں اپنی اس حیثیت کا تعارف کرایا ہے جس کا ہم تذکرہ کریں گے۔

آپ نے فرمایا میں ان کا بھی رسول ہوں جو اس وقت زندہ ہیں اور ان کا بھی جو میرے بعد آئیں گے۔ (ابن سعد۔ الکنز الخصاص۔ مرسلا روایت حضرت حسن)

آپ کی دوسری حدیث ہے۔ پہلے نبی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ (رواہ جابر بن عبداللہ۔ بخاری و مسلم)

آپ کی تیسری حدیث ہے۔ میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہو (ابوموسی اشعری۔ مسند احمد)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔ جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اسے ایک بار سلام مبارک باد اور جس نے مجھے نہیں دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اسے سات بار سلام اور مبارک باد۔ (انس بن مالک۔ احمد)

آپ کا وصف صرف اتنا نہیں ہے کہ آپ کی ذات میں آفاقیت ہے بلکہ آپ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں یعنی اب قیامت تک آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اللہ نے آدمؑ سے جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ حضور نبی کریم ﷺ پر آ کر مکمل ہو گیا۔ آپ کا واضح ارشاد ہے۔

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں۔ یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں جس طرح دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی نہیں ہوتی اسی طرح میرے اور قیامت

کے درمیان بھی کوئی نبی نہیں ہے۔

ان واضح ھدایات سے ظاہر ہے کہ حضور قیامت تک سبھی انسانوں کے نبی ہیں۔اس لئے قرآن نے بہت واضح اور واشگاف الفاظ میں پوری بنی نوع انسان کو یہ بتادی ہے کہ اللہ کا دین مکمل ہو چکا ہے۔اللہ نے اپنی نعمت تمام کردی ہے اور اسلام کو تمام انسانوں کے لئے اپنے دین کے طور پر پسند کیا ہے۔(المائدہ۔۳) لہذا اس دین سے ہٹ کو جو کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا وہ خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگا (آل عمران۔۱۹)

ان آیات واحادیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ بلا استثنا ساری دنیا کے نبی ہیں تمام ملکوں، قوموں، نسلوں، رنگوں، جنسوں کے نبی ہیں۔ یہاں کوئی پرایا نہیں سب اپنا ہے لہذا سب کی طرف عزت، محبت، خدمت، دلسوزی اور اپنائیت کے ساتھ پہنچنے کی ضرورت ہے اور سب کو اپنانے اور گلے لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام نہ تو زور زبردستی سے کیا جائے گا اور نہ اس کے پیچھے خوف، لالچ اور سودے بازی ہوگی بلکہ یہ کام پورے اخلاص کے ساتھ محبت، خدمت اور خیر خواہی کے جذبے سے کیا جائے گا۔اس کے لئے ضروری ہے کہ جو لوگ اہل اسلام ہیں ان کو اپنے دین اور اپنے نبی کی اچھی واقفیت ہو، وہ ایمان واخلاص کی دولت سے بہرور ہوں، ان کی اپنی زندگی تضاد وتناقض سے پاک ہو اور رسولؐ کی سچی پیروی کرتے ہوں، ان کے دلوں میں آپؐ سے بے پناہ محبت اور عزت ہو اور وہ عام انسانوں سے بے لوث محبت اور خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں۔ جب تک حضورؐ کے ماننے والے ان صفات سے متصف نہیں ہوں گے وہ اسلام کی سچی اور اچھی گواہی نہیں دے سکتے ہیں اور ان میں وہ جوہر کردار پیدا نہیں ہوسکتا ہے جس میں وہ ہر خوف اور لالچ سے آزاد ہو کر نڈر اور بے خوف ہو کر لوگوں کے سامنے سیدھی سچی بات صاف صاف کہہ سکیں اور اس کے لئے ہر طرح کا جوکھم اٹھانے کو تیار ہو جائیں۔آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم حضورؐ کا نام لیتے ہیں۔آپ پر ایمان لاتے ہیں۔آپ پر درود وسلام بھی بھیجتے ہیں۔مگر ایک تو ہم آپ کی سیرت وسنت، دین ودعوت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں دوسرے ہمارے علم واخلاص میں خامی ہے۔ہم نے خود کو فروعی معاملات میں اتنا الجھا لیا ہے کہ بنیادی باتوں پر ہمارا دھیان نہیں ہے۔ ہمارے اندر فرقہ بندی، ذات پات اور گروہ بندی اس قدر عام ہوگئی ہے جس نے ہماری جمعیت کو توڑ دیا ہے اور ہم

بہتر فرقوں اور تہتر جماعتوں میں بٹ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے عالمی برادری کے سامنے دین وملت دونوں کی شبیہہ خراب ہو رہی ہے۔ جہالت وغربت اور سیاسی عدم قوت کی وجہ سے عالمی برادری میں ہماری ساکھ اکھڑ گئی ہے اور ہم ذلت و پس ماندگی کے شکار ہو گئے ہیں۔ یہ حالات ہمارے لئے ایک چیلنج ہیں جو ہمیں دعوت فکر وعمل دے رہے ہیں۔ لہذا ہمیں اپنی بگڑی سنوارنے کے لئے اپنے منہاج پر واپس آنا ہوگا۔

انفورمیشن ٹکنولوجی کے مثبت اور منفی اثرات

آج کا دور علم وآگہی کا دور ہے انفورمیشن ٹکنولوجی کے فروغ نے اطلاعات ونشریات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ زمان ومکان کے سارے سابقہ تصورات بالکل بدل گئے ہیں ہزاروں میل کی دوری چند گھنٹوں میں طے کی جاسکتی ہے۔ دنیا کے کسی گوشے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے آپ ہزاروں میل دور اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اسے لائیو ٹیلی کاسٹ کے ذریعہ دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیپ ٹوپ یا اسمارٹ فون ہے تو گویا آپ پوری دنیا سے جڑے ہیں اور پوری دنیا آپ سے جڑی ہے۔ پرنٹ میڈیا، آڈیو، ویڈیو، سینیما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، سیل فون وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ خبروں اور خیالات کی بڑے پیمانے پر ترسیل ہوتی ہے اور یہ لوگوں کی جانکاری کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے ہیں۔ روایتی میڈیا جس کو پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کہتے ہیں کے ساتھ ساتھ اب سوشل میڈیا کا پلیٹ فارم بھی بہت بڑا ہو گیا ہے اور آج کل واٹس اپ، فیس بک ٹوئٹر، انسٹا گرام، لنکیڈ وغیرہ کے ذریعے عام لوگ بھی اپنی باتیں لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ غرض انفورمیشن ٹکنولوجی میں جو انقلاب آیا ہے اس نے پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس سب کا فائدہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ لوگوں کے بیچ کی دوریاں کم ہوتی اور لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان اور سمجھ پاتے اور تمام چیزوں کی ایک سچی اور صحیح تصویر لوگوں کے سامنے آتی اور لوگ ان کو معروضی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کے قابل بنتے۔ مگر جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ٹکنولوجی (Value neutral) یعنی قدر معلق ہوتی ہے جس کا صحیح استعمال بھی ہوسکتا ہے اور غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ اس ٹکنولوجی کے استعمال کرنے والے کے ذہن ونظریہ اور اس کے ضابطہ قدر (Value system) سے گائیڈ ہوتا ہے۔ لہذا آپ ان

ذرائعوں سے لوگوں کو صحیح اور اچھی باتیں بھی پہنچا سکتے ہیں اور تمام طرح کی گندگی، غلط اور بیہودہ باتیں بھی انڈیل سکتے ہیں۔اس وقت میڈیا کا جو گندہ اور بے ہنگم روپ دیکھنے کو مل رہا ہے اس نے تمام حساس ذہنوں کو پریشان کر رکھا ہے اور یہ چیز ایک نعمت کی جگہ عذاب بنتی جا رہی ہے۔لہذا آج کا دور جتنا انفورمیشن کا دور ہے اس سے کہیں زیادہ مس انفورمیشن کا دور ہے اور اس وقت اسلام اور مسلمان اس کے سب سے زیادہ شکار ہیں۔اس وقت عالمی میڈیا اور سیاسی تنصیبات (Establishment) نے اسلام پر ہر چہار طرف سے یلغار کر دیا ہے۔مغربی استعمار نے بہت حد تک کمیونزم پر فتح حاصل کر لی ہے جس وقت روس میں کمیونزم ختم ہو رہا تھا اسی وقت برٹش پرائم منسٹر مارگریٹ تھیچر نے اعلان کیا تھا کہ اب ہمارا اگلا نشانہ اسلام ہوگا۔لہذا آپ دیکھ رہے ہیں کہ مغرب نے اسلام اور اسلامی تحریکات کے خلاف ایک نظریاتی، تہذیبی اور تمدنی جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کو لگتا ہے کہ جس طرح اس نے کمیونزم کو شکست دے کر اسے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے اسی طرح اسلام کو بھی پسپا کر کے اس سے اس کی نظریاتی زمین چھین لے گا۔مگر اسے یہ نہیں معلوم ہے کہ اسلام محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک دین ہے اور دین کی فطرت میں دوام ہوتا ہے۔دین سیاست کی بیساکھی کے سہارے نہیں چلتا بلکہ اس کے اندر ایک روحانی قوت نافذہ ہوتی ہے جو شکست و پسپائی میں بھی اس کو زندہ اور باقی رکھتی ہے۔اسلام نے اپنی تاریخ کے طویل مرحلے میں شکست و فتح کے مختلف مراحل دیکھے ہیں اور تاریخ کے آنکھوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح شکست و پسپائی کے بعد وہ سرخرو اور سرفراز ہو کر ابھرا ہے۔اور کیسے صنم خانے سے کعبہ کے پاسبان ملتے گئے ہیں۔یہ معجزہ نہیں ہے بلکہ اسلامی قوت کی تسخیر ہے جس کا مظاہرہ بار بار ہو چکا ہے اور آگے بھی ہوگا۔حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں، ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔گویا حق نے اسے فطرت دوام بخشی ہے۔لہذا پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہیں جا سکتا ہے۔اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس نور کی تکمیل کر کے رہے گا اس لئے قیامت تک کش مکش حق و باطل ہوتی رہے گی اور اسلام طویل وقلیل آزمائشی ادوار سے گذرتے ہوئے کامیاب وسرخرو ہوگا۔اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

شرار بولہبی تو اول روز سے چل رہی ہے۔اسلام کے ابتدائی ایام سے ہی ہر طرح کے کفار ومشرکین معاندین ومنافقین جتھ بنا کر اسلامی تحریک کا راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے اورانہوں نے طعن وتشنیع ،طنز واستہزا،شب وستم ،بائیکاٹ اور ملک بدری اور جارحانہ حملوں کے ذریعہ اسلام کے چھوٹے سے قافلے کو نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر تاریخ کی آنکھوں نے دیکھا کہ جانثاروں کا ایک چھوٹا سا گروہ غالب وسرفراز ہوااوراسلام کو مٹانے والے خود مٹ گئے ۔تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر بالکل اس صورت میں نہیں جس صورت میں اس نے پہلی بار خود کو پیش کیا تھا بلکہ اس میں مقام اورافراد بدلے ہوئے ہوں گے اوراسٹیج بھی دوسرا ہوگا۔

مسلم دنیا کی تصویر

اسلامی دنیا پچھلی پانچ صدیوں سے عالم غفلت میں پڑی تھی ۔اسی دوران دنیا میں بڑے بڑے انقلابات آئے انگلینڈ کا صنعتی انقلاب جس نے دنیا بھر کی سیاست ،معیشت عسکری اورجغرافیائی ہیئت کو تبدیل کردیا۔اسلامی دنیا ان ساری تبدیلیوں سے آنکھیں موندے جوتیوں میں دال بانٹتی رہی۔اچانک استعماری قوتوں نے اسے آدبوچا اور پوری کی پوری اسلامی دنیا عزت وآزادی سے محروم کرکے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔مادہ اورجسم پر قبضہ مکمل قبضہ نہیں ہے جب تک ذہن وضمیر اورروح میں غلامانہ جذبات سرائت نہیں کرتے اس وقت تک آزادی کی چنگاری باقی رہے گی جو کسی وقت بھی شعلہ زن ہوسکتی ہے۔لہذااستعماری قوتوں نے جہاں ایک طرف اپنی سیاسی ،انتظامی ،قانونی اورفوجی تیاریوں کے ذریعہ اپنے قبضہ کو استحکام اور دوام بخشنے کی کوشش کی وہیں علم وسائنس ،فنون لطیفہ اورابلاغ وترسیل کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں اورمزاج کو بدلنے کا اہتمام کیا تاکہ انہیں مسلمان ملکوں اورآبادیوں میں ایک مضبوط کنسٹی چیونسی بنانے میں مدد ملے جن کی مدد سے وہ نہ صرف اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے میں کامیاب ہوں بلکہ اپنے اقدار کو بھی رائج کرنے میں کامیاب ہوں۔ان کی یہ تکنک بہت کارگر ثابت ہوئی ۔یہاں تک کہ جب ان ملکوں سے ان کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا اس کے بعد بھی نہ صرف ان کے اقدار قائم اور باقی رہے بلکہ روز بروز مضبوط ہوتے گئے کیونکہ ان کی فکری اولادوں نے ان کے ان ورثوں کو لوگوں کے اندر

جاری اور ساری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اس وقت آپ اگر مسلم دنیا کی سیاسی صورتحال پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ تمام جگہوں پر یا تو بادشاہت ہے، یا اٹوکریسی ہے۔یا فوجی ڈکٹیٹرشپ ہے مغرب جو جمہوریت کا دلدادہ ہے اور دنیا میں جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے بہت کوشاں ہے، مسلم ممالک میں جمہوری تحریکوں کی حمایت نہیں کرتا بلکہ وہ مطلق العنان حکمرانوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور اگر کہیں کوئی جمہوری حکومت قائم بھی ہوجاتی ہے تو اسے سازشوں کے ذریعہ گرادیتا ہے۔

وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے سیاسی اورنظریاتی مفاد کے لئے سازگار ہے۔مطلق العنان حکمراں جو مغرب کی بیساکھی کے سہارے حکومت کرتے ہیں وہ اپنی بقا کے لئے مغرب پر منحصر ہوتے ہیں لہذا ان سے کوئی بھی سودے بازی کرنا آسان ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ان کے احسان مند ہوتے ہیں اور ان کے مستقل دباؤ میں کام کرتے ہیں۔دوسرے دنیا بھر میں یہ افواہ پھیلانے میں بھی مدد ملتی ہے کہ اسلام کا مزاج جمہوری نہیں ہے اور ثبوت کے طور پر وہ ان ممالک کو پیش کرتے ہیں۔اس طرح عالمی برادری میں اسلام اور مسلمان کی خراب شبیہہ بنانے اور پیش کرنے میں مدد ملتی ہے۔یہ سارا کچھ بہت ارکسٹرئیڈ ڈھنگ سے ہوتا ہے جس میں پوری فنی مہارت سے کام لیا جاتا ہے۔آج دنیا میں اسلام اور مسلمان کی جو شبیہہ بنی ہے وہ انہی وجوہات سے ہے۔

وہ ان حکمرانوں پر دباؤ بنائے رکھنے کے لئے ان کی ایک مخالف لابی بھی کھڑی کر کے رکھتے ہیں اور ان کو پیسہ، تمام طرح کے لوجسٹک سپورٹ اور پروپگنڈے کے ذریعہ بلکہ بعض جگہوں پر ان کو ہتھیار فراہم کر کے ان کو ارم اسٹرگل کے لئے ابھارتے ہیں اور پھر اس کو تشہیر دے کر دوطرفہ دباؤ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ان تمام کو ہتھیار اور لوجسٹک سپورٹ دے کر دہشت گردانہ کاروائی کے لئے تیار کرتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان کے اشارے پر جہاں چاہتے ہیں دہشت گردی کرتے ہیں۔پھر ان دہشت گردانہ کاروائیوں کے نام پر عالمی معاہدات ہوتے ہیں اور ساری دنیا کی اسلام مخالف قوتیں ایک ساتھ ہوکر مسلم آبادیوں اور علاقوں پر حملہ کر کے ان کو تہس نہس کرنے کا منصوبہ بناتی ہیں کئی جگہوں پر خانہ جنگی اور سیاسی عدم استحکام کی بنیادی وجہ استعماری قوتوں کی یہ ریشہ دوانیاں ہیں۔اس سے ان کو دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ایک مسلم ملکوں، آبادیوں اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے

اوران کا استحصال کرنے کا جواز مل جاتا ہے دوسرے اسلام اور مسلمان کو عالمی برادری میں بدنام اوررسوا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ صورتحال کئی صدیوں سے جاری ہے اور ابھی تک اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں مل پارہی ہے۔ جب تک مسلم دنیا میں جمہوریت اور جمہوری قدروں کی آبیاری نہیں ہوتی ہے انسانی شرف وآزادی بحال نہیں کی جاتی ہے تعلیم وتحقیق کی حوصلہ افزائی کا ماحول نہیں بنتا ہے۔ سائنٹفک ٹمپر کا فروغ نہیں ہوتا ہے اور قانون کی حکمرانی قائم نہیں ہوتی ہے اس وقت تک اسلام کی رسوائی ہوتی رہے گی اور مسلم دنیا کی عالمی برادری میں اچھی شبیہہ نہیں بن سکتی ہے۔

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے

عالمی برادری میں اسلام کی شبیہہ

ہم اس وقت اکیسویں صدی میں ہیں ۔اس وقت ساری دنیا میں اسلاموفوبیا اور xenophobia (اسلام اور مسلمانوں سے نفرت) اپنے عروج پر ہے۔ ہر طرف اسلامی دہشت گردی کا چرچہ ہے اور پوری عالمی برادری کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ اسلام میں تحمل اور برداشت کا مادہ (Tolerance) نہیں ہے۔ اسلام پرامن بقائے باہم کا قائل نہیں ہے۔ یہ مارکاٹ، ظلم ودہشت گردی کا مبنی ہے۔ لہذا یہ جدید تہذیب ومعاشرت اور مہذب دنیا کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔اس لئے جب تک اس کا پوری طرح استیصال نہیں کیا جاتا اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا ہے۔اس لئے پوری دنیا کو اس خطرے سے آگاہ ہونا چاہئیے ءاوراس کے خلاف اجتماعی جدوجہد کرنی چاہئے۔

اگر آپ دنیا کے نقشہ پر نظر دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت پوری دنیا دوسو سے زائد جغرافیائی خطوں یعنی ملکوں میں منقسم ہے جہاں مختلف قوموں اور مذاہب کے ماننے والوں کی آزاد خودمختار حکومتیں ہیں۔ ماضی بعید اور آج کی دنیا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ماضی بعید میں ایک ملک دوسرے ملک سے بالکل الگ ہوتا تھا اور وہاں زیادہ تر ایک قوم اور مذہب نسل اور رنگ کے لوگ رہتے تھے۔ مگر جیسے جیسے نقل وحمل کے ذرائع اور وسائل میں اضافہ ہوا اور سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور وہاں قیام پذیر ہونے کا رجحان

فروغ پایا ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے میں اور ایک ملک کے لوگ دوسرے ملکوں میں آباد ہونے لگے اس طرح وحدانی سماج دھیرے دھیرے تکثیری سماج میں تبدیل ہونے لگا۔اس وقت دنیا کا کوئی خطہ اور ملک ایسا نہیں ہے جہاں وحدانی سماج (Unitary society) ہے بلکہ ہر جگہ تکثیری سماج (Plural society) ہے تکثیری سماج کا مطلب ہے ایک علاقے میں مختلف نسل، مذہب، ذات، جنس اور رنگ کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں ملک کے دستور اور ضابطہ کے تحت تمام تر شخصی اختیار و آزادی کے ساتھ پرامن طور پر زندگی گذارتے ہیں اس وقت آپ کو دنیا کے ہر ملک میں ہر ملک وقوم، رنگ ونسل اور مذہب کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مل جائیں گے جہاں انہیں یا تو پورے شہری حقوق حاصل ہیں یا انہیں تمام تر انسانی آزادی کے ساتھ کام کرنے اور رہنے کی اجازت ہے۔گلوبلائزیشن نے اس رجحان کو اور بھی فروغ دیا ہے اور ایشیا ،افریقہ یورپ ، نارتھ اور ساوتھ امریکہ اور اسٹریلیا کے لوگ آپ کو چین،عرب ،ہندوستان،انگلینڈ،امریکہ،اسٹریلیا غرض ہر ملک اور ہر خطے میں مل جائیں گے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تکثیریت (Pluralism) اس دور کا خاصہ ہے اور یہ معاشی ترقی اور استحکام کے لئے گروتھ انجن کا کام کرتا ہے۔لہذا اس ماحول اور معاشرے میں کسی ملک اور سماج کی ترقی اور خوشحالی کے لئے پرامن ماحول کا ہونا بہت ضروری ہے۔جس کے لئے ہر فرد اور گروہ کو اپنے معتقدات اور اقدار کے مطابق عزت اور آزادی کے ساتھ جینے اور کام کرنے کا حق دینا لازمی ہے تاکہ وہ ایک پرامن اور آزادانہ فضا میں اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کے ذریعہ اپنا اور پورے ملک اور انسانیت کی مجموعی فلاح میں اپنا حصہ ادا کرسکے،کوئی بھی دین ونظریہ اگران اقدار پر کھرا نہیں اترتا تو آج کے مہذب معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

اس وقت اسلام کو جس Darkest colour میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے عدم تحمل (intolerance) اور دہشت گردی (Terrorism) سے جوڑ کر جدید تہذیب ومعاشرت کے لئے ایک خطرہ بتایا جاتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کا معروضی طور پر تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیں اور پھر دیکھیں کہ اس پروپیگنڈے میں کتنا دم ہے۔اسلام کا دوہی سب سے مصدق سرچشمہ ہے ایک قرآن اور دوسرا صحیح احادیث۔ہم کوشش کریں گے کہ قرآن وحدیث

اورسیرت کے حوالے سے اسلام کی صحیح تصویر آپ کے سامنے رکھیں تا کہ آپ خود یہ فیصلہ کرسکیں کہ اسلام کے خلاف اس وقت عالمی میڈیا، ہندوستانی میڈیا اور بعض سیاسی اور مذہبی گروہوں اور نام نہاد دانشوروں کی طرف سے جو باتیں کہی جارہی ہیں ان میں کتنی سچائی ہے۔ میں تاریخ میں جانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ بیشتر تاریخ اختراعی (Cooked) ہوتی ہیں ۔دوسرے تاریخ میں اگر کچھ اچھی مثالیں ہیں تو کچھ بری مثالیں بھی ہیں۔کسی بادشاہ یا خلیفہ کا کردار ہمارے لئے سند نہیں ہے۔سند قرآن وسنت ہے اور ہم اس کو مانتے ہیں۔چونکہ بات سیرت رسول کی ہورہی ہے اس لئے ہمیں اوریجنل سورسز پر ہی خود کو مرتکز رکھنا ہوگا۔

اسلام کی حقیقت

اسلام کے سلسلے میں سب سے بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کی ابتدا حضرت محمد ﷺ سے ہوتی ہے۔حضورؐ اسلام کے بانی یا پہلے نبی نہیں ہیں بلکہ آپ اسلام کے آخری نبی ہیں اور آپ کے ذریعہ اسلام کی تکمیل ہوئی ہے۔قرآن کی رو سے اسلام انسان کا پہلا دین ہے۔دھرتی پر جو پہلا انسان آیا جس کو قرآن نے آدم کہہ کر پکارا ہے اس کا دین اسلام تھا۔پھر جیسے جیسے اس کی اولاد اور ذریات زمین پر پھیلتی گئی اس میں تنوع اور اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا چنانچہ ساری دنیا میں ہر ملک اور قوم میں اور ہر زبان میں نبی اور رسول آئے جنہوں نے اللہ کے تمام بندوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دی اور اس کی طرف بلایا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی بات مانی اور بہت سے لوگوں نے نہیں مانی ۔اس طرح لوگ قوموں ،ملکوں ، برادریوں ،قبیلوں اور مختلف مذاہب میں منقسم ہوتے چلے گئے اور وحدت دین کا تانہ بانہ بکھر گیا۔اس طرح دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں بہت سے مذاہب ومتعقدات پیدا ہوئے جن کے درمیان اختلاف وتصادم بھی ہوا۔قرآن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

> ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے (پھر جب انہوں نے آپس میں اختلاف کیا) تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے اور ڈرانے آئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تا کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کررہے ہیں وہ اس

کولوگوں کے بیچ فیصلہ کر دیں اور یہ اختلاف انہی لوگوں نے کیا جنہیں کتاب دی گئی تھی باوجود یکہ ان کے پاس پہلے ہی احکام آ چکے تھے اور یہ اختلاف صرف اس لئے کیا کہ ایک دوسرے سے زیادہ لینا چاہتے تھے۔ تو جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنی مہربانی سے سچائی کی راہ دکھائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ (۲۔۲۱۳)

ان آیات میں چھ باتیں بہت واضح طور پر بتائی گئی ہیں۔

(۱) ابتداء تمام انسان ایک ہی امت تھے۔

(۲) پھر ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔

(۳) ان اختلافات کو دور کرنے کے لئے اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ تمام نبیوں نے خدائے واحد کی طرف بلایا اور ان کے اندر در آئے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی

(۴) مگر لوگوں نے اختلاف جاری رکھا۔

(۵) اختلاف ان لوگون نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی یعنی وہ صاحب علم تھے۔

(۶) مگر انہوں نے اختلاف اس لئے کیا کیونکہ وہ اپنے حق سے زیادہ لینا چاہتے تھے۔

آپ پوری عالمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں چاہے سیاسی اختلافات ہوا ہو یا مذہبی اختلافات اولاً تو یہ اختلاف ان کے صاحب علم لوگوں نے کیا اور دوم اس کا بنیادی مقصد اپنی برتری قائم کرنا اور اپنے حصے سے زائد حاصل کرنا رہا ہے۔ یہ اختلاف کا بنیادی نکتہ ہے جس کے لئے نہ جانے کتنے نظریات گڑھے گئے اور دنیا میں کتنا خون وفساد برپا کیا گیا۔

اس طرح حضرت محمدؐ آج سے پندرہ سو سال پہلے یکا یک منکشف ہونے والی سچائی کے مظہر نہیں ہیں بلکہ ازل سے چلی آتی ہے سچائی کی حتمی اور آخری کڑی ہیں جن پر اللہ نے اپنے دین کا اتمام کر کے پوری دنیا کو اس طرف بلایا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا رب رب العرب یا رب المسلمین نہیں بلکہ رب العالمین ہے تمام جہانوں کا رب ہے، اسلام کا رسول کسی خاص خطہ اور قوم کا رسول نہیں ہے بلکہ رحمۃ العالمین ہے۔ اور اسلام کی کتاب صرف مسلمانوں کے لئے کتاب ھدایت نہیں ہے بلکہ ھدی الناس ہے تمام انسانوں کے لئے ھدایت ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام اور قرآن

کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گی کہ نہ اللہ نے تکوینی جبر سے کام لیا ہے اور نہ قانونی جبر کی اجازت دی ہے۔ اگر اللہ تکوینی جبر سے کام لیتا تو جیسے جمادات و نباتات کو ایک ساخت میں پیدا کیا اور اسے کوئی اختیار اور آزادی نہیں دی اسی طرح تمام انسانوں کو بھی ایک ہی دین اور عقیدہ کا قدرتی طور پر پابند کرتا اور اس کو فکر و عمل کی آزادی سے محروم کر دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ قرآن نے صاف صاف کہا۔

اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین میں سب کے سب ایمان لے آتے تو سارے اہل زمان ایمان لے آئے ہوتے (سورہ یونس ۹۹۔۱۰)

اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی تو وہ سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ (سورہ النحل۔۹۳)

مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ انسان کو آزادنہ انتخاب کا موقع دیا ہے۔

قرآن صاف صاف کہتا ہے۔

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کر دے۔ (الکہف۔۲۹۔۱۸)

قرآن کہتا ہے۔

دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے (البقرہ۔۲۵۶)

اس نے اپنے نبی سے کہا۔

''آپ نصیحت کئے جایئے کیونکہ آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپؐ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔ (الغاشیہ ۲۲۔۲۱)

اس طرح یہ آیات تکوینی جبر اور انسانی جبر دونوں کی نفی کرتے ہیں اور ایک فرد کو اپنے فکر و خیال کی آزادی جس کو آج کی اصطلاح میں عقیدے اور عبادات کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں مذہبی آزادی کہا جاتا ہے کا پورا پورا اور ناقابل تنسیخ حق دیتا ہے۔ اب آپ اس بنیادی نکتہ کو دھیان میں رکھ کر قرآن کھولیں تو آپ کو اسلام کی حقیقی فطرت سے واقف ہونے کا موقع ملے گا اور اس کے ذریعہ سیرت رسول کو سمجھنے میں مدد ملے گی کیونکہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی قرآن سیرت کی سب سے پہلی کتاب ہے اس کی تائید حضرت عائشہ کی اس روائت سے بھی ہوتی ہے جس میں جب لوگوں نے آپ سے حضور کے اخلاق حسنہ اور روزمرہ زندگی کے معمولات پوچھے

تو آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کی زندگی ،آپ کا اخلاق، آپ کے معمولات اور آپ کے معاملات ،آپ کی دعوت سب قرآن سے گائیڈ ہوتی تھی ۔خود قرآن نے اعلان کیا وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحی یوحی (سورہ النجم ۔۴۔۳) یعنی رسول اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتے ہیں بلکہ وہ وہی کہتے ہیں جو وحی کے ذریعہ ان پر نازل کی جاتی ہے۔اس لئے حضورؐ کو سمجھنے کے لئے اور آپ کے دین اور طریق دعوت کو جاننے کے لئے قرآن کا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ قرآن پاک کھولئے ۔یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو روز جزا کا مالک ہے ۔اس کتاب میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے یہ انسانوں کی ھدایت کے لئے اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔یہ کتاب وہ ہے جو ازلی اور ابدی سچائیوں کا مخزن ہے اور ان کتابوں اور رسولوں کی تائید کرتی ہے جو اس سے پہلے آچکے ہیں۔لہذا اب کوئی اگر ایمان اور اخلاص کے ساتھ بندگی رب کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو یہ کتاب اس کی واحد ،مستند اور مکمل گائیڈ بک ہے۔جس پر ایمان لاکر اور جس کی پیروی کر کے وہ اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار سکتا ہے۔بصورت دیگر وہ خدا کے غضب اور دائمی خسران سے دوچار ہوگا۔

اس بات کو واضح اور دوٹوک انداز میں کہنے کے باوجود وہ کسی کو جبر نہیں کرتا کہ اس کی بات لازماً ماننی ہوگی بلکہ وہ انسانوں کو اس کو ماننے اور نہ ماننے دونوں کی اجازت دیتا ہے اور اپنے نبی سے کہتا ہے کہ آپ تمام لوگوں تک اپنی بات کو کھول کھول کر پوری دلسوزی اور تمام تر ھمدردی کے ساتھ پہنچادیں ۔اگر یہ مان لیتے ہیں تو انہی کے لئے بہتر ہوگا اور اگر نہیں مانتے ہیں تو وہ خدا کے غضب کے شکار ہوں گے۔ بہرحال انعام دینا یا عذاب دینا یہ خدا کا کام ہے۔آپ کا یا کسی اور انسان کا کام نہیں ہے ۔اگر آپ نے اپنی بات کماحقہ پہنچادی ہے تو آپ بری الذمہ ہیں ہاں اگر آپ نے لوگوں تک اس دین ودعوت کو ٹھیک سے نہیں پہنچایا اس وقت آپ جوابدہ ہوں گے۔اس لئے آپ پر پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔حساب لینے والا اللہ ہے (الرعد۔۴) لہذا لوگ آپ کی بات نہیں مانتے ہیں تو اس کے لئے گھل گھل کر جان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔(سورہ الشعراء۔۳)

ان بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھئے پھر قرآن اور سیرت رسولؐ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے تو اسلام کی فطرت اور عالمی انسانی سماج کے بارے میں اس کی پوری فکر واضح ہوکر آپ کے سامنے آجائے گی جس سے آپ خود ایک بہتر نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

سورہ البقرہ کی ابتدائی ایک سے بیس آیتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس دعوت کے نتیجے میں چار طرح کے گروہ پیدا ہوں گے جن میں ایک گروہ مومنین کا ہوگا دوسرا گروہ اس کے ٹھیک الٹ منکرین کا ہوگا جو کسی طرح کوئی بات مان کر نہیں دیں گے۔ تیسرا گروہ منافقین کا ہوگا اور چوتھا گروہ مذبذبین کا ہوگا۔ پھر ان گروہوں کے بہت سے ذیلی گروہ ہوں گے جن کی تفصیل قرآن پاک میں مختلف مقامات پر پیش کی گئی ہے۔

قرآن کی رو سے منکرین میں ایک گروہ ایسا ہوگا جن کے سامنے کوئی دلیل۔ کسی طرح کی شہادت، کوئی نشانی، کسی طرح کا اخلاق اور برتاؤ غرض کچھ بھی ان کو راہ حق کی طرف مائل نہیں کر سکے گی، قرآن کے الفاظ میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے (سورہ البقرہ۔۷) گویا وہ قبول حق کے معاملے میں بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ اس لئے وہ کسی طرح پلٹنے والے نہیں ہیں (سورہ البقرہ۔۱۸)

ایسے تمام لوگ جنہوں نے قرآن اور رسول کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ قرآن نے ان کو کھلے لفظوں میں یہ کہا کہ تم اگر اللہ واحد کی عبادت پر راضی نہیں ہو تو ہم بھی تم پر یہ واضح کئے دیتے ہیں کہ ہم خدائے واحد کو چھوڑ کر کسی اور کی پوجا یا عبادت کرنے والے نہیں ہیں۔ اس طرح تمہارا عقیدہ اور مسلک الگ ہے اور ہمارا عقیدہ اور مسلک الگ ہے۔ اس صورت میں ہم دونوں کے درمیان اختلاف عقیدہ کے باوجود امن اس طرح قائم رہ سکتا ہے کہ نہ ہم تم پر کوئی جبر کریں اور نہ تم ہم پر کوئی جبر کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ نہ ہم تمہارے دین اور عقیدے کے معاملے میں کوئی مداخلت کریں اور نہ تم ہمارے دین وعقیدے کے معاملے میں کوئی مداخلت کرو۔ لکم دینکم ولی دین (سورہ الکافرون۔۶) یعنی تمہارا دین تمہارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے اگر اس سنہرے اصول کو ایمانداری سے تسلیم کر لیا جائے تو ایک تکثیری سماج میں جہاں کئی مذاہب کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں وہ اپنے عقیدے اور نظام عبادت کے الگ الگ ہونے کے باوجود پرامن

بقائے باہم کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

آج کل اسلام کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلام میں اختلاف وتنوع کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔لہذا وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے دین کو برسرحق نہیں مانتا بلکہ جو دوسرے دین کے ماننے والے ہیں قرآن کی اصطلاح میں وہ کافر ومشرک ہیں اس لئے ان کو دوست بنانے سے منع کرتا ہے بلکہ ان کو جہاں پاؤ مارنے اور قتل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔لوگ سیاق وسباق اور پس منظر سے کاٹ کر ان آیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور اس بنیاد پر وہ اسلام کو تشدد اور دہشت کا مبنی مانتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام جدید تہذیب اور مہذب دنیا کے لئے ایک خطرہ ہے۔لہذا دنیا بھر کی اسلام دشمن طاقتوں کو آواز دی جارہی ہے کہ اسلام اور اس کے ماننے والوں کے استیصال کے لئے متحد ہوں اور مل جل کر ان پر یلغار کیا جائے تا کہ اس خطرے سے انسانی آبادی کی حفاظت کی جاسکے۔اس کے لئے بڑے بڑے ادارے اور تھنک ٹنک وجود میں لائے گئے ہیں اور خفیہ واعلانیہ معاہدات کئے جارہے ہیں۔

لیکن آپ کھلے ذہن سے اسلام کا اور ان آیات کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر اس کی حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے گی۔جو لوگ اسلام پر ایمان نہیں لاتے ہیں یا ایمان نہیں لائیں گے اس کو قرآن نے دو خانوں میں بانٹا ہے۔ایک وہ لوگ ہیں جو اسلام پر ایمان نہیں لاتے ہیں یا نہیں لائیں گے۔مگر وہ مسلمانوں سے ان کے دین اور ایمان کی وجہ سے جھگڑا نہیں کرتے ہیں اور ان کے استیصال کے درپے نہیں ہیں وہ اپنے دین پر ایمانداری سے عمل کررہے ہیں۔مگر مسلمانوں سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔قرآن نے ایسے لوگوں کو غیر متحارب منکرین مانا ہے اور ایسے لوگوں سے جنگ کی اجازت نہیں دی ہے۔قرآن کا صاف صاف اعلان ہے۔اللہ تمہیں اس سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔اللہ تو صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہیں نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ہے انہیں جو کوئی دوست

بنائے وہ ظالم ہے۔(سورہ الممتحنہ۔۸۔۹)

یہ آیات ان تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیتی ہے۔اسلام نے ان سے لڑنے کی ھدایت کی ہے اوران کو دوست بنانے سے منع کیا ہے جو کھلے عام مسلمانوں سے دشمنی کرتے ہیں اوران کے استیصال کے درپے رہتے ہیں۔ایسے لوگوں کوقرآن نے متحارب کافر مانا ہے اوران سے نہ صرف لڑنے کی اجازت دی بلکہ ان کا پوری طرح استیصال کرنے کاحکم دیا ہے تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اورزمین فساد فی الارض سے محفوظ ہوجائے اور خدا کے بندے خدا کی زمین پر پوری آزادی اورامن کے ماحول میں خدائے واحد کے احکام کی بجاآوری کرسکیں۔

اب مجھے یہ بتایا جائے کہ جب دوملکوں کے درمیان جنگ چھڑی ہواور دوفوجیں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار ہوں تو اس وقت ان فوجوں کا کمانڈر اپنے سپاہیوں کو کیا حکم دے گا کہ جب دشمن سامنے ہوتو اس پر بم برسانے کے بجائے پھول برسائیں اور جب وہ فرشتہ اجل بن کر آئے تو اپنے ہتھیار پھینک کر اسے گلے لگائیں یا ان کو حکم دے گا کہ دشمن کا پوری پامردی سے مقابلہ کریں،کسی طرح کی کمزوری نہ دکھائیں،دشمن سے ہروقت چوکنا رہیں۔دشمن کے کسی فرد کو دوست نہ بنائیں اور پوری قوت اور جوانمردی سے اس کا مقابلہ کریں اوراس وقت تک لڑیں جب تک دشمن پوری طرح پسپا نہ ہوجائے اوراس پر مکمل فتح حاصل نہ ہوجائے۔جو حکم حالت جنگ میں دیا جائے گا وہ حکم حالت امن میں نہیں دیا جائے گا۔قرآن حالت جنگ اور حالت امن ہر دوصورت میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔اب اگرآپ حالت امن میں رہتے ہوئے حالت جنگ کے احکامات کا حوالہ دیں گےتو آپ کبھی صحیح نتیجہ پرنہیں پہنچ سکتے ہیں۔اگر یہ کام غلط فہمی کی وجہ سے کیا گیا ہےتو قابل معافی ہے۔مگر جان بوجھ کر سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کو پیش کیا گیا ہےتو اس کو فتنہ پروری اور Mischievous act مانا جائے گا جس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا اورلوگوں کے اندر بدگمانی پیدا کرکے اسلام کے خلاف ماحول تیار کرنا ہے جس کو آج کی اصطلاح میں Islamphobia اور xenophobia کہا جاتا ہے۔

قرآن نے جولوگ نہیں لڑتے ہیں ان سے لڑنے اوران کو مارنے کو بہت بڑا ظلم اور گناہ بتایا ہے اوراس کے نزدیک ایک انسان کا ناحق قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اورایک معصوم انسان کی

جان بچانا پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے۔قرآن کے الفاظ میں۔

جوکوئی کسی کی جان لے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کی جان کو بچایا۔

ایک دوسری جگہ فرمایا۔وہ اس جان کو جس کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے (الفرقان۔۶۸)

یہ حرمت کب ختم ہوتی ہے جب لوگ ظلم کرتے ہیں۔مسلمانوں سے برسر جنگ ہوتے ہیں اور انہیں بے قصور اپنے گھروں سے نکالنے کے درپے ہوتے ہیں اس وقت ان کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے قرآن کے الفاظ میں۔

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے، انہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔(الحج ۳۹۔۴۰)

ایک دوسری جگہ اس ظلم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا۔

تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے ہو جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم وجفا کار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما۔(النساء۷۵)

غرض قرآن ایسے لوگوں سے بے شک لڑنے کا حکم دیتا ہے جو مسلمانوں سے محض اس لئے لڑتے ہیں کیونکہ وہ ایک خدائے واحد کی بندگی کرتے ہیں۔مگر جو لوگ کافر اور مشرک ہونے کے باوجود مسلمانوں پر ان کی دین اور عقیدے کی وجہ سے نہیں لڑتے ہیں ان پر دست درازی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس طرح قرآن کے مطالعہ سے ایک بات واضح ہے کہ ہم چاہے پسند کریں یا ناپسند دنیا میں ہمیشہ ایک گروہ رہے گا جو کبھی اس دین پر ایمان نہیں لائے گا۔وہ گروہ ہمارے ملک اور سماج میں بھی ہوگا اور دنیا کے اور ملکوں اور سماج میں بھی ہوں گے۔اہل اسلام کہیں اکثریت میں ہوں گے اور

کہیں اقلیت میں اکثریت کا مطلب ہے جہاں ان کی حکومت ہوگی اور وہ فیصلے کے مقام پر فائز ہوں گے۔اقلیت کا مطلب ہے جہاں ان کی حکومت نہیں ہوگی اور وہ فیصلے کے عمل میں شریک نہیں ہوں گے یا ان کی حصہ داری بہت معمولی ہوگی۔ ہر دوصورت میں ان کا رویہ کیا ہوگا۔ جہاں وہ اکثریت اور حکومت میں ہیں وہاں ان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان کے حدود میں جولوگ ان کے دین اور عقائد کونہیں ماننے والے ہیں بلکہ کسی دوسرے دین وشریعت میں یقین رکھتے ہیں انہیں پوری مذہبی،ثقافتی اور سماجی آزادی فراہم کی جائے یعنی ان کے جان، مال عزت آبرو، مذہبی مقامات اور مذہبی ثقافتی اور سماجی آزادی متحقق کی جائے تاکہ وہ بےخوف اور بےکھٹک اپنے مذہبی متعقدات کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں نیز اپنی نسلوں کی حفاظت وتربیت کرسکیں۔انہیں کسی خوف اور جبر کا احساس نہیں ہو بلکہ وہ اپنے تمام انسانی اور شخصی حقوق کے ساتھ اس ملک اور سماج میں زندگی گذاریں اور تمام طرح کی معاشی،سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔کوئی ملک اور سماج کتنا اسلامی ہے اس کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس ملک اور سماج میں غیر مسلم اقلیت کتنی محفوظ اور کتنی آزاد ہے اور اس کے خلاف ہونے والی زیادتیوں کے تدارک کے لئے کتنی موثر میکنزم موجود ہے اور جوعناصر ان کے خلاف زیادتیاں کرتے ہیں ان پر کتنی سرعت کے ساتھ کاروائی کی جاتی ہے اور سزادی جاتی ہے۔اگر کوئی ملک اور سماج اس ٹسٹ میں فیل کر جاتا ہے تو چاہے وہ کتنا ہی دعویٰ کرے اسے صحیح معنوں میں ایک اسلامی ملک اور سماج نہیں مانا جاسکتا ہے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

خبردار! جوشخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا۔(ابوداؤد۔کتاب الجہاد)

اس مضمون کی تائید بہت سارے معاہدات اور صلح ناموں سے ہوتے ہیں جوخود حضورؐ نے اور خلفائے راشدین نے مختلف قوموں کولکھ کر دئے جب وہ اسلامی حکومت کے زیراثر آئے۔ان میں ان کے جان، مال، مذہب حاضر وغائب، مذہبی نشانات اور مذہبی حیثیت سب کے حفاظت کی گارنٹی دی گئی۔ان سے زبردستی فوجی خدمت لینے اور ان کی کسی چیز کو پامال کرنے سے منع کیا گیا ان کے ساتھ انصاف کی یقین دہانی کی گئی اور ظالم ومظلوم ہر دوصورت میں قانون کے مطابق عمل کی

ضمانت دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ یہ دائمی حق ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں بحال رہے گا اور حکومت یا کسی ذمہ دار کو اس کے خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ مسلمانوں کا رول و کردار اس وقت ہوگا جب وہ غالب قوت ہوں گے اور حکومت واقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوگا۔ میں نے ان بہت ساری تفصیلات کا ذکر نہیں کیا ہے جو ذمیوں اور غیر مسلم شہریوں کے باب میں تاریخ کے مختلف ادوار میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں کچھ اچھی مثالیں بھی ہیں اور کچھ بری مثالیں بھی ہیں۔ ہمیں اچھی مثالوں کو آگے بڑھانا چاہئے اور بری مثالوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ پچھلی حکومتوں کا ایک امتیاز یہ تھا کہ وہ یا تو خالص مذہبی ریاستیں تھی یا پھر بادشاہت تھی۔ مذہبی ریاست میں ایک مذہب کی بالادستی ہوتی تھی اور بادشاہت میں بادشاہ کی مرضی ہی قانون مانی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں شخصی آزادی اور اختیارات بہت محدود ہوتے تھے تاہم آج کی طرح حکومت کی مشنری اتنی مضبوط اور منظّم نہیں ہوتی تھی اس لئے مذہبی اور سماجی اور معاشی معاملات میں لوگ بہت حد تک آزاد ہوتے تھے۔ مگر کوئی شخص یا گروہ حکومت کی زد میں آگیا تو اس سے بچ نکلنے کے راستے بہت محدود تھے۔ اب جبکہ تھیوکریٹک اسٹیٹ کی حیثیت بدل چکی ہے اور اس کی جگہ پر نیشن اسٹیٹ کا تصور پایا جاتا ہے جہاں ایک مدون دستور اور قانون کے تحت حکمرانی کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں سابقہ اصطلاحیں اور ان کے متعلقات میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ مثلا اب کسی اسلامی ملک میں جو غیر مسلم آبادی ہے اس کی حیثیت ذمی کی نہیں ہوگی اور اس پر جزیہ کے نام سے کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ بلکہ ایک دستوری جمہوریت کے تحت تمام غیر مسلم باشندے بھی عام مسلمانوں کی طرح اس ریاست کے شہری تسلیم کئے جائیں گے اور اس ریاست میں مسلمان شہریوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہی ایک غیر مسلم شہری کو حاصل ہوں گے۔ گرچہ یہ ایک اجتہادی امر ہے، مگر موجودہ وقت میں کسی بھی مسلمان ملک میں وہاں بسنے والے غیر مسلم شہریوں کو ذمی نہیں مانا جاتا ہے اور نہ ان پر جزیہ لگایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ایک تسلیم شدہ اصول بن چکا ہے کہ اسلامی ملکوں کے غیر مسلم شہری بھی برابر کے شہری ہیں اور ان کے تمام شہری حقوق اسی طرح محفوظ اور مامون ہیں جس طرح کسی مسلمان شہری کے شہری حقوق ہیں۔

عالمی منظر نامہ

اب سوال کے دوسرے پہلو پر غور کریں۔اس وقت کی دنیا کی بات کریں تو دنیا میں کم و بیش دوسوممالک ہیں ان میں ۵۲ ممالک وہ ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔اس طرح کم وبیش ۱۵۰ ممالک وہ ہیں جہاں مسلمان ان ملکوں کی مجموعی آبادی کے مقابلے اقلیت میں ہیں۔ان میں ہندوستان جیسا ملک بھی ہے جہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی رہتی ہے۔(جبکہ ہندساتی طور پر ان کی تعداد انڈونیشا سے کم بتائی جاتی ہے)ان ممالک میں دوطرح کے ممالک ہیں۔ایک ملک وہ ہے جہاں مسلمان اس ملک میں کافی زمانے سے رہتے آرہے ہیں۔اور وہاں کے باضابطہ شہری ہیں۔دوسرے وہ لوگ ہیں جہاں وہ ان ملکوں کے شہری نہیں ہیں مگر انہیں وہاں رہنے،تعلیم حاصل کرنے اورکام کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔آج کی دنیا زیادہ متمدن مانی جاتی ہے۔لہذا جن ملکوں میں مسلمان شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں انہیں وہ تمام شہری حقوق حاصل ہیں جو کسی اور شہری کو ملے ہوئے ہیں۔اور جہاں انہیں محض رہنےاورکام کرنے کی اجازت دی گئی ہےانہیں تمام تر انسانی حقوق تو حاصل ہیں،مگر پورے شہری حقوق حاصل نہیں ہیں۔دنیا کے تمام ملکوں میں نہ ایک طرح کی حکومت ہےاورنہ ایک طرح کا قانون ہےاس لئے الگ الگ ملکوں کے الگ الگ تجربات ہیں۔بعض ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اورتشدد کا ماحول پایا جاتا ہےاور باضابطہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مقامی آبادی کوان سے بدگمان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس وقت دنیا کا جیوپولیٹیکل سسٹم جس قسم کا ہےاورجس طرح معاشی سامراجیت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چونکہ مسلم مالک سائنسی،معاشی اورعسکری اعتبار سے کمزور ہیں اوران کے پاس بے پناہ قدرتی وسائل ہیں لہذا ساری دنیا کے سرمایہ داراس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں جس کی وجہ سے ان ملکوں میں اندرونی اور بیرونی کش مکش کا ماحول پیدا ہوگیا ہےاور بہت سے نان اسٹیٹ ایکٹرس ابھرکرسامنے آگئے ہیں جن کی پشت پناہی الگ الگ ملکوں میں دنیا کے مختلف ممالک اپنے اپنے مفادات کے تحت کررہے ہیں اورانہیں ہتھیار اوردیگر طرح کے لوجسٹک سپورٹ دے کران کو دہشت گردی پر آمادہ کرتے ہیں۔جس کی وجہ مسلم ملکوں کے اندر

اور باہرخوں ریزی اور فتنہ کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ غیر اسلامی قوتوں نے بڑی عیاری کے ساتھ اس کا ڈانڈا اسلام سے ملا دیا ہےاوراس طرح اس وقت ساری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک نظریاتی جنگ چھیڑ دی گئی ہے۔حالانکہ یہ مٹھی بھر گروہ ہے جو پوری مسلم آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے مگراس کے اتنے بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی ہے گویا یہ مسلم ملت کا Dominant narrative ہےاوراس طرح پوری دنیا میں مسلمانوں کواور اسلام کومہذب دنیا کے لئے ایک خطرہ بنا کر پیش کیا جارہاہےاور دنیا بھر کی مسلم دشمن قوتوں نے امریکہ اور یورپی ممالک کے اشتراک سے ایک نیا کروسیڈ شروع کردیا ہے ۔ اس صورت میں مسلمان جہاں بھی ہیں انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتاہے اور مسلسل ان کو دباؤ میں لینے کی سیاست چل رہی ہے۔روس چین جیسے ممالک میں ہی نہیں بلکہ لبرل ڈیموکریسی مثلا انگلینڈ،امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت اور تشدد کا ماحول پایا جاتاہےاوران پر پے در پے حملے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں جولوگ دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ان کے پاس اس کا چاہے جو جواز ہودر حقیقت ان کا یہ فعل اسلام اور انسانیت کے خلاف ایک جرم عظیم ہےاس سے اسلام اور مسلمان کی بدنامی ہوتی ہے نیز اس احمقانہ فعل سے سوائے تباہی اور ذلت کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔اس لئے اگر انہیں لگتا ہے کہ اس وقت کی جو سامراجی قوتیں ہیں وہ ان کے ملکوں اور وسائل پر قابض ہوکر ان کا استحصال کررہی ہیں تو انہیں اپنا Grammer of struggle بدلنا ہوگا اور پرامن عوامی جد وجہد کے ذریعہ موجودہ حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر وہ طاقت اور تشدد کے بل پر حالات کو بدلنا چاہیں گےتو یہ موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے۔

میری رائے میں جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کوان ملکوں میں اپنے پرامن مثبت،تعمیراتی رخ کے ساتھ اس سماج کے لئے ہرممکنہ خیر کامنبع بن کر ابھرنا ہوگا تاکہ اس سماج میں ان کی اخلاقی حیثیت بلند ہواور وہ اپنے وجود سے اس سماج کو ہر طرح کا فائدہ پہنچانے کے اہل ہوں۔ بدلتے سماج اور سیاست کو پہنچاتے ہوئے جولوگ اپنا رول اوراپنی ترجیحات متعین کرتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں وہی انسانیت عام کے لئے خیر کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔قرآن نے مسلمانوں کو

خیر امت کہہ کر پکارا ہے۔توانہیں اپنی اس شناخت کے ساتھ سماج کے سامنے آنا ہوگا۔ صاحب ایمان کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے سب محفوظ رہیں اور حضورؐ نے فرمایا انسانوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کی بھلائی کرتا ہے۔اگر ان خصوصیات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرلیا جائے تو آپ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں لوگ آپ کے اخلاقی وزن کو محسوس کریں گے اور دیر یا سویر آپ کا امیج بدلے گا۔

ملت کا شعار

بہر حال اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان بنیادی طور پر امن پسند ملت ہے جو نہ تو دوسروں پر ظلم کرتی ہے اور نہ خود پر ظلم کو تسلیم کرتی ہے۔اس لئے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی دیگر قوموں کو پر امن بقائے باہم کے اصول کے تحت امن وانصاف برابری،عزت اور آزادی کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے تمام اقوام اور برادریوں کو جینے ، کام کرنے اور آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہئے۔تبھی کسی ملک میں اور دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔بغیر ایک دوسرے کا حق پہنچانے اور انصاف کا ماحول پیدا کئے دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا جس میں سب سے زیادہ نقصان کمزوروں اور اقلیتوں کا ہوگا۔اب تو خیر سے دنیا میں یو ان او جیسے ادارے قائم ہیں۔لہذا اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دیکھے کہ دنیا میں بسنے والی اقلیتوں کے ساتھ ان ملکوں کی اکثریت اور حکومت کیا برتاؤ کرتی ہے اور ان ملکوں کی حکومتوں اور اکثریت کو جہاں ان کے شہری حقوق کی بحالی اور حفاظت پر آمادہ کرے وہیں ان ملکوں میں بسنے والی جو اقلیتیں ہیں ان کو بھی مشورہ دے کہ وہ کس طرح اپنی عزت اور آزادی کو محفوظ رکھتے ہوئے اس ملک کے اجتماعی معاملات میں موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔اس طرح مسلمان خواہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں انہیں خیر امت اور وسط امت بن کر ابھرنا ہوگا اور انسانیت عامہ کی بھلائی کے جامع منصوبہ کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھانے کے لئے آگے آنا ہوگا اور ہر طرح کی دہشت گردانہ کاروائی سے اپنی برات کا اعلان کرنے کے ساتھ دنیا کی تمام صلح جو،انصاف پسند اور تعمیر پسند قوتوں کے ساتھ مل کر ایک محفوظ دنیا کی تعمیر تشکیل میں اپنا رول ادا کرنا ہوگا حضورؐ نے مکے میں جس حلف الفضول کے مہم میں اپنی حصہ داری کی تھی اسی اسوہ

کے مطابق دنیا میں امن وامان کے قیام اور کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت کے لئے اپنے تمام تر اخلاقی اور مادی وسائل کے ساتھ دست تعاون دراز کرنا ہوگا۔ اس وقت سیرت رسول کی روشنی ہی امت اور ملت کا شعار ہونا چاہئے۔

اسلام کا ورلڈ ویو

اگر آپ جدید دنیا پر اچٹتی نظر ڈالیں تو اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں ایک قوم، ایک نسل، ایکرنگ اور ایک زبان کے لوگ رہتے ہیں۔ بلکہ تمام ملکوں میں ایک سے زائد قوموں کے لوگ آباد ہیں جو مختلف رنگ ونسل کے ہیں اور الگ الگ معتقدات رکھتے ہیں۔ اس طرح گویا اختلاف وتنوع جدید عہد اور جدید تہذیب کی پہچان ہے۔ جب اس اختلاف وتنوع میں تنگ ذہنی اور تعصب آمیز عدم برداشت (Intolerance) کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو مختلف مذاہب نسلوں اور زبان والوں کے بیچ تفرقہ اور تصادم کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے جو بسا اوقات خون خرابہ فرقہ وارانہ کش مکش اور باہمی جنگ وجدال کی وجہ بنتا ہے جس سے سماجی امن و بھائی چارہ کو نقصان ہوتا ہے اور ملک اور سماج کی ترقی رکتی ہے۔ اس صورت حال میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے اور سیرت رسول سے کیا رہنمائی ملتی ہے یہ دیکھنے اور جاننے کی چیز ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام مذہبی تنوع اور تکثیری سماج کا قائل ہے؟ اس سوال کے معروضی جواب کے لئے ہمیں اسلام کے ورلڈ ویو پر ایک نگاہ ڈالتے چلنا ضروری ہوگا۔

اسلام کا ورلڈ ویو کیا ہے؟ اسلام کی رو سے یہ پوری کائنات اور اس کائنات میں انسان کی تخلیق خدائے وحدہ لاشریک کے ذریعہ ہوتی ہے لہذا تخلیق کے نقطہ نظر سے سارے انسان اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں لہذا اسلام کے ورلڈ ویو کا پہلا نظریہ وحدت تخلیق ہے۔ جب سب کا مبنی ایک ہے تو اس کی ہیئت، فطرت، حاجت اور مراجعت بھی ایک ہوگی۔

اسلام کے ورلڈ ویو کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ قرآن نے سورہ النساء آیت نمبر۔ ا میں صاف صاف ذکر کیا ہے۔

لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اس کا جوڑا

بنایا اور دونوں سے بہت سے مرد عورت دنیا میں پھیلا دئے۔(۴:۱)

اس طرح دوسرا نظریہ وحدت اصل ونسل کا ہے۔

اسلام کے ورلڈ ویو کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اشرف المخلوقات اور خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔قرآن کے الفاظ میں۔

انی جاعل فی الارض خلیفة(۲:۳۰)

میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان ایک خود مختار اور صاحب اختیار مخلوق ہے۔اس کو علم،عقل گویائی اور اختیار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ تمام مخلوقات میں برتر ہے اور ساری کائنات اس کے لئے مسخر کردی گئی ہے۔اسلام کے ورلڈ ویو کا چوتھا اصول یہ ہے کہ تمام انسان پیدائشی اعتبار سے معصوم اور اپنے آپ میں محترم و صاحب عزت ہیں۔قرآن کے الفاظ میں۔

لقد کرمنا بنی آدم۔ہم نے آدم کے اولاد کو عزت بخشی ہے(۱۷:۷۰)

ان چار بنیادی باتوں سے جو چیز ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان اپنی تخلیق اور نسل کے اعتبار سے ایک ہیں۔دوسرے زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں اور صاحب اکرام ہیں انسان کی یہ حیثیت بلاتفریق عقیدہ و مذہب،رنگ،نسل،جنس ذات اور علاقہ کے ہے۔یعنی ایک شخص مسلمان ہے یا غیر مسلم اس سے مندرجہ بالا کوئی حیثیت تبدیل نہیں ہوتی ہے۔وہ خدا کا بندہ ہے چاہے وہ ایک خدا کو مانتا ہے یا بہت سارے معبودوں کی پرستش کرتا ہے یا خدا کے وجود کا منکر ہے۔ٹھیک اسی طرح وہ آدم کی اولاد ہے برابری اور عزت کا مستحق ہے چاہے وہ خود کو اعلیٰ ذات یا ادنی ذات سے متعلق مانتا ہو۔کالا یا گورا ہو،عربی یا عجمی ہو،غریب یا مالدار ہو،عالم یا جاہل ہو۔غرض اس کی کوئی ہیئت وحیثیت ہو انسان ہونے کے ناطے برابری اور عزت کا حق رکھتا ہے اسی طرح شرف خلافت میں بھی برابر کا شریک ہے اور اکرام آدمیت میں بھی برابر کا حصہ دار ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

اس ورلڈ ویو کی تصدیق حضورؐ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ اس دنیا کی ساری مخلوقات اللہ کا کنبہ ہے(الخلق عیال اللہ)یعنی اس دنیا کی ہر چیز اللہ کی خلق ہے اور اس کے کنبہ کا فرد ہے۔اس کنبہ کی خدمت،حفاظت اور بہتری ایک انسان کی ذمہ داری ہے۔حدیث کے مطابق وہ

آدمی سب سے بہتر ہے جو عام انسانوں کی بھلائی سب سے بہتر ڈھنگ سے کرتا ہے (خیر الناس من ینفع الناس) ان دونوں حدیثوں میں جو عمومیت ہے وہ اسلام کے ورلڈ ویو کی جامعیت اور عالمگیریت کی وضاحت کرتی ہے۔

اسلام کے اس ورلڈ ویو سے اس کائنات اور اس کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ اور اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس مقام و مرتبہ میں صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی وہی حیثیت وعزت رکھتے ہیں۔اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں رنگ، نسل ،قوم ،قبیلہ، ذات اور برادری کے نام پر بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں جس کے بارے میں قرآن نے کہا۔

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کر دیا پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (الحجرات سورہ نمبر ۴۹۔آیت نمبر ۱۳)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قوم ،قبیلہ، ذات برادری محض پہچان کے لئے ہے اس میں کس کو کسی پر کوئی شرف وامتیاز حاصل نہیں ہے۔اس بنا پر کوئی خود کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا رذیل اور حقیر نہیں سمجھ سکتا ہے۔

ان تفصیلات سے آپ پر اسلام کا ورلڈ ویو اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا۔اب آیئے اس ورلڈ ویو میں مذاہب کے اختلاف اور اس کی نوعیت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

اسلام اور دیگر مذاہب

:اسلام کسی انسانی ذہن کی اختراع نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ دین ہے جو حضرت آدم سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ تک مختلف قوموں ،قبیلوں، زبانوں اور زمانوں میں ایک تسلسل کے ساتھ نازل ہوتا رہا اور حضرت محمدؐ پر آ کر یہ دین ودعوت مکمل ہوگئی۔اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور نہ کوئی دین وشریعت نازل ہوگی۔لہذا یہی اللہ کی طرف سے آخری اور مستند دین ہے جس کی پیروی ہر انسان مرد و عورت چاہے وہ دنیا کے جس خطے میں رہتا ہے، لازم ہے کیونکہ اللہ کے حضور اس دین کے علاوہ کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

اے نبی! کہو ہم اللہ کو مانتے ہیں، اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، ان

تعلیمات کو مانتے ہیں جوابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی تھی۔ اور ان ھدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جوموسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کوان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں۔ اس اسلام (یعنی فرماں برداری) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ یعنی دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا۔

(سورہ آل عمران ۸۵۔۸۴:۳)

ان دو آیتوں میں پوری تصویر واضح کر دی گئی ہے۔ پہلی یہ کہ یہ اللہ کا دین ہے۔ دوسری یہ کہ ایک تسلسل کے ساتھ بھیجی جاتی رہی ہے جس میں مختلف انبیا کا ذکر کیا گیا ہے جو مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر اور مختلف قوموں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ مگر تمام کی دین ودعوت ایک تھی اور یہی دین ودعوت حضرت محمد ﷺ کی طرف سے آخری اور مکمل طور پر پیش کی جارہی ہے اس دعویٰ اور اعلان کے ساتھ کہ یہی اب بندگئ رب کا واحد، مستند اور مکمل طریقہ ہے۔ لہذا اس دین کو پا لینے اور سمجھ لینے کے بعد اگر کوئی آدمی کوئی دوسرا دین اور طریقہ اختیار کرنا چاہے وہ اللہ کے حضور ہرگز قابل قبول نہیں ہوگا اور اسے آخرت میں گھاٹے اور نامرادی کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن اسلام کو مختلف سچائیوں میں سے ایک سچائی کے طور پر پیش نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو لازمی سچائی (Absolute & ultimate truth) کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام لوگوں کو صاف صاف بتا رہا ہے کہ اگر تم نے اس کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کیا تو یہ اللہ کے نزدیک ہرگز قابل قبول نہیں ہوگا کیونکہ خدا کے نزدیک صرف اسلام ہی دین واحد ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران۔۱۹) بلاشبہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی واحد دین ہے۔ یہ تو اسلام کی حقیقت ہے جس سے وہ پوری دنیا کو روشناس کرانا چاہتا ہے لیکن جیسا کے اوپر واضح کیا جاچکا ہے کہ اللہ نے نہ تو اس معاملے میں تکوینی جبر کا طریقہ اختیار کیا ہے اور نہ وہ قانونی جبر کی اجازت دیتا ہے بلکہ وہ اس کو بہترین طریقہ سے لوگوں تک پہنچانے کی ھدایت کرتا ہے

۔قرآن کا ارشاد ہے۔

اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت کے ساتھ، اچھی نصیحت کے ساتھ اور بہتر طریقہ بحث کے ذریعہ (النحل ۱۶:۱۲۵)

اور یہ بھی واضح کرتا ہے کہ

(گرچہ) یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے (الکہف)۱۸:۲۹)

قرآن اپنے نبی کو ھدایت کرتا ہے

اے نبی جو باتیں یہ لوگ بتا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں

اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔بس اس قرآن کے ذریعہ ہر اس شخص کو نصیحت کردو جو میری تنبیہہ سے ڈرے۔(ق ۵۰۔۴۵)

اس کا مطلب واضح ہے کہ اسلام ایک فرد کو پوری آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ اور مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جس عقیدہ اور مذہب کو چاہے ماننے سے انکار کردے چاہے وہ اسلام ہی کیوں نہ ہو۔قرآن کا صاف صاف اعلان ہے کہ لا اکراہ فی الدین ۔ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔(البقرہ۔۲۵۶)

اسلام اور پلولرزم

اسلام کے اس ورلڈ ویو اور آئیڈ ولوجیکل فریم میں ہم اس امر کی کھوج کریں کہ اسلام پلورلزم اور پلورل سوسائٹی کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے۔اور اس نے اس سلسلے میں کون سے گولڈن پرنسپلس دئے ہیں اور اس کو کس طرح عملی طور پر برت کر بتایا ہے۔ان باتوں کی تحقیق اس لئے ضروری ہے کہ آج کے دور میں مشرق ومغرب دونوں جگہوں پر یہ پروپیگندہ بڑے زور وشور سے کیا جاتا ہے کہ اسلام میں برداشت یعنی Tolerance نہیں ہے بلکہ یہ طاقت اور تلوار مین یقین رکھتا ہے اور بہ جبر اور بہ قوت اپنی بات منوانا چاہتا ہے جو شخصی اور قومی آزادی کے لحاظ سے خطرناک ہے اور خاص طور سے اسلام کے زیر سایہ جو غیر مسلم اقوام رہتی ہیں وہ ہر طرح کی عزت وآزادی

سے محروم ہوتی ہیں۔ہم ان تمام باتوں کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیں گے جس سے ایک طرف اسلام کی اصلیت اوران پروپیگنڈوں کی غیر معقولیت واضح ہوجائے گی۔

جیسا کہ اوپر کے پیراگراف میں واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن نے اپنے نبیؐ کو یہ بات صاف بہت ہی واضح الفاظ اور انداز میں باور کرادی تھی کہ آپ چاہے جیسی نصیحت کریں۔کتنی ہی ٹھوس اور واضح دلیلوں کے ساتھ اسلام کی حقانیت لوگوں پر ثابت کردیں اوران کے ساتھ کیسا ہی حسن سلوک کریں انسانوں کا ایک گروہ لازماً ایسا ہوگا جوآپ کے پیش کردہ دین پر ایمان نہیں لائے گا۔کیونکہ ان کے اندر قبول حق کی صلاحیت نہیں ہوگی۔قرآن کے الفاظ میں۔

جن لوگوں نے انکار کردیا،ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو۔بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی اوران کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے(سورہ البقرہ ۶۔۷)

گویا یہ بہرے ہیں،گونگے ہیں،اندھے ہیں۔یہ اب نہ پلٹیں گے۔(سورہ البقرہ ۱۸)

یہ اس لئے نہیں کہ حق ان تک نہیں پہنچا۔یا انہوں نے حق کو نہیں پہچانا بلکہ وہ اس کو اس طرح جاننے اور پہچاننے لگے جیسے اپنے بیٹے کو پہچانتے ہیں۔مگر پھر بھی وہ اس کو مان کر دینے کو تیار نہیں ہیں۔

اس صورت میں قرآن نے اپنے نبیؐ سے کہا کہ آپ اس سے قطع نظر کے کون آپ کی دعوت کو قبول کرتا ہے اور کون انکار کرتا ہے آپ لوگوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچانا جاری رکھئے۔مگر اگر لوگ نہیں مانتے ہیں تو نہ تو آپ کو اس غم میں جان دینے کی ضرورت ہے کیونکہ آپ پر ذمہ داری صرف پہنچانے کی ہے منوانے کی نہیں ہے۔یہ اللہ کی مشیت پر منحصر کرتا ہے کہ وہ کس کو توفیق ایمان دیتا ہے اور کس کو اس سعادت سے محروم رکھتا ہے۔یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی ضمیر قبول حق کی صلاحیت رکھتی ہے اور کس میں قبول حق کی صلاحیت نہیں ہے لہذا قرآن نے اپنے نبیؐ سے صاف صاف کہا۔آپ ان پر جبر کرنے کے لئے مسلط نہیں کئے گئے ہیں۔(غاشیہ۔۲۲)

ظاہری بات ہے جب کسی شخص کو جبر یہ مسلمان نہیں بنایا جائے گا تو مسلمان معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسلامی نظام عقائد،عبادات ، اخلاقیات اور شریعت پر ایمان

نہیں رکھنے والے ہوں گے۔قرآن نے ان کومنکرین کے نام سے پکارا ہے۔

یہ منکرین کوئی ایک طرح کے لوگ نہیں ہوں گے بلکہ اس میں مشرکین، کافرین، مذبذبین ،ملحدین اور سابق انبیا کے گمراہ متبعین سب ہوں گے جو مسلم معاشرے میں موجود ہوں گے۔قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔

> جو لوگ ایمان لائے۔ جو یہودی ہوئے، اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا،ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کردے گا۔(الحج۔۱۷)

غرض یہ سارے لوگ ایک معاشرے میں ہوں گے جن کے عقائد الگ ہیں، جن کا طریق عبادت الگ ہے جن کا نظام معاشرت الگ ہے۔نظام اخلاق ومعاملات الگ ہیں۔ان تمام تنوع اور اختلاف کے باوجود ایک اسلامی معاشرے میں ان کے تمام انفرادی اور اجتماعی حقوق پوری طرح محفوظ ہوں گے اور مصالح عام کے علاوہ ان پر کوئی قدغن اور تحدید نہیں ہوگی۔ذیل میں ہم اسلامی معاشرے میں عام مسلمان اور غیر مسلموں کے بنیادی حقوق اور مسلم وغیر مسلم سماج کے بیچ عمومی تعلقات، معاملات اور عام تمدنی رشتوں کا ذکر کریں گے تا کہ اس بات میں پوری تصویر لوگوں کے سامنے ابھر کر آجائے تا کہ جو غلط فہمیاں ہیں یا پھیلائی جارہی ہیں اس کو مسکت اور معروضی انداز میں واضح کر دیا جائے تا کہ قاری خود یہ فیصلہ کر لے کہ اسلام کے تعلق سے غیر مسلم معاشرے کو گمراہ کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس میں کتنی سچائی ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق

کسی بھی معاشرے میں بالعموم اور اسلامی معاشرے میں بالخصوص کسی بھی شخص اور گروہ کو جو پہلا حق حاصل ہے وہ تحفظ جان کا ہے۔اس کو یہ حق بلا امتیاز عقائد بحیثیت انسان یکساں طور پر حاصل ہیں اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلام انسانی جان کو محترم مانتا ہے چاہے وہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا اور سوائے چھ صورتوں کے کسی کے قتل کی اجازت نہیں دیتا ہے ان چھ صورتوں میں (۱) قتل عمد ہے (۲) دوسرے

دوران جنگ قتل (۳) ریاست کے خلاف بغاوت کی سازش (۴) زنا (۵) ارتداد (٦) شاہراہوں پر ڈاکہ زنی۔ ان چھ صورتوں کے سوا باقی کسی بھی صورت میں انسانی جان کی حرمت ساقط نہیں ہوتی۔ قرآن پاک میں سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا۔

قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا مگر حق کے ساتھ۔ (بنی اسرائیل۔۳۳)

الا بالحق کے مفہوم میں مندرجہ بالا چھ باتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان یا غیر مسلم کا قتل کرنا حرام ہے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ کسی مسلمان کے قتل کے مقابلے میں پوری دنیا کا زوال خدا کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ (مسلم) اور خون صرف مسلمان ہی کا محترم نہیں خدا کے ہر بندے کا خون محترم ہے۔ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر ذمی کا خون ناحق ہوجائے تو اس پر جنت حرام ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا۔ جس نے کسی معاہد غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ (بخاری)

جس طرح غیر مسلم شخص کی جان محترم ہے اسی طرح غیر مسلم بچوں اور عورتوں کی جان بھی محترم ہے۔ لہذا عورتوں، بچوں اور معذوروں کا قتل کرنا حرام ہے۔

حضور نے فرمایا۔ مشرک بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا کی ہی طرف سے فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔ (مسند احمد)

اسی طرح آپ نے ایک دوسری حدیث میں عورتوں، بچوں اور معذوروں کو قتل کرنے سے منع کیا۔ اسلام میں تحفظ جان کی ضمانت پیٹ میں پل رہے بچے سے لے کر نوزائیدہ بچوں اور پھر اس کے بعد ہر مرد و عورت کو دی ہے۔ جس کی خلاف ورزی کبیرہ گناہ ہے۔

ان ضمانتوں اور ھدایات کے بعد کوئی شخص یا کوئی حکمراں ظلماً اور عمداً کسی کی ناحق جان لیتا ہے تو وہ دنیا میں اور آخرت میں اس کے وبال سے نہیں بچ سکتا ہے۔ دنیا میں قانون کی نظر میں وہ قابل تعزیر جرم کا مرتکب ہے جس کی سزا قتل ہے اور آخرت میں وہ خدا کے غضب اور عذاب کا مستحق ہے کیونکہ اس نے ایک بے گناہ انسان کا قتل کر کے پوری انسانیت کا قتل کر دیا۔ یہ ہے اسلام

میں انسانی جان کا مفہوم جس میں تحفظ کی ضمانت ہر مسلم و غیر مسلم کو دی گئی ہے۔

حرمت جان کے بعد دوسرا حق جو تمام مسلمان اور غیر مسلم کو حاصل ہے وہ حرمت مال ہے۔ایسی تمام نجی املاک جو جائز ذرائع سے حاصل شدہ ہو اور جن سے شریعت کے مقرر کردہ تمام حقوق و واجبات ادا کئے جا چکے ہیں وہ حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہوں گی اور جو صاحب مال ہے اس کو اس کے استعمال اور تصرف کا حق ہوگا۔وہ اس کو مزید نفع کمانے کے لئے کاروبار یا دیگر کاموں میں لگانے کا حق رکھتا ہے۔اپنی جائداد کو قانونی طور پر منتقل کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس کے تحفظ کا بھی پورا حق ہے۔

اسلامی ریاست کا یہ ایک مسلم اصول ہے کہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص سے کوئی چیز نہیں لی جا سکتی۔حضورؐ نے غیر مسلموں کے سلسلے میں فرمایا۔

سن لو معاہدین کے اموال حلال نہیں سوائے حق کے۔(ابوداؤد)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اپنے مصالح کے تحت جائز طریقے سے اپنے شہریوں پر کوئی مالی بار ڈال سکتی ہے۔لیکن وہ حق ملکیت کو منسوخ کر کے کسی کی جائداد یا مال پر قبضہ نہیں کر سکتی ہے تحفظ ملکیت کے حق کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا۔

جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے۔(بخاری)

تیسرا تحفظ آبرو ہے۔اسلام احترام آدمیت کے باب میں بہت حساس ہے۔قرآن نے اعلان کیا کہ ہم نے بنی آدم کو مکرم بنا کر بھیجا ہے۔اس آیت کی رو سے ہر انسان خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم احترام ذات کا مستحق ہے۔قرآن نے اور حضور نے عام انسانی اخلاقیات کی جو تعلیم دی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔کسی شخص کو ذلیل کرنا،اس کو مارنا پیٹنا،اس کی عزت و آبرو سے کھلواڑ کرنا یہاں تک کہ اس کی غیبت کرنا اس پر بہتان تراشی کرنا غرض کسی طرح بھی اس کو چھوٹا،نیچا اور حقیر بنانا اور اس کے عزت نفس پر حملہ کرنا یہ سب ممنوع ہے اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس پر عنداللہ بھی اور عندالناس بھی پکڑ ہوگی۔ان میں سے کچھ افعال نہ صرف قابل مذمت ہیں بلکہ قابل سزا بھی ہیں کیونکہ احترام آدمیت اسلام کے بنیادی مسلمہ اصولوں میں سے ایک ہے۔

نجی زندگی کا حق جس کو Right to Privacy کہتے ہیں۔اسلام نے اس کو ایک

انسان کا بنیادی حق مانا ہے اور عام حالت میں حکومت کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عام لوگوں کی جاسوسی ان کے مخفی حالات جاننے کی کوشش کریں۔ بلا اجازت اور چور دروازے سے ان کے گھروں میں جھانکنے کی کوشش کرنا۔ ایسا کرنا اس کے Right to privacy یعنی نجتا کے ادھیکار کا ہنن مانا جائے گا جس کی اجازت اسلام کسی کو نہیں دیتا ہے۔ عام افراد اگر اس طرح کے حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان پر تادیبی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ اگر حکومت ایسا کرتی ہے تو وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتی ہے اس لئے کہ اس صورت میں بگاڑ کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا۔

حکمراں جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ انہیں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ (ابوداؤد)

اسلامی سماج اور ریاست میں کسی شہری کو کھلی عدالت میں جرم ثابت کئے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہر شخص کی شخصی آزادی کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اور محض شکوک شبہات کی بنا پر لوگوں کو گرفتار کرنا اور عدالتی کارروائی کے بغیر جیلوں میں ڈال دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ آج کل امتناعی نظر بندی اور ریاست کی سلامتی کے نام پر ناجائز طریقہ سے لوگوں کی گرفتاریاں کی جاتی ہیں اس کی اسلامی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی انسان کو کسی شخص کو غلام بنانے کا حق نہیں ہے اور نہ اسے غلاموں کی طرح برتاؤ کرنے کا حق ہے۔ لہذا ہر معاملہ میں انصاف کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور معروف عدالتی طریقہ Due process of law کی تمام شرائط کو پورا کرتے ہوئے ہی کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ (النساء ۵۸)

اسی طرح کسی شہری کو دوسرے کے جرم میں نہیں پکڑا جائے گا۔ قرآن کا حکم ہے

ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں۔ (البقرہ۔۱۹۳)

اسلام میں شہریوں کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے بلکہ ظالم کو ظلم سے روکنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنے کا حق حاصل ہے۔ شہریوں کو محض یہی حق حاصل نہیں ہے جب ان پر ظلم ہو تو وہ زبان کھولیں بلکہ انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ملک کے معاملات ومسائل میں اپنی رائے کا آزادہ اظہار کریں اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کی معقول اور صحیح باتوں کو سنے اور مانے اور اس کے

مطابق فیصلہ کرے اور غلط باتیں اور ظالمانہ اقدام سے باز آئے۔اسلام میں اطاعت کے لئے لازم ہے کہ وہ معروف ہو۔اگر کسی منکر یا فسق کا حکم دیا جارہا ہے تو اطاعت لازم نہیں ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔اور حدود سے نکل جانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔(الشعراء۔۱۵۱)

یہ بات شد و مد کے ساتھ اوپر واضح کی گئی ہے کہ اسلامی سماج میں ہر شخص کو ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہے اور کوئی کسی پر کوئی بات جبر یہ نہیں تھوپ سکتا ہے قرآن پاک میں یہ بات بہت صاف الفاظ و انداز میں متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے۔مثلاً سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین پر سب مومن و فرمابردار ہی ہوتے تو اہل زمین ایمان لے آتے۔پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔(سورہ یونس۔۹۹)

حضور سے کہا گیا آپ نصیحت کئے جایئے۔آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں۔(الغاشیہ۲۱۔۲۲)

لہذا کسی شخص پر دین وعقیدے کے معاملے میں جبر نہیں کیا جاسکتا۔اس طرح اسلامی ریاست اور سماج کی یہ امتیازی خوبی ہے کہ اس سماج میں ہر شخص دین اور عقیدے کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہے اور یہ آزادی غیر محدود ہے۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو بحیثیت انسان برابر مانتا ہے اور حضورؐ کے بقول آپس میں بھائی بھائی ہیں۔(ابوداؤد کتاب الصلوۃ)

ان کے علاوہ ایک اسلامی سماج میں تمام افراد کو جو چند اور بنیادی حقوق حاصل ہیں وہ ان میں حصول انصاف کا حق،معاشی تحفظ کا حق،معصیت سے بچنے کا حق۔اسلام کا ایک اصل الاصول یہ ہے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی طاعت نہیں کی جائے گی (کنزالعمال) معروفات کے قیام اور منکرات کے ازالہ کے لئے تنظیم واجتماع کا حق،سیاسی معاملات میں شرکت کا حق،آزادی نقل وحرکت وسکونت کا حق،حق اجرت ومعاوضہ غرض یہ وہ حقوق ہیں جو ایک اسلامی سماج میں تمام مسلم وغیر مسلم کو universally حاصل ہوں گے۔

یہ ہے اسلام کا ورلڈ ویو اور اس ورلڈ ویو میں مسلم اور غیر مسلم اقوام کی پوزیشن اس ورلڈ ویو کی تائید حضورﷺ کے میثاق مدینہ سے بھی ہوتی ہے۔حضورؐ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے

اس وقت مدینہ میں اوس وخزرج دو قبیلہ تھے جن میں آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھی۔ پھر اس معاشرے میں یہودیوں کی بھی اچھی آبادی تھی جو معاشی طور پر خوشحال تھے اور وہ ان قبیلوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھاتے اور ان کا معاشی استحصال بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ آباد تھے۔ حضور کے مدینہ آنے کے بعد وہاں کا پاور ایکوٹیشن پوری طرح بدل گیا۔ اوس وخزرج دونوں قبیلوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور ان لوگوں کے روحانی پیشوا ہو گئے۔

یہودی جو اہل کتاب تھے وہ ان آثار وقرائن سے جو خود ان کی کتابوں میں موجود تھی پہچان گئے تھے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں، مگر یہودیوں کے چند لوگوں کے سوا زیادہ تر لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور اپنے دین وعقیدے پر قائم رہے۔

حضورؐ نے جب مکہ میں اپنی دعوت شروع کی، مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار آپ کے مخالف ہو گئے پہلے تو انہوں نے ہنسی مذاق اور طنز واستہزا سے کام لیا مگر جیسے جیسے حضورؐ کی دعوت لوگوں میں پہنچنے لگی اور بہت سی عورتوں، غلاموں اور نوجوانوں نے آپ کی دعوت قبول کرنا شروع کیا۔ تب یہ لوگ بہت Serious ہوئے۔ اب ان لوگوں نے ان عورتوں، غلاموں اور سماج کے کمزور لوگوں پر ظلم ڈھانا شروع کیا تاکہ وہ لوگ اس دین سے پھر جائیں، مگر اپنے تمام شب وستم کے باوجود وہ صاحب ایمان لوگوں کو اس دین سے پھیرنے میں ناکام رہے۔ اب یہ لوگ سازشیں کرنے لگے کہ حضور کا قتل کر دیا جائے۔ اس وقت اللہ نے حضورؐ کو حکم دیا کہ اب مکہ میں آپ کا قیام مناسب نہیں ہے اس لئے آپؐ مدینہ ہجرت کر جائیں۔

جب حضورؐ بحفاظت مکہ والوں کی سازشوں اور حملوں سے بچتے ہوئے مدینہ آ گئے تو مکہ والوں نے یہاں بھی آپؐ کا پیچھا کیا اور اپنے انتقام کی آگ میں جلتے رہے اور مدینہ پر پے در پے حملہ کیا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ حضور جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے تو آپؐ کو یہ احساس تھا کہ مکہ والے آپؐ کو چین سے یہاں رہنے نہیں دیں گے بلکہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی مکہ والوں نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بدر کی مشہور لڑائی واقع ہوئی جس میں اللہ نے حضور اور ان کے ساتھیوں کو فتحیاب کیا اس

طرح مدینہ میں ان کی طاقت جم گئی اور اب وہ وہاں کی غالب قوت بن گئے۔

حضورؐ جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے مختلف قبائل دست وگریباں ہیں لہذا سب سے پہلے آپ نے ان کے درمیان امن وامان قائم کرنے کی کوشش کی اور اوس وخزرج دو قبیلے جو آپس میں ہمیشہ دست وگریباں رہتے تھے چونکہ دونوں قبیلوں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اس لئے ان قبیلوں کے مسلمان اور جو مہاجر حضور کے ساتھ آئے تھے ان کے درمیان آپ نے مواخواۃ یعنی بھائی چارہ قائم کر دیا اور اس طرح ان کو انصار کہہ کر پکارا جانے لگا۔ ان انصار نے اس مواخواۃ کے بعد نہ صرف اپنی اس دشمنی کو ختم کر دیا بلکہ فیاضی فراخ دلی اور قربانی کی ایسی نادر مثالیں پیش کیں جس کی اس سے پہلے تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس طرح اپنے متبعین میں مواخواۃ پیدا کرنے کے بعد حضور مدینہ کی غیر مسلم آبادی کی طرف متوجہ ہوئے اور پیش آمدہ خطرات کے سبب ان تمام لوگوں سے ایک معاہدہ کیا جس سے ایک ابھرتے ہوئے اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں کی حیثیت اور حقوق پر بھرپور روشنی ملتی ہے اور اس سے اسلام کے ورلڈ ویو اور اس میں مختلف مذاہب اور اقوام کی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے ذریعہ کئے گئے معاہدے کو دنیا کا پہلا تحریری دستور مانا جاتا ہے جس میں مسلم وغیر مسلم قوموں کے باہمی تعلقات اور معاملات کی وضاحت کی گئی۔ اس معاہدے کی رو سے جو پہلی بات کہی گئی وہ یہ کہ یثرب کے جو مسلمان اور یہود ہیں وہ ایک امت واحدہ ہیں جو دوسرے لوگوں سے الگ ہیں۔ یہ امت واحدہ کیوں اور کیسے ہیں جب کہ ان کے عقائد الگ ہیں۔ تو اس کی مندرجہ ذیل وجہیں ہیں۔

(۱) یہ سب ایک خطہ میں رہتے ہیں۔
(۲) یہ ایک دوسرے کے معاہد ہیں۔
(۳) یہ ایک مرکزی نظم کے پابند ہیں۔
(۴) اور تمام اختلافی امور میں حضور کی طرف رجوع کریں گے اور آپؐ جو فیصلہ کر دیں گے اسے مانیں گے، گویا وہ آپ کے اختیار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس معاہدے کی رو سے چونکہ یثرب کے مسلم وغیر مسلم ایک امت ہیں اس لئے باہم مل کر اس خطہ کی دفاع کریں گے اور اس کا خرچ برداشت کریں گے اور معاہدے کے جملہ شرائط

کو مانتے ہوئے اس مقدس حرم یعنی یثرب کی حفاظت کریں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معاہدے کے تمام فریق مسلمان نہیں ہے بلکہ ایک فریق مسلمان ہے اور دوسرے یہودی ہیں۔اس لئے یہ بات واضح طور پر تحریر کردی گئی کہ ہر فریق کو مذہب کی آزادی ہوگی۔یہود اپنے دین پر عمل کریں گے اور مسلمان اپنے دین پر۔معاہدے میں تمام فریق خواہ اہل ایمان ہوں یا یہود جنگ کے اخراجات کی ذمہ داری برابر ہوگی۔حالت امن میں ہر گروہ اپنے اخراجات خود برداشت کرے گا۔اہل معاہدہ میں سے کسی پر ظلم ہو تو سب مل کر اس کی مدد کریں گے۔اس طرح معاہدے کے مطابق تمام فریقوں پر باہمی نصح و خیر خواہی لازم ہوگی۔معاہدے میں مدینہ کو حرم اور جائے امن قرار دیا گیا اور یہود کو مسلمانوں کا دوست بنایا گیا۔یہ طویل معاہدہ ہے جس کے ۴۷ شق ہیں جن میں الگ الگ قبیلوں کے نام کے ساتھ معاہدے کے دفعات لکھے گئے ہیں۔لیکن اس معاہدے میں جو امور قابل غور ہیں جس سے مسلم و غیر مسلم روابط پر روشنی پڑتی ہے۔وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ایک خطہ میں ملک اور علاقے کے رہنے والے لوگ باوجودیکہ ان کا مذہب الگ ہے ایک قوم میں ملت واحدہ ہیں اور ایک وسیع تر معاہدے broad based agreement کے ذریعہ ایک متحدہ قوم بن سکتے ہیں۔

(۲) ہر مذہب کے ماننے والوں کو اس خطہ کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی۔

(۳) اس خطہ کی حفاظت کی مشترکہ ذمہ داری ہوگی۔

(۴) اس کے انتظام و انصرام اور تحفظ و دفاع کا خرچ سب مل کر برداشت کریں گے۔

(۵) کوئی اس ملک اور اس کے باشندوں کے مفاد کے خلاف کام نہیں کرے گا۔

(۶) کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ ہر کوئی ایک دوسرے کی بھلائی کے لئے کوشاں ہوگا۔اور اس کے آپسی تعلقات محبت و خیر سگالی کی بنیاد پر قائم ہوں گے کیونکہ وہ سب ایک دوسرے کے دوست اور شریک ہیں۔

یہ ہے اس معاہدے کی روح جو حضورؐ نے مدینہ پہنچتے ہی مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یعنی مسلم اور غیر مسلم افراد کے درمیان کروایا۔اسی معاہدے کی روشنی میں ہمیں آج اپنے

باہمی تعلقات کے باب میں غور کرنا ہے تا کہ ہم سیرت کی روشنی میں ہندوستان کے مشترکہ اور تکثیری سماج میں اپنا رول اور کردار طے کرسکین۔

ہم نے اوپر کے پیراگراف میں تفصیل سے اسلام کے ورلڈ ویو اور اس ورلڈ ویو میں بین مذاہب تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔اب ہم آج کے ماحول اور معاشرے میں ان سنہرے اصولوں اور ڈائلاگ پروسس کا ذکر کریں گے جو اسلام اپنے ماننے والوں کو سکھاتا ہے۔

بھارت کا موجودہ منظر نامہ

ہندوستان پلورل سوسائٹی کی ایک نادر مثال ہے۔اس ملک میں مختلف مذاہب زبان، کلچر اور رنگ و نسل کے لوگ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے چلے آئے ہیں۔ ہر مذہب اور اس پر مشتمل سماج کی اپنی خصوصیات ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود باہم جڑے ہوئے ہیں جو ان کو ایک ملک اور قوم بناتے ہیں۔انگریزوں کی آمد سے قبل بادشاہوں کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں۔مگر عوام کے درمیان فرقہ وارانہ یا مذہبی دنگے نہیں ہوتے تھے۔انگریزوں نے جب پھوٹ ڈالو راج کرو کی نیتی کے تحت یہاں کے لوگوں کو مذہب، ذات اور علاقہ کی بنیاد پر بانٹنا شروع کیا تو ان کے درمیان اختلاف بڑھا اور بڑھتے بڑھتے اس نے تصادم کی شکل اختیار کرلی۔اس طرح ملک کے مختلف خطوں میں مختلف مذاہب کے درمیان فساد ہونے لگے۔ ہندوستان میں ہندو غالب اکثریت ہیں۔اس کے بعد مسلمان دوسری بڑی اکثریت ہیں اور اس کے بعد عیسائی، سکھ، بودھ، جین، پارسی اور دیگر مذاہب کے لوگ آتے ہیں۔

آزادی کی جنگ کے درمیان ایک لڑائی تو ملک کو آزاد کرانے کی چل رہی تھی جس میں ہندو مسلمان اور باقی تمام طبقات ایک ساتھ تھے، مگر ایک دوسری لڑائی مذہبی اور قومی برتری کی شروع ہوگئی۔ ہر طبقہ اپنے حصہ سے زیادہ لینا چاہتا تھا اور دوسرے کو اس کے حصے سے کم دینا چاہ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ اس کش مکش میں اضافہ ہونے لگا اور دونوں قومیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوگئیں۔دونوں طرف کے لیڈروں کی ذاتی انا اور خود غرضی کی وجہ سے کوئی قابل قبول فورمولہ نہیں اپنایا جاسکا۔اس طرح لوگ انفرادی اور گروہی طور پر تو کامیاب ہوئے مگر اجتماعی طور پر ناکام

ہو گئے۔ وہ لیڈران جن کے جہد وقربانی کی وجہ سے ملک آزاد ہوا فیصلے کی اس گھڑی میں ناکام ہو گئے۔اس طرح ملک آزاد تو ہوا مگر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

آزادی کی جنگ کے دوران ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان جو قومی کش مکش اور فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہوئے اس نے بہت جلد ایک دوسرے کے اندر نفرت اور تشدد کے جذبات بھر دیئے جس کا کوئی مذہبی محرک نہیں تھا بلکہ اس کا سیاسی محرک تھا، مگر ان لوگوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے کو فروغ دینے کے لئے مذہب اور مذہبی علامات کا خوب خوب استعمال کیا تاکہ دونوں طرف کے فرقہ پرست عناصر کے جذبات کو گرمایا جائے اور ان کو فرقہ وارانہ تشدد پر آمادہ کیا جائے۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔لہذا ملک کے مختلف حصوں میں بالخصوص نارتھ انڈیا میں پنجاب سے لے کر بنگال تک فرقہ وارانہ تشدد کا دار دورہ شروع ہو گیا اور مختلف ریاستوں اور شہروں میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ پر چھوٹے بڑے فسادات ہوتے رہے۔ ہر فساد کے بعد دونوں قوموں کے درمیان نفرت اور دوری بڑھتی گئی۔

ہندوستان کی بناوٹ ایسی ہے اور اس ملک کے طول وعرض میں ہندو اور مسلمان جس طرح آباد ہیں ملک کی کوئی تقسیم ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔لہذا تقسیم ملک کے بعد بھی جتنے مسلمان پاکستان میں تھے کم وبیش اتنے ہی مسلمان ہندوستان میں ہیں اور اس ملک کے جزو لاینفک ہیں جن کو کسی طرح اس ملک سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ملک کی آزادی کے بعد جو غالی فرقہ پرست طبقہ تھا اس کی مانگ تھی کہ جب مذہب کے نام پر ملک بٹ گیا تو مسلمانوں کو بھارت سے نکال کر پاکستان بھیج دینا چاہئے لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔اولا تو انکا یہ مطالبہ اصولی طور پر غلط ہے کیونکہ ملک کی تقسیم کسی ریفرنڈم کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے بڑے لیڈروں نے برٹش حکومت کی ایما پر ٹیبل پر بیٹھ کر کیا تھا اور اس طرح یہاں کے عوام کی آزادانہ مرضی جانے بغیر ان پر ایک فیصلہ اس وقت تھوپ دیا جس وقت ملک غلام تھا اور عملا اس ملک پر انگریزوں کی حکمرانی تھی۔لیڈروں کے اس فیصلے میں عوام کا نقصان ہوا۔اور اس وقت جو فرقہ وارانہ تشدد پھیلا اور جو مارکاٹ ہوئی اس نے جس انسانی المیہ کی شکل اختیار کی وہ تاریخ انسانی کے بڑے المیوں میں شمار ہوتی ہے۔

تقسیم کے وقت نفرت اور تشدد کی آندھی اتنی تیز تھی جس نے تمام مذہبی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو تہس نہس کر دیا اور دونوں طرف جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اپنے اپنے مذاہب کی اعلیٰ تعلیمات کو بھول کر درندے بن گئے تھے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ لیکن جب یہ قیامت صغریٰ گذری اور لوگوں کے ہوش ٹھکانے آئے اور انہوں نے اپنا از سر نو جائزہ لیا تو ندامت اور افسوس کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد بھی ملک میں ایک طبقہ ایسا رہا جو اس بات پر مصر تھا کہ مسلمانوں کو یا تو اس ملک سے نکال دیا جائے یا ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کر کے اس ملک میں غلاموں کی طرح جینے پر مجبور کیا جائے۔ اس کی ریشہ دوانیاں آج بھی علی حالہ قائم ہے اور وہ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں بلکہ پیدا کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس سازش کے شکار ہو جاتے ہیں اور بے جا جوش اور جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جس سے فرقہ وارانہ تصادم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

اس طرح آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ایک معمول بہ چیز بن گئے اور ایسے عناصر دونوں طرف موجود ہیں جو ہر دو جانب فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کے کم و بیش تمام ریاستوں میں ہر کچھ دنوں پر چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں جن میں سینکڑوں جانیں اور کروڑوں کی مالیت کا زیاں ہوتا ہے اور اس کی سب سے زیادہ مار عورتوں، بچوں اور غریب بے سہارا لوگوں پر اور مزدوروں پر پڑتی ہے۔ اس وقت ملک کی ترقی میں فرقہ وارانہ فساد سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس سے عالمی برادری میں ملک کی نیک نامی کو بٹا لگتا ہے۔ ایکطرف بھارت معاشی اور تکنیکی اعتبار سے ایک عالمی طاقت بننے کا خواب دیکھ رہا ہے اور دوسری طرف ملک کے اندر برپا فرقہ وارانہ تعصب اور فساد ملک کو دور تاریک میں لے جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی اور ملکی ہر دو نقطۂ نظر سے بھارت اور بھارت کے سماج کو اس دلدل سے باہر نکالنا بہت ضروری ہے۔

اس معاملے میں حضورؐ کی سیرت اور قرآنی تعلیمات ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں یہی اس مضمون کا مرکزی نکتہ ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ جاننا ضروری ہے کہ اس فرقہ وارانہ تصادم اور کش مکش کے وجوہات کیا ہیں۔ میری رائے میں اس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) قومی برتری کا احساس۔

(۲) زبردستی اپنی فکر، معتقدات اور تحفظات کو تھوپنے کی کوشش۔

(۳) نظام انصاف کی ناکامی

(۴) اہل اقتدار کی منافقت

(۵) عمل اور ردعمل کا نظریہ

یہ فہرست اور طویل کی جاسکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان نکات کو پھیلا دیا جائے تو بہت سی ذیلی باتیں اس میں آجائیں گی۔ یہاں یہ بات دھیان رکھنے کی ہے کہ جو گروہ فساد یا اس قومی کش مکش کی پشت پناہی کر رہا ہے وہ کسی غلط فہمی یا وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر یہ کام نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کی سیاسی حکمت عملی ہے جو اس نے بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ لہذا لوگوں کو ورغلانا، ان کے اندر غلط فہمی پیدا کرنا، ان کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنا، منظّم کرنا، باضابطہ ٹریننگ دینا، علمی، عملی اور لوجسٹک سپورٹ دینا، مالی اور مادی مدد پہنچانا اور چوبیس گھنٹہ اپنی پروپیگنڈہ مہم کے ذریعہ خوف اور بدگمانی کی فضا بنائے رکھنا اس کی خاص اسٹریجی ہے۔ لہذا اس مسئلے کو سطحی طور پر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک وسیع تر پولیٹیکل ایجنڈے کا حصہ ہے۔ لہذا اس صورتحال کے تدارک کے لئے ہمیں علمی اور سماجی دونوں سطحوں پر کام کرنا ہوگا۔ علمی سطح پر جو غلط فہمیاں اور جھوٹے پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں ان کا توڑ کرنا ہے اور سماجی طور پر لوگوں سے جڑ کر اپنے سیرت و کردار اخلاق و معاملات اور خدمت کے ذریعہ ان کی بدگمانی، نفرت اور دوری کو کم کرنا ہے۔ یعنی حضورؐ کی اس حدیث کو عملی طور پر برت کر دکھانا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''جو ہم سے کٹے میں اس سے جڑوں'' وقت آ گیا ہے کہ صرف سیرت کے جلسوں میں اخلاق نبوی کا ذکر، نہ کیا جائے بلکہ اس کو اپنی عملی زندگی میں برت کر دکھایا جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری حیثیت

چونکہ بات موجودہ حالات میں سیرت کے پیغام پر ہورہی ہے اس تناظر میں آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری پوزیشن پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلنا ضروری ہے ساتھ ہی مسلمانوں کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بھارت کی تقسیم اور آزادی کے وقت ہندوستان کے حالات اتنے پرآشوب تھے کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے اور ملک کس رخ پر جائے گا۔ ہرطرف مارکاٹ اورافراتفری تھی۔ لاکھوں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر نومولود ملک پاکستان بھاگ رہے تھے۔ سرحد کے اس جانب یہی حال ہندوؤں اور سکھوں کا تھا۔ ایک بہت ہی جذباتی ماحول تھا اور لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہورہے تھے۔ آخرکار سال ڈیڑھ سال کے اندر یہ طوفان بلاتھم سا گیا پھر اس کے بعد ملک میں نوآزاد مملکت کی تعمیر وترقی اور نظم وانصرام کے لئے دستور سازی کا سلسلہ شروع ہوا۔ باوجودیکہ ملک تقسیم ہوگیا تھا مگر دستور ساز اسمبلی میں جیسے اور قوموں کے افراد تھے ویسے ہی اس میں مسلمان ممبران بھی تھے۔ ہندوستان مذہب کے نام پر بٹا تھا مگر ہندوستان کے بالغ نظر حکمرانوں نے پہلے دن سے یہ بات طے کردی تھی کہ بھارت میں دستور سازی کسی مذہبی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی اور ملک کی مجموعی آبادی میں ہندو %80 سے زائد تھے مگر اس کے باوجود بھی نہ تو بھارت کو ہندوراشٹر یہ ڈکلیر کیا گیا اور نہ کسی ہندو مذہبی کتاب کو قانون سازی کی بنیاد بنائی گئی بلکہ اس کے مقابلے میں بھارت کو ایک خودمختار سوشلسٹ سیکولر قومی جمہوریہ قرار دیا گیا اور ملک کے ہر شہری کو انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی معنوں میں، آزادی خیالات کی، اظہار رائے کی، عقیدہ، ایمان اور عبادت کی، برابری مواقع اور حیثیت میں اور بھائی چارہ جس میں فرد کے احترام کی ضمانت مضمر ہے اور ملک کا اتحاد اور اس کی سالمیت برقرار رہنے کی ضمانت دی گئی۔

یہ دستور کا افتتاحیہ ہے جس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلالحاظ مذہب ملت، قوم برادری، جنس، نسل، رنگ، علاقہ اور زبان کی تفریق کے تمام لوگوں کو یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔

اوراس کومزید متحقق اور واضح کرتے ہوئے دستور کے باب سوئم میں بنیادی حقوق کےتحت تمام شہریوں کو یکساں حقوق واختیارات دئے گئے ۔ بنیادی حقوق کی دفعہ۱۴ جس میں قانون کے سامنے برابری کا حق دفعہ ۱۵ جس مین مذہب، نسل، ذات، جنس اور جائے پیدائش کی بنیاد پر کسی امتیازی برتاؤ کی ممانعت کی گئی ہے۔لہذا دستور کی اس شق کی رو سے تمام شہری برابر ہیں۔۔دفعہ ۱۶ میں عوامی خدمات میں روزگار کے لئے یکساں مواقع کا حق ، دفعہ ۱۹ میں اظہار خیال کا حق ، بلا ہتھیار کے پرامن طور پر جمع ہونے کا حق، تنظیم بنانے کا حق ، ملک کے اندر کہیں بھی آنے جانے کا حق اور ملک میں کسی بھی جگہ رہنے بسنے کا حق وغیرہ شامل ہیں۔ دفعہ ۲۱ میں زندگی کے تحفظ اور شخصی آزادی کا حق۔ دفعہ۲۲ کے تحت کچھ معاملات میں گرفتاری سے بچنے کا حق ، دفعہ۲۳ انسانوں کی خرید وفروخت ان کی اسمگلنگ اور جبری مزدوری سے تحفظ کا حق ، دفعہ ۲۴ میں بچہ مزدوری پر روک ، دفعہ ۲۵ میں ضمیر کی آزادی، آزادانہ پروفیشن چننے اوراپنے مذہب پر عمل کرنے اوراس کی تبلیغ کا حق ، دفعہ ۲۶ میں اپنے مذہبی معاملات کے انتظام انصرام کا حق جس کے تحت مذہبی اور رفاہی کاموں کے لئے ادارے قائم کرنے کا حق ، اپنے مذہبی معاملات کے انتظام کا حق ، منقولہ اور غیر منقولہ جائداد رکھنے اور حاصل کرنے کا حق اور قانون کے مطابق ان جائدادوں کے انتظام کا حق ، دفعہ ۲۷ کے تحت کسی مذہب کے فروغ کے لئے ٹیکس ادا کرنے سے آزادی ، یعنی سرکار کسی مذہب کے فروغ کیلئے کوئی ٹیکس نہیں لگائے گی ۔ دفعہ ۲۸ کے تحت مخصوص مذہبی اداروں میں مذہبی تعلیم یا عبادت کے لئے شرکت کی آزادی ، دفعہ ۲۹ کے تحت جولوگ اقلیت میں ہیں اور ملک کے کسی حصے میں رہتے ہیں ان کی مخصوص زبان اور رسم الخط ہے اوران کی مخصوص ثقافت ہے اس کے تحفظ کا حق ان کو حاصل ہے نیز کسی بھی شہری کو مذہب، نسل ذات ، اور زبان کی بنیاد پر ایسے تعلیم ادارے جو سرکاری امداد سے چلتے ہیں یا سرکار کے زیر انتظام چلائے جارہے ہیں داخلہ سے محروم نہیں رکھا جاسکتا ہے اور دفعہ ۳۰ کے تحت ملک کی اقلیتوں کو تعلیمی ادارے کھولنے اور چلانے کا حق ہوگا چاہے وہ مذہبی اقلیت ہو یا لسانی اقلیت ہو۔

اس طرح آپ دستور کے ابتدائیہ (Preamble) اور حصہ سوم میں مندرج بنیادی حقوق کے باب میں مندرج دفعات کو دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دستور کی رو سے مسلمانوں کو

دوہری ضمانت حاصل ہے۔ایک عام شہری ہونے کے ناطے جوحقوق و اختیارات ملک کے دیگر شہریوں کوحاصل ہے دوسرے ان کے دین، زبان اور کلچر کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے اور اس کے لئے ادارے کھولنے اور چلانے کا بھی حق دیا گیا ہے جس کے لئے حکومت بھی مالی اور دیگر مدد کرے گی۔

دستور کے ان بنیادی خصوصیات کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ باوجودیکہ مسلمان اس ملک میں اقلیت ہیں یعنی ہندو آبادی کے مقابلے ان کی تعداد کم ہے مگر دستوری طور پر وہ انفرادی طور پر برابر شہری ہیں اور ان کو برابری کے شہری حقوق حاصل ہیں۔

اس میں دورائے نہیں ہے کہ بھارت کے دستور میں کئی اندرونی تضاد بھی ہیں جس کی وجہ سے دستور کے کچھ پروویژن کچھ دوسرے پروویژن سے ٹکراتے ہیں۔دوسرے دستور میں لکھا ہونا ایک بات ہے اور اس پر اس کے روح والفاظ کے مطابق عمل کرنا ایک دوسری بات ہے اور اس معاملے میں بہت سارے Flaws ہیں۔دستور کے عملی نفاذ کی ذمہ داری ہماری حکومت، منتظمہ اور عدلیہ پر عائد ہوتی ہے۔آزادی کے بعد سات دہائیوں کا تجربہ یہ ہے کہ حکومت، منتظمہ اور عدلیہ نے دستور کے آئیڈیل کی حفاظت میں نہ صرف کوتاہی برتی ہے بلکہ جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کی ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کی ہمت افزائی کی ہے جس سے ہمارا دستور ہاتھی کا دانت بن گیا ہے جو کھانے کا اور ہے اور دکھانے کا اور۔

اس کے باوجود دستوری طور پر اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت برابر کے شہری کی ہے۔حالانکہ ملک میں ایک پاورفل لابی ہے جو عملاً مسلمانوں کو اس کے اس حق سے محروم کرنا چاہتا ہے مگر فی الوقت دستوری حیثیت یہی ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک میں مسلمانوں کے جان، مال، عزت آبرو، دین و مذہب، زبان وثقافت، پرسنل لا، تعلیمی ادارے، مساجد، مقابر، خانقاہ اور اوقاف پر مسلسل حملے ہورہے ہیں اور ہر وقت ان کے تلف ہوجانے کا خطرہ لگا ہوا ہے۔اس صورت میں ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے اور ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

ظاہر ہے نہ میں محقق ہو نہ مفتی اور نہ مجتہد اس لئے میں اس حیثیت سے کوئی بات کہنے سے قاصر ہوں، میں ایک عام شد بد رکھنے والے آدمی کی حیثیت سے جب اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں تو

میری سمجھ میں دو باتیں آتی ہیں ۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہندوستان کوئی اسلامی ملک نہیں ہے لیکن اسلامی ملک نہیں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کو جو آزادی اور اختیارات دستوری طور پر ملے ہوئے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے بہت سے مسلمان ملکوں میں بھی وہ ان کو میسر نہیں ہیں کیونکہ ان ملکوں کا پولیٹیکل سسٹم جمہوری نہیں ہے ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دستور میں جو آزادی اور تحفظات دی گئی ہیں عملی طور پر وہ حاصل نہیں ہیں لیکن یہ مسئلہ دستور کے نفاذ کا ہے اور جہاں تک قانون کی حکمرانی کا سوال ہے تو دنیا کے بیشتر ملکوں میں اس کا فقدان ہے ۔ اس لئے ان کمیوں اور تحفظات کے باوجود دستوری طور پر شہری اور شہری کے بیچ کوئی فرق نہیں ہے ۔

چونکہ ہندوستان میں مسلمان خاندانوں کی کئی صدی تک حکومت رہی ہے لہذا اس کے اچھے برے اثرات آج تک باقی ہیں اور اس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم بھارت کو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے کس درجے میں رکھیں گے ۔

دیکھئے مسلمان اس ملک میں باہر سے نہیں آئے ہیں بلکہ یہاں کے پیدائشی اور پشتینی شہری ہیں لہذا اپنے اوراوریجن کے اعتبار سے خالص ہندوستانی ہیں ۔ اس ملک میں ان کی اتنی آبادی ہے اور اس طرح ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں کہ بالکل گوندھے ہوئے آٹے میں نمک کی طرح ہیں ۔ اس لئے کوئی ان کو ہندوستان سے نہ الگ کرسکتا ہے اور نہ وہ الگ ہوسکتے ہیں ۔ اس طرح اس لزوم کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بھارت مسلمانوں کی فطرتی قیام گاہ ہے ۔

اس لئے ماضی میں بعض علماء نے ہندوستان کو جن ناموں سے پکارا ہے اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے ۔ اس دور کی سیاست اور حالات کے تحت انہوں نے بھارت کو اپنے خیال سے ڈیفائن کرنے کی کوشش کی ۔ مثلاً جس وقت مسلمان اس ملک میں آئے اس وقت اسلام یہاں نہیں تھا اس لئے انہوں نے اس کو دارالکفر کہہ کر پکارا ۔ جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو اسے دارالحرب کہا ۔ مگر اب وہ حالات اور سیاست تبدیل ہوگئے ہیں ۔ اس لئے ان خودساختہ اصطلاحات کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ اس وقت بھارت ہمارے لئے وطن مالوف ہے اور ہماری فطری قیام گاہ ہے ۔ جس کی بھلائی ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے ۔ اس ملک سے وفاداری اور یہاں کے لوگوں کی بھلائی ہماری دینی اخلاقی ، انسانی اور شہری ذمہ داری ہے ۔ ہمیں اس ماحول اور پس منظر میں

قرآن اور حضور کی سیرت وسنت نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جوسنہرے اصول دئے ہیں اور جو طریقہ بتائے ہیں اس پر ایک نظر ڈالتے چلیں تا کہ ملک کو فتنہ وفساد سے محفوظ رکھتے ہوئے یہاں کے تمام شہریوں کو جو حق ،عزت اور آزادی ہمارے دستور نے دیا ہے اس کو حاصل کرنے اور عملی طور پر زمین پر اتارنے میں کامیاب ہوں ،اس سے پتہ چلے گا کہ ایک جدید مشترک سماج میں اسلام باہمی خیرسگالی انصاف اور قیام امن کے لئے کیا رول پلے کرسکتا ہے۔

ابھی تک آپ کے سامنے ملک کی دستوری اور قانونی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے ،مگر مسلمانوں کے تعلق سے زمینی حالات کیا ہیں اس کا بھی جاننا ضروری ہے۔کوئی بھی مشورہ یا طریق کار تبھی مفید ہوگا جب آپ زمینی حاالت سے واقف ہوں اور اس کی اچھی سمجھ رکھتے ہوں۔اس لئے مسلمانوں کو کسی مثبت رول پر آمادہ کرنے سے پہلے ان کے حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے سامنے نفسیاتی چیلنج اور ان کا حل

آزادی کے بعد ملک کے دستور اور قانون کی رو سے مسلمان اور قوموں اور برادریوں کی طرح اس ملک کے برابر کے شہری ہیں لیکن عملا ان کے ساتھ ہر سطح پر اور ہر مقام پر تعصب اور امتیاز برتا جاتا ہے۔نتیجہ ہے کہ انہیں نہ تو پوری طرح امن وامان نصیب ہے اور نہ ہی نیشنل کیک میں ان کو ان کا واجبی حصہ ملتا ہے۔پچھلے ستر سالوں کی بے مہری اور ناانصافی کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمان اس ملک کی سب سے پس ماندہ ترین سماجی اکائی ہیں۔حالات نے ان کو نفسیاتی اور مادی ہر دو اعتبار سے ان کو اپنی جڑوں سے اکھاڑ دیا ہے لہذا اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو بڑا مسئلہ ہے ایک ہے نفسیاتی باز آباد کاری یعنی psychological Rehabilitation کا تو دوسرا مسئلہ ہے معاشی اور مادی باز آباد کاری یعنی physical & Economic Rehabilitation کا۔نفسیاتی طور پر مسلمان خوف (fear) عدم تحفظ (insecurity) عدم استحکام (Instability) تذبذب (Confusion) کمزوری(infirmity) اور احساس کمتری (Inferiority) مایوسی ومحرومی(frustustration & deprivation) سے دوچار ایک (Ghettomentality) کے ساتھ جی رہے ہیں۔ ایک طرف فسادات کے ذریعہ ان کو خوف

زدہ رکھا جاتا ہے، دوسری طرف دہشت گردی کے نام پر دہشت زدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تیسری طرف ان کی شہریت کونشانہ بانے کی سازش رچی جارہی ہے۔

ان حالات نے نفسیاتی طور پرمسلمانوں کو بیمار بنادیا ہے ۔ ان کے اندر سے Boldnessاور Initiative ختم ہوچکی ہے۔وہ بدلاؤ سے ڈرتے ہیں۔ ان کے اندر خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ختم ہورہی ہے۔سسٹم پر سے بھروسہ ختم ہورہاہے۔ دستور قانون اور دستوری اداروں کوجس طرح یرغمال بنا کر انصاف کے تقاضوں کو پامال کیا جارہا ہےاب ان اداروں پر سے بھی اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ان حالات کی وجہ سے مسلمان مجموعی طور پر سخت نفسیاتی دباؤ میں ہیں۔

جہاں تک مادی اور معاشی محرومی کا حال ہے تو تمام سرکاری اور غیر سرکاری مطالعات گواہی دے رہے ہیں کہ پورے ملک اور اس کے تمام خطوں اور علاقوں میں ملک کے تمام دیگر طبقات اور برادریوں کے مقابلے مسلمان سب سے پس ماندہ قوم ہیں جہاں بھوک، کوپوشن، غربت، جہالت، بیماری، بیکاری، بےگھری اور شرح اموات سب سے زیادہ ہیں۔انہیں قرض کی فراہمی نہیں ہوتی ۔ان کے لئے روزگار کے مواقع بہت کم میسر ہیں۔انڈسٹری، بزنس، ٹریڈ کامرس، زراعت، حرفت اور دیگر خدمات میں ان کی شرکت بہت معمولی ہے۔حکومت، انتظامیہ، عدالت، سیاست، صحافت، حکومتی اور غیر حکومتی ایجنسی، یونیورسیٹی، ریسرچ سنٹر، فوج، پارا ملٹری فورسز، پولس، انٹلی جنس اور حساس مقامات پر ان کی شرکت نہ کے برابر ہے۔ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور فیصلے کے عمل میں ان کو شامل نہیں کیا جاتا۔ ان سب کا ملا جلا اثر ہے کہ یہ پوری طرح Deprived, Demoralised, & Marginalized. گروہ بن گئے ہیں۔لہذا ملت کو اس وقت اندر اور باہر دونوں طرف سے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے مفوضہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لائق بن سکے۔اس کے لئے ملت کے اندر نظم اور تعلیم کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ہندوستان میں آزادی کی جنگ کے دوران ہی اکثریت کی برتری کی مہم شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ملک تقسیم ہوا۔آزادی کے بعد جو اس کی مخالف قوت تھی وہ ختم ہوگئی۔ ہندوستان میں عددی اعتبار سے ہندو غالب اکثریت ہیں ۔لہذا فطری طور پر جمہوری قدروں کے مطابق ملک میں اکثریت کی حکومت ہوگی اور وہ ہے ۔ملک میں اس وقت دایاں محاذ، بایاں محاذ سنٹرسٹ پارٹی کے

علاوہ ذات اور علاقہ پر مبنی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ان میں کچھ پارٹیوں کی قیادت فورورڈ کچھ کی قیادت بیک وارڈ اور کچھ کی قیادت دلت اور آدی باسی طبقہ کے لوگ کرتے ہیں۔مگر یہ ساری پارٹیاں اکثریت کی برتری کو اصولی اور عملی طور پر تسلیم کرتی ہیں ملک میں بایاں محاذ اس وقت زوال پذیر ہے، سنٹرسٹ پارٹی کانگریس بکھراؤ سے دوچار ہے۔ بیک وارڈ، دلت اور علاقائی پارٹیاں محدود اثرات رکھتی ہیں۔اس وقت دایاں محاذ کی پارٹی جس کی قیادت بی جیب پی کررہی ہے اور جس کی نظریاتی رہنمائی آراس اس کے ہاتھ میں ہے وہ ہندتو کے نظریہ کے مطابق اس ملک کو چلا رہی ہے۔جس کا دو مطلب ہے ایک ہر حال میں ہندو برتری کو قائم کرنا اور دوسرا ملک میں میجوریٹی رول نہیں میجوریٹرین رول قائم کرنا۔یہ لوگ ظاہری طور پر تو دستور کی وفاداری کا حلف لیتے ہیں۔مگر عملا اس دستور کے خلاف کام کررہے ہیں۔اس وقت ان چیزوں نے مجموعی طور پر جو صورتحال پیدا کردی ہے اسی میں ہمارے دین وایمان، حکمت اور سمجھ داری کا امتحان ہے۔ہمیں ان کی تحقیق کرنی ہے کہ ان حالات میں ہم اپنی اور اپنے ملک کو کس طرح بچا سکتے ہیں اور قرآن وسنت بالخصوص سیرت رسول سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔اس وقت ہمارے سامنے دو چیلنج ہے۔

(۱) ملت کا تحفظ واستحکام اور

(۲) فرقہ وارانہ خیر سگالی کی کوشش

تحفظ ملت کا نبوی طریقہ

اس وقت ملک کا ایک طبقہ جس کو قوت واقتدار حاصل ہے اس نے مسلمانوں کے خلاف ایک مکمل نفسیاتی جنگ چھیڑ رکھی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہر طرف سے ان کی مشکیں کس دی جائیں نتیجہ ہے کہ مسلمان ایک ہمہ گیر خوف اور عدم تحفظ کے شکار ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ حل بھذا البلد یعنی گویا ان کو اس شہر میں حلال کرلیا گیا ہے کی روایت دہرائی جارہی ہے۔وہ ساری امان جو کسی نہ کسی نوع میں حاصل تھیں وہ واپس لی جارہی ہیں۔اس طبقہ کو امید ے کہ وہ مسلمانوں کے ان عناصر کو جن کی صحیح اسلامی تعلیم وتربیت نہیں ہوتی ہے، جو مسلم سماج کے حاشیہ پر ہیں جہاں غربت اور جہالت کا راج ہے اور وہ ثقافتی طور پر کفر واسلام کی سرحد پر ہیں ان کو بڑی آسانی کے ساتھ اسلام سے پھیر کر

دائرے کفر میں لایا جاسکتا ہے ۔دوسرے اس کو مسلمان سماج میں موجود اختلاف وانتشار سے بھی بہت حوصلہ ملتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کو اور بڑھا کر مجموعی حیثیت سے ان کو اور کمزور اور بے وزن کیا جاسکتا ہے ۔تیسری طرف اکثریت کے عام طبقات بالخصوص نوجوانوں ،عورتوں ، ہندو پس ماندہ برادریوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دوری پیدا کرنے کی زوردار مہم چلائی جارہی ہے تاکہ ان طبقات میں ان کے لئے جو نرم گوشہ ہے وہ ختم کیا جائے اور انہیں ان کے خلاف تشدد اور فساد کے لئے آمادہ کیا جائے ۔ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کو اپنے کاز میں نام نہاد مسلمانوں کے ایک چھوٹے گروہ کا ہی سہی مگر ان کی سرگرم حمایت حاصل ہے ۔اس لئے اگر ان حالات کو مختصر میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ آگ ہے، اولادابراہیم ہے، نمرود ہے، کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے۔

جی ہاں یہ امتحان کی گھڑی ہے اور ہم یک گونہ عرصۂ محشر میں ہیں اور قاضی وقت ہم سے پوچھ رہا ہے پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔ میں نے اوپر تفصیل سے بہت ساری باتیں لکھی ہیں اب میں نکات وار قرآن وسنت کی روشنی میں اس لائحۂ عمل کا تذکرہ کروں گا جو میری نظر میں موجودہ حالات سے باہر آنے کا نبویؐ طریقہ ہے۔

(۱) اعتصام باللہ والرسالہ

میری رائے میں موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اپنے پاور ہاؤس سے بالکل چمٹ کر رہنا چاہئے جب سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور بالکل عالم بے پناہی ہوتی ہے تو مومن کے لئے رجوع الی اللہ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔موجودہ حالات دراصل ہمارے ایمان کا امتحان ہیں۔جب صاحب ایمان کو سخت آزمائشی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس وقت وہ مایوس اور بدگمان نہیں ہوتا بلکہ اس وقت اس کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ یہ سب ایمان واسلام کے آزمائشی مرحلیں ہیں۔اللہ نے قرآن پاک میں صاف صاف فرمادیا کہ

> ہم ضرور تمہیں خوف و، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔(البقرہ ۱۵۵)

لہذا ایمان کے راستے میں یہ سارے مرحلے آئیں گے۔ ان کا پورے صبر وثبات کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے اور اللہ سے اچھی امید رکھنا ہے اور ان حالات میں صبر اور نماز سے مدد لینی ہے۔ صبر کا مطلب افسوس کرنا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہانا نہیں ہے بلکہ صبر کا مطلب اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے رہنا ہے اور نماز کا مطلب ہر وقت اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرتے رہنا ہے۔ انشاء اللہ ہمارے عزم اور عزیمت کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی آئے گا تو وہ ہماری حدت ایمانی سے پگھل کر پانی پانی ہو جائے گا۔

ایمان واسلام کی راہ میں صاحب ایمان لوگوں کے سامنے اس طرح کے آزمائشی مرحلے تو منطقی طور پر آتے رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کسی متنفس پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے۔ اگر اللہ نے ہمیں ان حالات میں ڈالا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے ہمیں ان حالات کو برداشت کرنے اور اس سے باہر نکلنے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اس لئے اللہ کی ذات سے ہمیشہ پر امید رہنے کی ضرورت ہے اور یہ دعا کرنی ہے کہ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جسے ہم سہار نہ سکیں اور اہل کفر کے مقابلے ہماری مدد فرما۔

حضور نبی کریم ﷺ نے جب مکے میں اپنی دعوت شروع کی تو تمام ائمہ کفر آپ کے خلاف صف آرا ہو گئے اور آپ پر اور آپ کے جانثار ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے، مگر جب آپ نے ان تمام ظلم وتشدد کے باوجود اپنی دعوت نہیں چھوڑی تو تمام سرداران قریش ایک ایک کرکے آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ اب پانی سر سے اوپر بہہ رہا ہے۔ ہم آپ کے احترام میں ابھی تک آپ کے بھتیجے کو چھوڑتے آئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھا دیجئے ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔ ابوطالب نے ان سرداران کی بات سنی اور پھر حضورؐ کو بلایا اور کہا کہ دیکھو یہ سرداران قریش کیا کہہ رہے ہیں۔ اور حضور کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں ان کے مقابلے میں تمہاری حمایت نہیں کر سکتا۔ مکہ میں حضورؐ اس وقت جن حالات میں تھے اس وقت ابوطالب کی حمایت کا کیا مطلب تھا؟ ان کی حمائت کا مطلب تھا کہ جب تک ان کی حمایت حضور کو حاصل ہے مکہ میں کوئی حضور پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حمایت واپس لینے کا مطلب ان حالات میں بالکل بے امان اور بے یار و مددگار ہو جانا تھا۔ جب حضورؐ نے ابوطالب کی زبان سے یہ بات سنی تو

آپ نے اسی وقت کفار مکہ کے سرداروں کی موجودگی میں صاف صاف کہا۔ چچا جان میں نے یہ کام آپ کی یا آپ کے قوم کے بھروسے پر شروع نہیں کیا ہے۔ مجھے اللہ نے اس کام کا حکم دیا ہے۔

اور اسی کے بھروسے پر یہ کام شروع کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے وہ تاریخی جملہ کہا جو دنیا کی جدوجہد کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ''اگر یہ لوگ ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں تب بھی یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے یہ دعوت کامیاب ہوگی چاہے میری جان جائے گی۔''

اس وقت ہمیں ایسے ہی ایمان یعنی تعلق باللہ اور تعلق بالرسول کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے اپنے خدا اور اپنے رسول سے رشتہ مضبوط کرلیا تو ہماری منزل آسان ہوجائے گی اور ہم آدھی جنگ جیت جائیں گے لہذا ہمیں سب طرف سے کٹ کر اپنے خدا اور اس کے رسول سے چمٹ جانا چاہئے اور حضورؐ نے غار ثور کے دہانے پر پیچھا کرتے ہوئے مشرکین کے پاؤں کو دیکھ کر حضرت ابو بکر پر جب جو خوف طاری ہوا تو آپ نے فرمایا لاتحزن ان اللہ معا یعنی گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے اس پر زندہ یقین ہونا چاہئے۔

خدا اور رسول سے چمٹنے کا مطلب کیا ہے۔ اللہ کی خشیت، اس سے محبت اور اس کی اطاعت، حضور سے چمٹنے کا مطلب ہے رسول سے بے پناہ محبت اور رسول کی سیرت وسنت کا اہتمام۔ اس کا اظہار ہمارے شب وروز اعمال، اخلاق اور معاملات میں ہونا چاہئے۔ تبھی اللہ کی مدد آئے گی (انشاءاللہ)

(۲) ایمان کے لئے علم ضروری ہے

ایمان کا اولین تقاضہ ہے کہ علم حاصل کیا جائے۔ اسلام سراپا علم ہے اور قرآن علم کا منبع ہے۔ قرآن کی پہلی ہدایت جو اپنے نبیؐ کو ملی وہ پڑھنے کی تھی۔ لہذا علم کے بغیر دنیا میں نہ خلافت ہوسکتی ہے نہ عبادت۔ اللہ نے انسان کو فرشتوں اور دیگر تمام مخلوقات پر علم ہی کی بدولت برتری دی تھی۔ لہذا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔

اس وقت اگر مسلمانوں کی ایک کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ بالکل بے وزن اور پس

ماندہ ہیں اور دنیا کی قوموں میں کوئی حیثیت واہمیت نہیں رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کی علمی پسماندگی ہے۔علمی پس ماندگی کا مطلب روایتی مذہبی تعلیم سے ناواقفیت ہی نہیں ہے بلکہ وہ حدیث کی زبان میں ہرطرح کے علم نافع کے حصول میں پیچھے ہیں ۔آج کی دنیا سائنس اورٹکنولوجی کی دنیا ہے اور مسلمان اس معاملے میں بالکل پس ماندہ ہیں۔بغیر جدید تعلیم کے مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہم نے بہت سارا وقت غلط ترجیحات کے پیچھے برباد کردیا ہے۔وقت آگیا ہے کہ ہم ہوش کے ناخن لیں اور بغیر وقت گنوائے اور ادھر ادھر کی خرافات میں اپنا قیمتی سرمایہ ضائع کئے ساری توجہ حصول علم پر لگائیں تا کہ ہم تمام علوم جدیدہ میں مہارت تامہ حاصل کرکے دنیا کی امامت کے لائق بنیں ورنہ ہمیں موجودہ قعر مذلت سے کوئی چیز نہیں نکال سکتی ہے۔اس لئے علم ایمان کے بعد دوسرا لازمی عنصر ہے جوملت کی تعمیر وبقا کے لئے ضروری ہے۔اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ اللہ نے علم کو ہر چیز پر برتری عطا کی ہے۔لہذا جوامت علم میں پیچھے رہ جائے گی وہ اس مادی کائنات میں آگے نہیں بڑھ سکتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اول روز سے مسلمانوں کی تعلیم پر زور دیا اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھی آپ نے تعلیم کا نظم کیا۔تعلیم کی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ جب جنگ بدر میں مکے کے کچھ قیدی گرفتار ہوکر آئے۔ان میں جولکھنا پڑھنا جانتے تھے حضورؐ نے ان سے کہا کہ مدینے کے دس دس مسلمان بچوں کولکھنا پڑھنا سکھا دیں۔یہی ان کا فدیہ ہوجائے گا۔یہاں یہ بات قابل غور ہے۔پہلی یہ کہ تعلیم کی اتنی اہمیت ہے کہ کسی سے بھی سیکھی جاسکتی ہے چاہے وہ دین کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔دوسرے ظاہر سی بات ہے جومشرک اور کافر ہے وہ دین کی تعلیم تونہیں دے گا اس کا مطلب ہے کہ ہرطرح کی تعلیم جومفید ہوسکتی ہے وہ کسی بے دین اور دین دشمن کے پاس بھی ہے اس سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔اس طرح حضور کی اس حدیث کا مفہوم بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے اسے جہاں پاؤ حاصل کرلو۔قرآن نے صاف صاف کہا جس طرح آنکھ والا اور بے آنکھ والا برابر نہیں ہوسکتے اسی طرح ایک صاحب علم اور ایک جاہل برابر نہیں ہوسکتے ہیں۔اس لئے قیادت وامامت کے لئے ایک بڑی بنیادی شرط علم ہے ۔جوعلم وفہم کے اعتبار سے جتنا بلند ہوگا قیادت وامامت کا وہی سب سے زیادہ مستحق ہوگا۔چاہے اس کا حسب نسب کچھ بھی ہو۔اس لئے

اسلام اپنے ماننے والوں کوعلم حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہےاوراسلام میں علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ایک عربی مقولہ ہے کہ علم حاصل کرو چاہیے اس کے لئے چین جانا پڑے۔مختصر یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ علم ہمارا ہتھیار ہے۔لہذا ہم علم کے ذریعہ ہی عزت وسربلندی کی جنگ جیت سکتے ہیں۔ اس لئے موجودہ حالات کا دوسرا حل یہ ہے کہ ہم علمی معالے میں پوری جذبہ ایمانی کے ساتھ آگے بڑھیں اور ایک جذبہ جہاد کیساتھ علم حاصل کریں۔ہمیں اس وقت جہالت کے خلاف جہاد کرنا ہے اور مسلم سماج سے جہالت کا خاتمہ کرکے ہی دم لینا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔وقت آگیا ہے کہ ہم جہالت کے خاتمہ اورعلم کے فروغ کے لئے ہرممکنہ کوشش کریں اوراپنے سماج کے کسی بھی بچے اور بچی کوتعلیم سے محروم نہ رہنے دیں۔انہیں اعلیٰ ،معیاری اور مسابقتی تعلیم سے بہرور ہونے کے مواقع پیدا کریں۔ہم صرف مساجداور مدارس کی تعمیر پرتوجہ نہ دیں اورصرف ان پرہی خرچ کرنا نیکی اورثواب نہ سمجھیں بلکہ،کالج،یونیورسٹی،اورتمام جدید تعلیمی اداروں کے قیام پربھی توجہ دیں اور جوسرکاری ادارے ہیں ان سے بھی بھرپوراستفادے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے اللہ نے پوری کائنات کومسخر کردیا ہے۔ہمیں علمی طور پراس مقام تک پہنچنے کی جدوجہد کرنی چاہئے اوراس کام کا آغاز آج اورابھی سے کرنا چاہئے۔ہم جواس وقت امت جہل بنے ہوئے ہیں۔اس کو بدل کرامت علم بننا ہے۔یہ ہمارے عزت وسربلندی اوراستحکام وترقی کی لازمی شرط ہے۔ہم کواپنے ماتھے سے جہالت کا کلنک مٹا کرعلم کے تاج کوزینت سرکرنا ہے اس کے لئے اپنی ترجیحات پرازسرنوغور کرنا ہےاورتعلیم کے لئے ذرائع وسائل پیدا کرنے کا اہتمام کرنا ہےاس حدتک جب تک پوری مسلمان قوم تعلیم یافتہ نہ ہوجائے۔خوب جان لیجئے ہمارا ایک بچہ بھی جاہل رہ گیا تو قوم آگےنہیں بڑھ سکتی ہے۔

غربت کے خلاف جنگ

غربت اور جہالت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے۔ہمیں غربت سے بھی لڑنا ہے جس کے لئے محنت اور خودداری کی روش کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔مسلمانوں میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محنت سے جی چراتے ہیں،انہیں کوئی چھوٹا کام کرنے میں شرم آتی ہے،مگر جب

وہ ضرورت سے مجبور ہوجاتے ہیں تو بلبلا اٹھتے ہیں اور اس وقت دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں جب ایک بار مانگنے کی عادت پڑ گئی اب کوئی مجبوری ہو یا نہ ہو وہ اس کو پیشہ بنالیتے ہیں۔ بیمار، بزرگ اور معذور لوگ اگر مجبوری میں ہاتھ پھیلاتے ہیں تو اس کا جواز ہے اور ان کی مدد بھی کرنی چاہئے لیکن جب صحت منداور جوان لوگ ہاتھ پھیلاتے ہیں تو بہت برا لگتا ہے۔ مسلمانوں کے قومی غیرت کو جو چیز بٹا لگا رہی ہے اس میں غربت اور گداگری بھی ایک بڑی وجہ ہے۔

غربت کے ازالے کی پہلی صورت تو جہالت کا خاتمہ ہے۔ جب علم آئے گا تبھی کوئی مسلمان درمیانہ اور اونچی ملازمت کا اہل ہوسکتا ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے صناع رہے ہیں اور ان کے پاس روایتی اسکل رہی ہے۔ مگر اب ٹکنلوجی میں جس طرح کی روزافزوں تبدیلی ہورہی ہے اس کے لئے انہیں لگاتار اپنی ہنرمندی میں اضافہ کرنا ہوگا تاکہ مارکیٹ میں ان کی مانگ بنی رہے اور ان کو روزگار ملتا رہے۔ سرکاری نوکری تو دن بدن گھٹتی جارہی ہے اس لئے پرائیوٹ سکٹر میں جن صلاحیتوں کی مانگ ہے اس کے مطابق اپنی نوجوان فورس کو تیار کرنا یہ وقت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ملت کے جو قائدین اور پالیسی ساز اور ان کیلئے جو فکرمند افراد اور جماعتیں ہیں ان کو اس جانب بھرپور توجہ دینی چاہئے۔

مختصراً عرض ہے کہ غربت کا ازالہ اور معاشی استحکام بھی ہمارا ترجیحی ملی ایجنڈا ہونا چاہئیے جس کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات اور ماحول میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ غربت کا خاتمہ کیوں ضروری ہے اس کے لئے حضور کی ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ غربت آدمی کو کبھی کبھی کفر میں مبتلا کردیتی ہے۔ غربت کی وجہ سے ہی بچے بیمار اور لاغر ہوتے ہیں، ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما ٹھیک سے نہیں ہوتی، وہ اسٹنٹڈ (Stunted) اور انڈرویٹ ہوتے ہیں۔ بڑے ہوکر وہ لاغر اور کمزور ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر محنت و جانفشانی کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ کوئی بھی بیماری ان پر جلدی اور پہلے حملہ آور ہوتی ہے۔ غربت اور جہالت کی وجہ سے بیمار عورتوں پر دوہری مار پڑتی ہے اور وہ طرح طرح کی ستم ظریفیوں کا شکار ہوتی ہیں۔ اس لئے ان تمام چیزوں کے ازالہ کے لئے غربت اور جہالت ان دونوں کے خلاف ایک منظّم جنگ

چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس وقت ایک دینی ملی تقاضہ ہے۔

صحت وتندرستی

کسی بھی آدمی کا پہلا تعارف اس کی قد وقامت ہوتی ہے، پھر اس کا لباس پوشاک، پھر اس کی بات چیت، پھر اس کی خصلت، عادات واطوار پھر اس کی فہم ودانائی۔ اسی نوے فیصد لوگوں کی ظاہری شکل وصورت اور اس کی قد وقامت سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی شخصیت کیسی ہے؟ کسی آدمی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کا رعب قائم ہوتا ہے اور لوگ اس کی شکل وشباہت اور ڈیل ڈول دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا چاہئے۔ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کو جسمانی طور پر کمزور مومن کے مقابلے جسمانی طور پر مضبوط اور قوی مومن پسند ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو جسمانی طور پر صحت منداور پوری طرح تندرست یعنی اس کی فٹنس بہت اچھی ہونی چاہئے مگر جب آپ مسلمان آبادی میں مسجدوں میں نماز پڑھنے جائیں، مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو دیکھیں، عام مسلمان مرد، خواتین اور بچوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس حدیث کے بالکل برخلاف ہر جگہ کمزور لاغر، دبلے پتلے، بیمار، کھانستے ہوئے مختلف امراض میں مبتلا مرد وخواتین ملیں گے جن کے چہرے پر نہ گوشت ہے اور نہ جن کی رگوں میں خون، وہ انیمیا کے شکار اور طرح طرح کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ان میں بعض بیماریاں تو وہ ہیں جو محض صحت اور حفظان صحت سے لاپرواہی برتنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض بیماریاں وہ ہیں جو لائف اسٹائل میں تھوڑی تبدیلی سے دور ہوسکتی ہیں اور بعض معمولی دوا علاج سے ٹھیک ہوسکتی ہیں۔ جن بڑی اور موذی بیماریوں کا سوال ہے وہ بھی ہمارے رہن سہن، کھان پان اور غلط طرز زندگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جن سے بچا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ صحت کے معاملے میں بالکل لاپرواہ ہیں۔

اللہ کے رسول نے فرمایا صفائی نصف ایمان ہے۔ یہاں جس صفائی کی بات کی گئی ہے وہ ظاہری صفائی ہے۔ آپ نے کلمہ پڑھ لیا اب آپ کا قلب شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک ہوگیا گویا آپ کی باطنی صفائی ہوگئی۔ اسلام صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کا اصرار ہے کہ اس کے ماننے

والے ظاہری طور پر بھی صاف ستھرے ہوں ۔ دنیا کی قومیں صرف لفظ صفائی سے واقف ہیں لیکن اسلام نے ہم کو صفائی کا اعلیٰ معیار عطا کیا ہے وہ صرف صفائی کی بات نہیں کرتا بلکہ پاکی اور صفائی دونوں کی بات کرتا ہے ۔ پاکی کا مطلب نجاست سے پاک ہونا ہے جو دھوکر اور نہا کر حاصل کی جاسکتی ہے اور صفائی ہر طرح کی گندگی سے صفائی ہے ۔ ہم نے دین دار مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ وہ پاک تو ہوتے ہیں مگر صاف نہیں ہوتے ۔ لہذا ان کو دیکھ کر کراہت ہوتی ہے ۔ حضورؐ نے زینت و زیبائش کو پسند فرمایا ہے ۔ حدیث میں آتا ہے اللہ جمیل ویحب الجمال ۔ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے ۔ لہذا پاک صاف رہنا، صاف ستھرا رہنا، سلیقہ سے رہنا یہ اسلامی شعار ہے ۔

آپ کسی ریگستان میں نہیں رہتے جہاں پانی نہیں ہے یا کسی ایسی برفیلی جگہ پر نہیں ہیں جہان پانی کا استعمال مشکل ہے ۔ آپ بالعموم معتدل آب و ہوا میں رہتے ہیں لہذا روز غسل کرنا مشکل نہیں ہے ۔ اس طرح آپ کا جسم صاف رہے گا ۔ اسلام میں مسواک کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے ۔ منہ اور پیٹ کی اسی فیصد بیماریاں دانت اور منہ کو گندہ رکھنے کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ لوگ تمبا کو ، گٹکھا ، بیڑی سگریٹ اور نہ جانے کیا کیا کھاتے ہیں جس سے دانتوں کی بیماریاں اور منہ کا کینسر ہوسکتا ہے ان چیزوں سے بچنے کا آسان طریقہ ہے کہ آپ دانت اچھی طرح صاف کریں ۔ دانت میں کوئی چیز نہ پھنسنے دیں اور منہ کے بدبو کا خاص خیال رکھیں ۔ حضورؐ نے مسجد میں یا ایسی جگہوں پر جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں بدبودار چیز جس کے کھانے سے منہ مہکتا ہے اور لوگوں کو اس سے تکلیف ہوسکتی ہے کھا کر جانے سے منع کیا ہے ۔ اسی طرح اگر آپ بال اور داڑھی رکھتے ہیں تو سلیقے سے کنگھی اور داڑھی کو تراش خراش کر قاعدے سے رکھیں تا کہ وہ آپ کی مردانہ خوبصورتی میں اضافہ کرنے والا بنے نہ کی چڑیا کا گھونسلہ نظر آئے جس کو دیکھ کر لوگ منہ پھیر لیں ۔ لباس قاعدے سے سلا ہوا ہو، بیڈھنگا اور بے تکا نہ ہو ۔ صاف ستھرا دھلا اور استری کیا ہوا ہو، اسی طرح جوتا چپل جو بھی آپ پہنتے ہیں وہ پالش کیا ہوا ہو یا کم از کم گرد وغبار آلود نہ ہو ۔ گھر سے نکلتے وقت اپنے سراپا کو ایک بار ضرور دیکھ لیں تا کہ جو بھی ظاہری نقص ہوا سے دور کیا جا سکے ۔

اسی طرح آپ کے گھر کے پانی کے برتن صاف اور ڈھکے ہونی چاہئے ۔ گلاس ، پلیٹ ،

چمچہ، اور دیگر کھانے پکانے اور کھانے کا جو بھی سامان ہے اس میں کوئی گندگی نہ ہو۔ ہر کھانے سے پہلے اسے اچھی طرح دھولیں اور صاف کپڑے سے پوچھ لیں۔ آپ کا گھر آنگن، بستر چادر، تکیہ، اوڑھنے کا سامان ہر چیز صاف ستھرا ہونا چاہئیے اور اس میں سلیقہ اور نفاست کا پورا خیال رکھا جانا چاہئیے۔

صرف اپنا گھر ہی صاف نہ رکھیں بلکہ اپنے پاس پڑوس کی صفائی کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نے اپنا گھر صاف کرلیا اور ساری گندگی سڑک پر یا کسی دوسرے کے دروازے پر ڈال دیا یہ بات حفظان صحت اور پڑوسی کے حقوق کے خلاف ہے۔

یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان محلوں میں عوامی سہولتوں کی بڑی کمی ہوتی ہے۔ سرکاری عملہ کی لاپرواہی اور لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے عام طور پر مسلم محلے گندے ہوتے ہیں۔ لہذا اس کے لئے ہر دو جانب کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

بچوں کی اچھی صحت کے لئے ماں کا جان کار سمجھ دار اور صحت مند ہونا ضروری ہے۔ لہذا مسلمان محلوں اور بستیوں میں صحت بیداری مہم بڑے پیمانے پر چلایا جانا چاہئے جہاں انہیں ضروری معلومات اور امداد فراہم کیا جائے تا کہ ماں اور بچہ دونوں صحت مند ہوں۔ صحت مند ماں ہی صحت مند بچہ جنم دے سکتی ہے۔ لہذا عورتوں کی صحت پر خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

پرائمری ہلتھ کیئر سینٹر یا ریفرل ہاسپٹل میں ان کی وقتاً فوقتاً جانچ ہونی چاہئے اور ضرورت کے مطابق ان کی دوا، غذا اور علاج کا نظم کیا جانا چاہئے۔ بچے کی پیدائش ہسپتال میں کرانا چاہئے اور بچے کو ابتدا میں جن ٹیکوں کی ضرورت ہے وہ سب ڈاکٹر یا ہلتھ ورکر کی صلاح پر لگانا چاہئے۔ اس طرح عمر کے ساتھ بچے کا وزن، اس کے قد کی جانچ اور اس کی ذہنی نشو ونما کی جانچ بھی کرانی چاہئے تا کہ اگر اس وقت کوئی کمی سامنے آتی ہے تو بروقت اس کا علاج کر کے اس کو درست کیا جا سکے۔

بچہ جب عہد طفولیت سے نکل کر لڑکپن اور بلوغ کے مرحلے میں داخل ہونے لگتا ہے تو اس بچے خصوصاً لڑکیوں میں کئی طرح کی ہارمونل تبدیلی ہوتی ہے جس میں بعض اوقات بے اعتدالی بھی پیدا ہوتی۔ اس پر اگر بروقت قابو پالیا گیا تو مستقبل میں بہت ساری طبی پیچیدگیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد جب بچہ بھر پور جوانی کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت اس کی جو غذائی ضرورتیں (Nutritional need) ہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیئے تا کہ اس کی بھر پور اور معتدل نشونما ہو سکے۔ بچوں کو ابتدا سے ہی صحت منداور اچھی عادتوں کا عادی بنانا چاہیئے۔ انڈ ور اور آوٹ ڈور گیم اور ذہنی نشو ونما کے لئے جو مشاغل ضروری ہیں ان پر بھی دھیان دینا چاہیئے۔ صفائی ستھرائی مناسب غذا اور ورزش اور فٹنس کا اہتمام صحت مند زندگی کے لازمی شرائط ہیں۔

جب لوگ بوڑھے ہونے لگیں اس وقت ان کی صحت، دوا علاج، خدمت اور خبر گیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں زندگی کے ہر مرحلے کے لئے ایک واضح روڈ میپ کے مطابق اپنی ملت کو صحت مند ،مضبوط، چست درست، پھرتیلا اور طاقت ور بنانے کا اہتمام کرنا چاہیئے تا کہ مسلمان ظاہری اور جسمانی طور پر طاقت ور بنیں اور ذہنی و اخلاقی طور پر عالی مرتبت۔ یہ ملت کے تحفظ و استحکام کی لازمی شرط ہے۔

(۵) اتحاد و اجتماعیت

بچپن میں میں نے ایک کہانی پڑھی تھی، آپ میں سے بہت سے لوگوں نے وہ کہانی پڑھی ہوگی۔ ایک بزرگ شخص تھے جنہوں نے بہت محنت اور جانکاہی سے بڑی دولت حاصلکی تھی۔ وہ حالانکہ خود بہت نیک آدمی تھے مگر ان کے عروج کو دیکھ کر بہت سے لوگ ان سے حسد رکھتے تھے اور ان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ اس شخص کے چار بیٹے تھے، یہ چاروں محنتی بھی تھے اور اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بھی بٹاتے تھے مگر یہ لوگ آپس میں اپنے بھائیوں سے خوب لڑتے رہتے تھے اور یوسفؑ کے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس بزرگ شخص کو اپنے بیٹوں کے آپسی اختلافات کی وجہ سے بہت فکر لگی رہتی تھی۔ اور ہمیشہ یہ احساس اسے ستاتا رہتا تھا کہ اس نے جس محنت اور قربانی سے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے ان کے بیٹوں کے آپسی جھگڑے کی وجہ سے وہ کہیں برباد نہ ہو جائے۔ اس نے بہت سے واقعات پڑھے تھے اور اس کا ذاتی مشاہدہ بھی تھا کہ کس طرح بہت سے گھرانے، کاروبار اور بڑی بڑی سلطنتیں آپسی اختلافات کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے تباہ ہو گئیں۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو نصیحت کرتا مگر کوئی اس کی بات

پر دھیان نہیں دیتا۔ تب اس نے اپنے لڑکوں کو سمجھانے کے لئے ایک ترکیب سوچی اور پتلی پتلی لاٹھیوں کا ایک گٹھر منگوایا۔ پھر اس نے اپنے بیٹوں کو ایک ایک لاٹھی توڑنے کے لئے دی۔ بیٹے کافی صحت منداور طاقت ور تھے۔ ان چاروں نے ایک جھٹکے میں وہ لاٹھیاں توڑ دیں۔ پھر اس نے دو لاٹھیاں ایک ساتھ توڑنے کو ان کو دی۔ اس کو بھی ان لوگوں نے تھوڑی دیر میں توڑ دیا۔ پھر اس نے تین لاٹھیاں ان کو توڑنے کے لئے دیں مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ اس کو توڑ نہیں سکے۔ پھر اس نے ان چاروں کو ایک ساتھ ان لاٹھیوں کے گٹھر کو توڑنے کے لئے کہا چاروں مل کر زور لگاتے رہے اس کے بعد بھی وہ ان لاٹھیوں کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تب اس بزرگ شخص نے گویا عملی طور پر ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر وہ متفرق رہیں گے اور باہم ہمیشہ لڑتے رہیں گے تو کوئی بھی آسانی سے انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے جیسا کہ انہوں نے الگ الگ لاٹھی کے سلسلے میں دیکھا۔ مگر جیسے جیسے لاٹھیوں کی گنتی بڑھتی گئی ان کے لئے اس کا توڑنا مشکل ہو گیا اور جب لاٹھیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور ساری لاٹھیاں ایک ساتھ تھیں تو وہ چاروں اپنی طاقت اور جوانی کے باوجود اس کو توڑنے میں ناکام رہے۔ یہ مثال ثابت کرتا ہے کہ اگر وہ متحد رہے تو وہ طاقت ور ہوں گے اور کوئی باہری اور اندرونی طاقت یا سازش ان کو نقصان نہیں پہچا سکتی۔ مگر وہ اگر منتشر رہے تو پھر کوئی بھی انہیں پامال کر سکتا ہے اور وہ تباہ و برباد ہو سکتے ہیں میں نے جو کہانی پڑھی تھی اس کا انجام یہ ہوا کہ جب ان کو اس مثال سے سمجھایا تو ان کے بیٹوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا کہ اب وہ آپس میں نہیں لڑیں گے اور باہم اتفاق واتحاد کے ساتھ رہیں گے اور انہوں نے اپنے باپ کو دئے اس عہد کی تاعمر پاسداری کی اور اپنی زندگیوں میں کامیاب وکامران ہوئے۔

یہ کہانی تو فرضی ہے جو اتحاد و اتفاق کا سبق سکھانے کے لئے لکھی گئی ہے، مگر اس کہانی میں زندگی کی حقیقی سچائی چھپی ہوئی ہے جو بتاتی ہے کہ اتحاد میں قوت ہوتی ہے اور انتشار میں ذلت ونامرادی انگریزی کا مقولہ ہے United we stand divided we fall اتحاد ہمیں ایستادہ رکھتی ہے جبکہ اختلاف ہمیں گراتی ہے۔ اب سوال ہے کہ ہم گرنا چاہتے ہیں یا اٹھنا چاہتے ہیں۔ اس کو انگریزی میں Choice is yours یعنی فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ اتحاد کو پسند کرتے ہیں یا انتشار کو۔

اگر آپ فرداً فرداً مسلمانوں سے پوچھیئے کہ کیا آپ اتحاد بین المسلمین یعنی مسلمانوں کے درمیان اتحاد چاہتے ہیں تو آپ کو سو میں سے سو آدمی کہے گا ضرور چاہتے ہیں۔ مگر انفرادی سطح پر اتحاد کا زبردست احساس رکھنے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ اجتماعی طور پر مسلمانوں میں اتحاد اتفاق نہیں ہے بلکہ یہ پوری طرح ٹوٹی بکھری قوم ہے جس نے اس کی ہوا اکھاڑ دی ہے۔

ہم نے تو آپ کو اوپر ایک فرضی کہانی سنائی تھی، مگر ہمیں حضورؐ کی سیرت وسنت میں اس کی نادر مثال ملتی ہے۔ حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل مدینہ میں اوس اور خزرج نام کے دو قبیلے آباد تھے مگر دونوں آپس میں خوب لڑتے تھے۔ اسی مدینے میں یہودیوں کی بھی ایک آبادی تھی۔ یہودی ان دونوں قبائل کو آپس میں لڑانے میں کلیدی کردار ادا کرتے تھے۔ یہ دونوں قبائل آپس میں تو خوب لڑتے تھے مگر یہودیوں کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ حضورؐ جب مدینہ تشریف لائے تو ان دونوں قبائل کے لوگوں نے آپ پر ایمان لایا اور یہ لوگ حضور اور اس دین ودعوت کے انصار بن گئے۔ حضور نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے وہاں کی طوائف الملوکی کو دور کیا۔ آپ نے مدینہ کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سب سے پہلے یہودیوں سے معاہدے کیا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ان کو نظم ومعاہدہ کا پابند بنایا۔ اب آپ نے سماجی سطح پر دو بڑے کام کئے جس نے مدینہ کا پورا نقشہ بدل دیا۔ وہ قبیلے جو ہمیشہ خانہ جنگی اور برادر کشی میں لگے رہتے تھے آپس میں شیر وشکر ہو گئے اور انہوں نے اتحاد ویگانت اور وفاداری، جانثاری اور شراکت واتفاق کی ایسی مثالیں پیش کیں جو رہتی دنیا تک لاثانی رہے گی۔ آپ نے سب سے پہلے اوس اور خزرج کے درمیان صلح کرائی۔ ان دونوں قبیلوں میں جیسی دشمنی تھی اور اس کی وجہ سے ان پر جیسی تباہی مسلط تھی اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن نے بیان کیا ہے ''تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ (آل عمران۔۱۰۳) گویا وہ دونوں دشمنی کی آگ میں جل مرنے کو تیار تھے۔ مگر جیسا کہ اللہ نے اسی آیت کے ابتدائی حصہ میں کہا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دئے اور اس کے فضل وکرم سے تم بھائی بھائی بن گئے''۔ جب اللہ نے یہ احسان کیا تو اس کا حکم ہے اور اس کے اس احسان کا تقاضہ ہے کہ ''تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو اور اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔'' (سورہ آل عمران۔۱۰۳)

اس طرح اوس وخزرج شیر شکر ہو گئے پھر آپ نے مکہ سے آئے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخواۃ قائم کی یعنی ایک انصاری کو ایک مہاجر کا بھائی بنا دیا اور ایک نئے ایمانی رشتے کی بنیاد پڑی۔ اوران دونوں نے جس قربانی، فراخدلی، ایثار اور غیرت کا ثبوت دیا ہے بوڑھے آسمان نے آج تک اس سے بہتر مثال نہ دیکھی ہے اور نہ مل سکتی ہے۔

اس طرح ایک چھوٹی سی جماعت جب حضورؐ کی قیادت میں اٹھی تو باوجود بے سروسامانی کے وہ ہر معرکہ میں کامیاب رہے اور دیکھتے دیکھتے پورے عرب پر چھا گئے۔ نہ صرف زمینوں پر ان کا قبضہ ہوا بلکہ انہوں نے اپنے سیرت و کردار اور اعلیٰ دعوت واخلاق سے ان کے دلوں کو بھی جیت لیا۔ اس طرح ایک بکھری اور باہم متصادم قوم اسلام کے جھنڈے تلے متحد اور منظّم ہو سکتی ہے جو لوگ پشتینی اور پیدائشی مسلمان ہیں وہ کیا آپس میں مل نہیں سکتے۔ شہر گاؤں محلے، ریاست اور ملک میں متحد اور منظّم ہو کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔

ایک طرف ہم غریبی، جہالت، اور پسماندگی کی مار سہہ رہے ہیں۔ دوسری طرف اسلام دشمن اور مسلمان دشمن طاقتیں پورے دل بل کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہورہی ہیں اور ہم ہیں کہ ابھی بھی ہوش کے ناخن لینے کو تیار نہیں ہیں۔ بلکہ جوتیوں میں دال بانٹ رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم نوشت دیوار پڑھیں اور اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے درمیان ایسی بہت سی باتیں ہیں جن پر ہمارا ایک دوسرے سے اختلاف ہے۔ کچھ باتیں ایسی تو ہوسکتی ہیں۔ جن پر ہمارا آپس میں اتفاق ہے تو کیا ان امور پر ہم مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ہم مکے اور مدینے کے حالات جیسے تھے ویسے واپس تو نہیں لا سکتے ہیں اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ لیکن اس سے روشنی اور ھدایت تو ضرور حاصل کر سکتے ہیں اور موجودہ حالات کی روشنی میں کچھ تجربات کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر محلّہ اور گاؤں میں کچھ صاحب ثروت گھرانے ہیں اور کچھ بہت ہی غریب اور بے سہارا لوگ ہیں ہم لوگوں کو بھیک نہ دیں یا جب وہ کچھ مانگیں تو نہ دیں۔

بلکہ ایک امیر خاندان ایک غریب خاندان کو اپنا دینی بھائی مانتے ہوئے اس کے بچوں کی

تعلیم صحت دوا علاج ،تہوار ،شادی اور غمی کے موقع پر اس کامکمل یا جزوی مالی بوجھ برداشت کرنے کا اہتمام کرے تو میں سمجھتا ہوں اس سے ایک نیا سماجی انقلاب پیدا ہوگا۔اس کو پائلٹ پروجکٹ کے طور پر کچھ مخصوص مقام پر شروع کیا جائے اگر لوگ اس کو قبول کریں تو اس تجربے کو اور جگہوں پر روبعمل لانے کا اہتمام کیا جائے۔اگر ہماری دینی ملی جماعتیں اس میں دلچسپی لیں تو اس سے نہ صرف سیرت کا اپلیکیشن ممکن ہو سکے گا اور ایک متروک سنت پر عمل بھی ہوگا۔حضورؐ کا فرمان ہے جس نے ایک مردہ سنت کو زندہ کیا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا آیئے ایک تحریک چلاکر ہندوستان میں مواخواۃ والی سنت کو زندہ کرنے کی کوشش کریں۔

یہ اتحاد عمل کی ایک مثبت مثال بھی ہوگی اور عملی اتحاد کے سمت میں ایک قدم بھی ہوگا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو اتحاد کی کتنی ضرورت ہے اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن نے اختلاف کے وجوہات بتائے ہیں اور اختلاف کون کرتا ہے اس کی بھی نشاندہی کردی ہے۔عوام اور عام فرد ملت کبھی اختلاف نہیں کرتے۔وہ تو اختلاف کے شکار ہو جاتے ہیں۔اور اختلاف کی نوے پچانوے فیصد وجہ نفسانی ہوتی ہے عوام کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ شخصی ،وقتی اور مقامی نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کی وجہ ذاتی غرض وانا ہوتی ہے۔لہذا یہ نفسانی اختلاف ہے اس لئے وہ بے چارے اتنے باصلاحیت نہیں ہوتے کہ اپنے اختلاف کو نظریاتی رنگ دے سکیں جبکہ جو بڑے لوگ ہوتے اور اپنے ذاتی اغراض کو نظریاتی جامہ پہنا کر اپنے اختلاف کو نظریاتی اصولی اور اخلاقی رنگ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔مگر ذرا سا اگر پرت کھرچ کر دیکھا جائے تو ان کی ذاتی غرض عریاں ہوکر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔چنانچہ قرآن نے اختلاف کے باب میں بہت لطیف پہلو اجاگر کیا ہے۔اس نے پہلی بات یہ کہی کہ ''اگر اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں علم دیا جاچکا تھا'' اس سے ظاہر ہے کہ اختلاف صاحب علم لوگوں نے کیا۔یعنی جان بوجھ کر کیا۔یہ اختلاف کیوں کیا اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔یعنی اس کے پیچھے خودغرضی اور نفسانیت تھی۔یہ خدا واسطے کا اختلاف نہیں تھا۔(سورہ البقرہ۔۲۱۳) لہذا وقت آگیا ہے کہ ہمیں لوگوں کی ظاہر داری پر نہیں دھوکہ کھانا چاہئے بلکہ جو لوگ امت کے اجتماعی مفادات کے خلاف کام کررہے ہیں ان سے اپنی برات کا اعلان کرنا چاہئے۔اتحاد کا مطلب یک

رنگی نہیں ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ساری جماعت ختم کر دی جائے سارے مسلک ختم کر دئے جائیں۔ساری تحریکیں لپیٹ دی جائیں۔نہیں اتحاد اور اتفاق کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔اتحاد واتفاق کی قابل عمل صورت یہ ہے کہ ملت اپنا ایک کومن منیمم پروگرام طے کرے اور تمام جماعتیں باہمی اشتراک سے ایک وفاق بنائیں اس وفاق کی قیادت تمام جماعتوں کے ذمہ داران کریں اور ان میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہ ہو بلکہ سب ایک مجلس صدور (Presidium) بنا کر کام کریں۔اس ادارے کا ایک بجٹ ہو جس میں سبھی جماعتوں کی حصہ داری طے ہو اور گویا وہ ملت کی ایک متحدہ پلیٹ فارم کے طور پر کام کرے۔اس کا ایک تحریری دستور ہو جس میں ایک شق ایسی ضرور ہونی چاہئے کہ جو امور کومن منیمم پروگرام میں آتے ہیں ان میں سے کسی امر کے سلسلے میں کوئی صدر ذاتی طور پر نہ تو کوئی بیان دے گا اور نہ انفرادی حیثیت میں حکومت یا اکثریت کے کسی تنظیم جماعت، برادری اور گروہ سے کوئی بات یا معاہدہ کرے۔تمام ذمہ داروں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

ابتدائی طور پر اگر ایسا کرنا ممکن ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ملت کو آپسی مسائل، اندرونی حالات اور خارجی امور پر بات کرنے میں آسانی ہوگی اور مثبت پہل کا آغاز ہوگا۔یہ ایک دیوانے کا خواب ہے کیا کوئی اس پر دھیان بھی دے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔مگر آپسی اتحاد واتفاق اور مشترکہ حکمت وعمل کی راہ نکالنا ہماری بنیادی ضرورت ہے اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

پلورزم کے باب میں اسلام کا نقطہ نظر

اوپر میں نے اسلام کے جس ورلڈ ویو کی وضاحت کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام انسانی سماج میں موجود تنوع اور اختلاف کو جس کو تکثریت یا پلورزم کہتے ہیں نہ صرف برداشت کرتا ہے بلکہ اس کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس کے احترام کی تلقین بھی کرتا ہے۔اسلام مذہبی تنوع (Religious Pluralism) ،نسلی تنوع (Ethic pluralism) لسانی تنوع (Linguis tic Pluralism) قومی تنوع (racial Pluralism) اور لونی تنوع (Colour Pluralism) یعنی ہر طرح کی تکثیریت کو تسلیم کرتا ہے اور اس نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے پر امن بقائے باہم کے لئے جامع اصول دئے ہیں۔ہم نے قرآن پاک کی دو آیتوں اور

حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اس کے کچھ حصوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ قاری کے سامنے ایک صحیح اور پوری تصویر ابھر کر آ جائے اور وہ اسلامی موقف اچھی طرح جان اور سمجھ لے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کی سورہ الحجرات سورہ نمبر ۴۹ آیت نمبر ۱۳ میں ارشاد فرماتا ہے۔

اے لوگوں! (o! Man kind) ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں (Notions) اور برادریاں (Tribes) بنادی تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار (Noblest) ہے۔ یقیناً۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (۴۹:۱۳)

اسی طرح سورہ روم نمبر (۳۰) اور آیت نمبر ۲۲ میں اللہ تعلیٰ ارشاد فرماتا ہے اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں (Languages) اور تمہارے رنگوں (Colours) کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لئے۔ (۳۰:۲۲)

ان دونوں آیتوں کو دیکھئے واضح طور پر قوموں (Nations) برادریوں (tribes) زبانوں (Languages) اور رنگوں (Colours) کا ذکر صیغہ جمع یعنی (plural form) کیا گیا ہے۔ یعنی اسلام اس تنوع اور تکثیر کو تسلیم کرتا ہے اور اس کو اللہ کی نشانی کے طور پر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سمجھدار لوگوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ یعنی آدمی کو اگر تھوڑی بھی عقل ہوگئی تو وہ ان چیزوں کو خوش دلی سے تسلیم کرے گا نہ کہ اس بنیاد پر اپنی برتری کا اظہار کرے گا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اس سے لڑے گا۔

اس بات کو حضورؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اور واضح کر کے تمام اہل اسلام کو جو میسج دیا ہے اس سے نہ صرف ساری غلط فہمی دور ہو جاتی ہے بلکہ اسلام کا موقف پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تمہارے ابوالا با بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری حاصل نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر کوئی برتری

ہے۔کسی کالے کو گورے اور کسی گورے کو کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ کے اور جو اچھے عمل کرنے والا ہے۔آپ اوپر قرآن کے فرمان اور حضورؐ کے اس خطاب کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جہاں اسلام نے یہ بتایا کہ اللہ ایک ہے اور تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں وہیں اس نے یہ بھی بتایا کہ کسی عربی اور عجمی کو ایک دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے اور نہ کالے اور گورے کے درمیان کوئی امتیاز صحیح ہے یہ ارشادات جہاں ایک طرف انسانی وحدت کا چارٹر ہیں وہیں انسانی سماج کی تکثیریت کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان ظاہری اختلافات کے باوجود کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔

سوائے اس کے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔اور ان آیات واحادیث کے تناظر میں تقوی کی علامت یہ ہے کہ اس کا دل اور دماغ قومی، نسلی اور لسانی تعصّبات سے پاک ہو تبھی وہ اللہ کا پسندیدہ بندہ کہلا سکتا ہے۔حضورؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کے برا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اپنے بھائی کو حقیر تصور کرے۔(مسلم)

عصبیت کی تعریف

لہذا ان تفصیلات کی روشنی میں اسلام مین جن اعلیٰ انسانی اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اس میں خواہ اپنا ہو یا پرایا ہر کسی کے ساتھ انصاف، انسانیت، شرافت مرحمت اور فراخدلی کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتا ہے اور تمام طرح کی جاہلی عصبیت کو ختم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

عصبیت کیا ہے ۔حضرت ابوفیسلہ رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا اپنے لوگوں سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں یہ عصبیت نہیں ہے۔عصبیت (تعصب اور فرقہ واریت) یہ ہے کہ آدمی اپنے لوگوں کی حمایت ظالمانہ کاروائیوں میں کرے۔(مشکوۃ)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا، جو شخص باطل اور ناجائز کاموں میں اپنے قبیلہ (کنبہ، خاندان اور قوم) کا ساتھ دیتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی اونٹ کنویں میں گر رہا ہو اور یہ اس کی دم پکڑ کر لٹک گیا اور اونٹ کے ساتھ کنویں میں جا گرا (ابوداؤد۔ابن مسور)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے، وہ ہم سے نہیں ہے جو عصبیت کے جذبہ سے جنگ کرے اور وہ بھی ہم سے نہیں ہے جو عصبیت پر مرے۔ (جبیر بن مطعم)

ان احادیث سے واضح ہے کہ عصبیت کا مطلب کیا ہے ''میری قوم چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر'' یہ شیطانی اور جاہلی عصبیت ہے۔ اس نظریہ کی طرف بلانا، اس جذبہ سے جنگ کرنا اور اس ذہنیت پر مرنا مسلمان کا کام نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے اللہ کے رسول نے اپنی لاتعلقی کا اعلان کیا ہے۔

لہذا میں سمجھتا ہوں کہ اس تفصیل سے تکثیری سماج کے سلسلے میں اسلام کا موقف واضح ہوگیا ہوگا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بھارت جیسے تکثیری سماج میں جہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، پارسی، یہودی اور دیگر چھوٹی بڑی سماجی، ثقافتی، نسلی اور لسانی اکائیاں ایک ساتھ اور ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتی ہیں اس میں اسلام پرامن بقائے باہم کے لئے کیا رہنما اصول دیتا ہے اس کا بھی مختصر جائزہ لیتے چلنا اس بات کو متحقق کرنے کے لئے مناسب ہوگا۔

پلورل سماج میں اتحاد، امن اور خیر سگالی کے رہنما اصول

(۱) اختلاف مذاہب کو تسلیم کرنا

پرامن بقائے باہم کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ آپ اختلاف مذاہب کو تسلیم کریں۔ جب آپ اس کے وجود کو تسلیم کریں گے تبھی آپ اس کے مطابق رویہ اپنا ئیں گے۔

قرآن سورہ الحج سورہ نمبر ۲۴ اور آیت نمبر ۱۷ میں مسلمان، یہودی، عیسائی، مجوسی اور جو لوگ مختلف خداؤں کو پوجتے ہیں یا مشرک ہیں ان کا واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی، نصاریٰ، اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کردے گا۔ (۲۴:۱۷)

اس کا مطلب ہے کہ یہ تمام مذاہب کے لوگ رہیں گے اور ان کا فیصلہ دنیا میں نہیں بلکہ

قیامت میں ہوگا۔لہذا آپ کوان کے وجودکوتسلیم کرنا پڑے گا۔

قرآن نے سورہ المائدہ (سورہ نمبر۵) اور آیت نمبر ۴۸ میں اورواضح طور پر اس حقیقت کوسامنے لایا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

> ہم نے تم انسانوں میں سے ہرایک کے لئے ایک شریعت(A law)اورایک راہ عمل(An open way ,) مقرر کردی ہے۔اگرتمہارا خدا چاہتا تو تم سب کوایک امت بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔لہذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔آخرتم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔(۵:۴۸)

قرآن سورہ انعام (سورہ ٦) اور آیت ۱۰۸ میں بتاتا ہے کہ اللہ نے ہرگروہ کے عمل کوخوشنما بنادیا ہے پھرانہیں اپنے رب کی طرف پلٹ کرآنا ہے۔اس وقت وہ انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔(٦:۱۰۸)

اس طرح گویا ہرمذہبی گروہ جوعقیدہ رکھتا ہے اور جوعمل کرتا ہے وہ اس کوخوشنما لگتے ہیں تبھی تو وہ اس سے چمٹا ہوا ہے۔لہذا ان تک صحیح بات پہنچانا ضروری ہے۔مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کا وجو قائم رہے گا۔اس لئے دنیا میں اس کوتسلیم کرتے ہوئے چلنا ہے۔اور یہ سب خدا کی مشیت کا حصہ ہے۔انسان کی آزمائش کی لازمی حقیقت ہے۔لہذا اس کا آخری اورمکمل فیصلہ دنیا میں نہیں آخرت میں قیامت کے دن ہوگا۔آپ جب اس حقیقت کوتسلیم کرلیں گے تو آپ کا عملی رویہ مذاہب کے بارے میں بدل جائے گا اوراس وقت آپ کو مٹانے اورختم کرنے کے بجائے ان کوتسلیم کرکےان کے ساتھ کس طرح کا مہذب اور پرامن رشتہ رکھا جاسکتا ہے۔اس کو طے کرسکتے ہیں۔

(۲) مذہب کی آزادی

جب آپ یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ کسی سماج یا ملک میں ایک سے زائد مذہب ہیں اور

ایک تکوینی حکمت کے طور پر وہ رہیں گے تو آپ کو تمام مذاہب اوران کے ماننے والوں کو پوری مذہبی آزادی دینی ہوگی۔ پوری مذہبی آزادی کا مطلب کیا ہے؟ پوری مذہبی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اس مذہب کا جو عقیدہ اوراس کے اظہار کی جو شکلیں ہیں، اس کا جو طریق عبادت ہے، اس کے مذہبی رسومات اور تہوار ہیں، ان کے یہاں موت و پیدائش، شادی بیاہ اور دوسرے سماجی اور تمدنی رسوم ہیں ان کی ادائیگی کی پوری اجازت ہے اور آزادی ہوگی۔ اسی طرح ان کا جو کھان پان ہے رہن سہن ہے، لباس پوشاک ہے اور جو چیزیں ان کی مذہبی اور تمدنی شناخت ہے یہاں تک کہ جو ان کی زبان، رسم الخط اور مذہبی و تعلیمی ادارے ہیں ان کی حفاظت، قیام، انتظام وانصرام ان کے تحفظ اور اشاعت اور اپنے مذہب کے تبلیغ کی آزادی ہوگی۔ اگر اس طرح کی آزادی کسی مذہبی گروہ کو ایک مشترک سماج میں میسر ہوتی ہے تو پھر وہ گروہ بغیر کسی خوف اور ذہنی تحفظ کے ملک قوم اور سماج کے استحکام و ترقی میں اپنا کردار ادا کرسکے گا اور سماج میں فرقہ وارانہ خیر سگالی اور بھائی چارہ کا ماحول بنے گا۔

اسلام نے اس باب میں تین طرح کی آزادی کا ذکر کیا ہے

(۱) لا اکراہ فی الدین

یعنی وہ دین کے معاملے میں جبر کی نفی کرتا ہے۔ اور صاف صاف کہتا ہے کہ کسی کو زبردستی کسی عقیدے یا طریقے کو ماننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(۲) عقیدہ کی آزادی

قرآن سورۃ الکہف (نمبر ۱۸) اور آیت ۲۹ میں صاف صاف کہتا ہے ”گرچہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اب جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے انکار کردے (۲۹:۱۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے خیال میں آپ کا دین حق ہے، مگر جس کے سامنے آپ اس کو پیش کررہے ہیں وہ اس کو حق ماننے سے انکار کرتا ہے تو آپ اس پر جبر نہیں کرسکتے بلکہ اس کو اس کی پوری اجازت اور آزادی ہوگی اور وہ جس چیز کو اپنے خیال میں حق سمجھ رہا ہے اس کے مطابق اس پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

(۳) عدم مداخلت

آزادی کا تیسرا مطلب کسی دینی معاملے میں عدم مداخلت ہے اگر مداخلت ہوگا تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ہماری مذہبی آزادی یا توختم کرر ہے یا اس کی تحدید کرر ہے ہیں اور یہ دونوں صورت آزادیٔ مذہب کے مفہوم کی نفی کرتی ہے اور اس صورت میں سماج میں بدامنی اور انتشار پیدا ہوگی جو فرقہ وارانہ امن اور خیر سگالی کو نقصان پہنچائے گی۔

ایک سماج میں ایک سے زائد مذاہب کے لوگ ہیں ان کے درمیان مذہبی مکالمہ ہوگا ان میں اگر کسی بات پر اتفاق رائے نہ ہو تو اس صورت میں مذہبی آزادی اور شرافت جس کو public decoram & decency کہتے ہیں کہ ہم اس اختلاف پر اتفاق Agreement on Disagreement) کرلیں کہ لکم دینکم ولی دین یعنی تمہارا دین تمہارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ ہم تمہارے دین میں مداخلقت کریں گے اور نہ تم ہمارے دینی معاملات میں مداخلت کرو۔اگر ہم اس اصول کوتسلیم کرلیتے ہیں تو ایک تکثیری سماج میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے عقیدے اور مذہبی اعمال کے ساتھ زندگی گذاریں گے اور کوئی کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔

اسلام نے صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا۔مثال کے طور پر اسلام میں شرک وبت پرستی حرام ہے مگر جو غیر مسلم قومیں ہیں اور وہ ایک سے زیادہ خداؤں میں یقین رکھتے ہیں اور ان کا بت بنا کر پوجتے ہیں اس کو کبھی منع نہیں کیا۔اسی طرح اسلام میں شراب اور سور کا گوشت حرام ہے مگر اگر کسی کے یہاں یہ چیزیں حلال ہیں تو اسلام مسلمانوں پر تو پابندی لگاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا استعمال نہیں کرسکتے ہیں مگر جن مذاہب والوں کے یہاں یہ جائز ہے اس کے باوجود کہ وہ کسی مسلم ملک اور سماج میں رہتے ہیں ان کو کھانے پینے سے نہیں روکتا ہے۔

آزاد بھارت کا جو دستور ہے وہ ایک غیر مذہبی ریاست یعنی سیکولر ریاست کا تصور پیش کرتا ہے

لیکن سیکولر ریاست کا مطلب لامذہبی ریاست نہیں ہے ۔اس کا مطلب ہے کہ عوام کا

مذہب تو ہوگا مگر ریاست کسی خاص مذہب کی پابند نہیں ہوگی، یعنی مفاد عامہ میں جو قانون سازی ہوگی وہ کسی خاص مذہب یا مذہبی کتاب کی بنیاد پر نہیں ہوگی۔ ریاست نہ تو کسی خاص مذہب کی طرفدار ہوگی اور نہ کسی مذہب کی مخالف بلکہ وہ مذہبی معاملے میں غیر جانب دار ہوگی۔ گرچہ اس دستور کے تحت جو حکومتیں بنی ہیں اور چل رہی ہیں وہ اس آئیڈیل کی پابندی نہیں کرتی ہیں تاہم یہ اصولی حیثیت ہے جس کا ذکر کیا جارہا ہے۔

اس دستور نے اپنے ابتدائیہ میں تمام شہریوں کو جو ظاہر ہے مختلف مذاہب اور عقیدے کے ماننے والے لوگ ہیں بلکہ ان میں کچھ ملحد اور بے دین بھی ہیں آزادی سب کو دی ہے جس کی مزید تفصیل ہمیں بنیادی حقوق کے باب میں ملتی ہے۔ بنیادی حقوق کی دفعہ ۱۵ میں یہ کہا گیا کہ ریاست کسی شہری کے ساتھ مذہب، نسل، ذات، جنس اور جائے پیدائش کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرے گی اسی طرح دفعہ ۲۵ میں ضمیر کی آزادی، کسی پیشہ کو چننے اور اختیار کرنے کی آزادی، مذہبی معاملات کے انتظام وانصرام کی آزادی مثلا مذہبی رفاہی کاموں کے لئے ادارہ بنانے اور چلانے کی آزادی، مذہبی معاملات کا انتظام کرنے اس کے لئے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنے اور قانون کے مطابق اس کا انتظام وانصرام کرنے وغیرہ کی آزادی شامل ہے۔ اسی طرح دفعہ ۲۹ کے تحت جو اقلیتیں ہیں جن کی اپنی مخصوص زبان ہے، اس کا رسم الخط ہے ان کا مخصوص کلچر ہے، ان کے بچوں کی اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کا حق اور اس کی آزادی دی گئی ہے۔ دفعہ ۳۰ میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو مذہبی اور لسانی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی آزادی اور حق دیا گیا ہے۔

اس طرح اگر آپ قرآن کے احکام اور بھارت کے دستور کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بھارت کا جو دستور ہے اس میں کم از کم بنیادی حقوق کے باب میں قرآنی تعلیمات کی روح سمائی ہوئی ہے جس تکثیری سماج میں متعدد مذاہب اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں ان کے لئے اس دستور میں ایک اچھا ورنگ فورمولہ مل سکتا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ بھارت کے دستور کو یہاں کے حکمرانوں نے ناکام بنادیا ہے جس کی وجہ سے بھارت میں مختلف مذہبی گروہ سخت اندیشے اور دباو میں رہتے ہیں۔ بھارت میں فرقہ وارانہ کش مکش کی ایک بڑی وجہ دستوری آئیڈیل سے اعراض ہے۔ لہذا اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ بھارت کے سیاسی نہج کو تبدیل کرکے اس

کو دستوری آئیڈیل پر لایا جائے اور دستور سے جہاں جہاں انحراف ہو رہا ہے اس کو دور کر کے فرقہ وارانہ خیر سگالی کی فضا بنانے میں مدد کی جائے تا کہ مذاہب کے لوگ مل کر ملک کو نئی اونچائیوں پر لے جانے میں اپنا حصہ ادا کر سکیں۔

(۳) انصاف کا قیام

تکثیری سماج میں جہاں ایک ملک اور سماج میں بہت سی چھوٹی بڑی اقلیتیں رہتی ہیں وہاں ان کے درمیان نزاع کا برپا ہونا ایک فطری امر ہے۔ مگر ان کے درمیان اگر کوئی معاملہ ہوتا ہے اور جو صاحب اختیار ہیں وہ بے لاگ اور مبنی برحق فیصلہ کرتے ہیں تو اس سے سسٹم پر لوگوں کا اعتماد بڑھتا ہے اور سماج میں امن اور نظم قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر جب حکومت یا عدالت فیصلہ کریں مگر انصاف نہ کریں تو اس سے ظلم و ناانصافی بڑھے گی اور کمزوروں کا سسٹم پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ عدالت کو بابا بھارتی کا گھوڑا نہیں بننا چاہئے جس کو ایک ڈاکو نے اپاہج بن کر دھوکے سے جھپٹ لیا تھا۔ اس پر بابا بھارتی نے ڈاکو سے یہ کہا تھا کہ دنیا کو یہ نہیں بتانا کہ تم نے گھوڑا مجھ سے کس چھل سے حاصل کیا ورنہ لوگوں کا اپاہجوں پر سے یقین اٹھ جائے گا پھر کوئی کسی اپاہج کی مدد نہیں کرے گا۔ سسٹم پر سے اگر لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا تو ہم مہذب سماج کے بجائے دور وحشت میں لوٹ جائیں گے جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ حکومت، عدالت اور قانون کا اخلاقی اور قانونی جواز یہ ہے کہ وہ کمزوروں کا والی اور محافظ ہوتا ہے جو اپنے مفادات یا حقوق کی دفاع خود نہیں کر سکتے وہی حکومت یا عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں ورنہ جو طاقت ور ہوتے ہیں وہ اپنے طاقت کے بل پر اپنے حق سے زیادہ لیتے ہیں اور بسا اوقات سسٹم کو مینی پولیٹ کر کے اس کو اپنے حق میں سازگار بنا لیتے ہیں۔

ظلم کسی سماج کی صورت بگاڑ دیتا ہے۔ دنیا کے ہر سماج میں کچھ لوگ طاقت ور اور صاحب وسائل ہوتے ہیں اور کچھ لوگ کمزور اور بے وسائل ہوتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا تو سماج ظلم سے بھر جائے گا۔

بھارت جیسے ملک میں جہاں متعدد مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ

لوگ تعداد، دولت، قوت اور بھر پور وسائل رکھتے ہیں جب کہ بہت سی اقلیتیں جو تعداد میں کم ہیں غریب اور پسماندہ ہیں ان کے پاس وسائل کا فقدان ہے اور ان کے پاس اسٹیٹ پاور بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جب ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا تو وہ انتہائی نفسیاتی دباؤ میں غلط طریقہ اپناتے ہوئے خودکشی، کر سکتے ہیں۔ جرائم پیشہ اختیار کر سکتے ہیں یا پھر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر مہذب سماج کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماجی امن کے لئے ضروری ہے کہ انصاف قائم کیا جائے۔ اور Justice & fairplay کے راستے پر قائم رہا جائے اور اس معاملے میں اپنے اور پرائے میں کوئی تمیز نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

> ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار بنو اور صرف خدا واسطے کے گواہ بنو چاہے یہ گواہی تمہیں اپنی ذات یا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب اللہ ان کی خبر گیری کے لئے کافی ہے۔ اپنی خواہش نفس کی پیروی میں انصاف سے روگردانی نہ کرو۔ اگر تم نے اس میں تبدیلی کی یا منہ پھیرا تو اللہ کو اس کی خبر ہے کہ جو تم کرتے ہو۔ (۱۳۵:۴)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ۔

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا واسطے گواہ بنو اور انصاف پر قائم رہو۔ کسی قوم کی دشمن تم کو انصاف سے نہ روکے ہر حال میں انصاف کرو۔ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (۸:۶)

اوپر جن آیتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس میں پہلی آیت سماجی معاملات میں انصاف کے تقاضوں سے بحث کرتی ہے اور دوسری آیت میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جب معاملہ دو قوموں کے بیچ ہو اور اس میں اگر اس سے دشمنی بھی ہو اس وقت اگر کوئی معاملہ ان دونوں کے درمیان فیصلے کے لئے آئے ایسی صورت میں بھی جو انصاف ہے اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اب آپ دیکھئے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی معاملے میں عدالت عظمیٰ خود یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ جس جگہ پر بابری مسجد تھی اس جگہ پہلے کوئی مندر نہیں تھا۔ لہذا وہاں مندر توڑ کر مسجد نہیں بنائی گئی تھی۔ عدالت نے یہ

بھی مانا کہ مسجد کا انہدام ایک غیر قانونی اور مجرمانہ عمل تھا۔ ساتھ ہی عدالت نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مسجد میں مورتی چوری چھپے اور غلط طریقہ سے رکھی گئی تھی اور اس کو بھی عدالت نے مجرمانہ حرکت مانا اس کے باوجود عدالت نے مسجد کی زمین مندر بنانے کے لئے ان لوگوں کو دے دی جنھوں نے یہ مجرمانہ کاروائی کی تھی۔ ظاہری بات ہے کہ عدالت نے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کئے تاہم مسلمانوں نے دل پر جبر کر کے فرقہ وارانہ خیر سگالی اور سماجی امن کی خاطر عدالت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ لیکن یہ انصاف نہیں کھلی طرفداری تھی جس کے پیچھے قومی عصبیت جھلکتی ہے۔ ظاہر ہے۔ ایک تکثیری سماج میں ایسے فیصلوں سے سماجی اور فرقہ میل ملاپ میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس لئے جو لوگ بھی حکومت میں ہیں اور مسند انصاف پر فائز ہیں انکو اس کا خیال رکھنا ہوگا تبھی ایک پلورل سوسائٹی میں امن قائم ہوسکتا ہے اور وہ سوسائٹی ترقی کر سکتی ہے۔

(۴) ظلم کے خلاف متحدہ محاذ

ایک تو ہے انصاف کے تقاضے پورا کرنا اور دوسرا ہے ظلم کے خلاف متحدہ محاذ بنانا۔ جس کے ساتھ بھی ظلم ہو رہا ہے اور جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے یہ مہذب سماج کی ذمہ داری ہے کہ اس کے خلاف متحد اور منظّم ہو کر اٹھے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

> تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزوروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے ہو جو کہتے ہیں اے خدا ہمیں ایسی بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں اور ہمیں اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما۔ (النساء۔۷۵)

لہذا انصاف کا قیام اور ظلم کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک مضبوط سول سوسائٹی ہو جو اس طرح کے معاملات اور مسائل کی نوٹس لے اور ان کے تدارک کے لئے عملی طریقہ اختیار کرے۔ ورنہ کسی بھی ایسے سماج میں جہاں اقلیتیں اور کمزور طبقات کے لوگ رہتے ہیں نہ تو ان کو انصاف ملے گا اور نہ ان کی ظلم و زیادتی سے حفاظت ہوگی۔ لہذا یہ بھی سماجی امن اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کے لئے ضروری ہے جس پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے اس کو ظلم کے

ازالہ اور انصاف اور امن کی بحالی کے لئے ضروری قدم قرار دیا ہے۔تکثیری سماج میں اس کی جو اہمیت ہے اس سے ہر شخص کو اتفاق ہوگا۔

(۵) تمام مذہبی شخصیتوں کا احترام

تکثیری سماج میں جہاں ایک سے زائد مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور ہر مذہیب کی کچھ متعقدات ہیں اور ان کی قابل احترام شخصیات ہیں۔ہم ان کو چاہے مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں دین وتہذیب کا تقاضہ ہے کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان شخصیات کا نام عزت سے لیا جائے اور ان کی شان میں گستاخی نہ کی جائے۔آج کل لوگ آزادئ رائے کے نام پر ان نزاکتوں کا خیال نہیں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بسا اوقات نقض امن کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اظہار رائے کے حدود کیا ہیں اور ایک جمہوری اور آزاد ملک میں جہاں سیاسی آزادی حاصل ہے اور سیاست دانوں پر تنقید تبصرہ ہوتا رہتا ہے۔ مذہبی شخصیتون بالخصوص ایسی شخصیتیں جن کو لوگ محترم جانتے ہیں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں ان کے سلسلے میں زبان کھولتے وقت لوگوں کے احساسات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔بھونڈے پن سے معاملات بگڑ سکتے ہیں۔خاص طور سے اگر آپ مسلمان ہیں تو دیگر مذاہب کی جو مذہبی شخصیتیں ہیں ان کے بارے میں محتاط لب ولہجہ اختیار کرنا چاہئے اسی طرح آپ ہندو ہیں تو ان کو بھی مسلمانوں کے مذہبی شخصیات کے بارے میں شریفانہ طرز کلام اختیار کرنا چاہئے۔آزادی کا مطلب بے لگام آزادی نہیں ہے۔جیسے کہا جاتا ہے کہ آپ کو چھڑی گھمانے کا حق ہے مگر اس حد سے باہر جہاں پر ہماری ناک شروع ہوتی ہے۔اگر آپ کو چھڑی گھمانے کی آزادی سے ہماری ناک زخمی ہوسکتی ہے تو اس حد پر آپ کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔اس لئے اظہار خیال کا حق ہے، اختلاف رائے کا بھی حق ہے، مگر ہذیان گوئی اور گالی دینے یا برا بھلا کہنے کا حق نہیں ہے۔اس سے دوسرے کی عزت شرافت پر بٹا لگتا ہے۔لہذا آپ اپنی آزادی کے گمان میں دوسروں کی دل آزاری نہیں کرسکتے ہیں۔ان باتون کا لحاظ ہر وقت اور ہر حال میں کرنا ہے۔ بالخصوص مذہبی شخصیات اور متعقدات کے بارے میں ورنہ یہ فری فار آل گیم ہوجائے گا جس سے سماج میں بدتہذیبی پھیلے گی جو

فرقہ وارانہ امن کے لئے بہت خطرناک ہوگا۔اس لئے قرآن نے اپنے ماننے والوں کو ھدایت کی ہے۔

یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔اس طرح ہم نے ہر گروہ کو اس کا عمل خوشنما بنا دیا ہے۔پھر انہیں اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے، وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے تھے۔(انعام۔۱۰۵)

قرآن پاک کے اس حکم کی تائید حضورؐ کے اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ کوئی اپنے باپ کو گالی نہ دے۔صحابہ نے تعجب سے پوچھا کہ آیا کوئی ایسا بھی ہے جو اپنے باپ کو گالی دیتا ہے۔آپ نے فرمایا ہاں اگر تم کسی دوسرے کے باپ کو گالی دوگے تو وہ جو پلٹ کر تمہارے باپ کو گالی دے گا۔اس طرح تمہارا عمل اپنے باپ کو گالی دینے جیسا ہے۔آپ ان ھدایات سے سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام انسانی حسیات کا کتنا خیال رکھتا ہے اور اپنے ماننے والوں کی کیسی ذہنی اور عملی تربیت کرتا ہے۔

اس وقت ہمارے سماج میں جو انتشار اور فساد ہے اس میں بڑا حصہ زبان کی بے احتیاطی کا ہے لہذا ہمیں مہذب اور محتاط رویہ اپنانا چاہئے۔ بلکہ دوسرے اگر ان حدود کی پابندی نہیں بھی کرتے ہیں تب بھی ہمیں اپنے زبان اور جذبات کو قابو میں رکھنا چاہئے۔یہ ہماری کمزوری نہیں بلکہ اعلیٰ ظرفی ہوگی۔ایسی صورت میں اپنے غصہ کو قابو میں رکھنا اور اپنے ہاتھ روکے رکھنا دانش مندی ہے۔لہذا ایک مشترک سماج میں فرقہ وارانہ امن وخیر سگالی کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے۔

(٦) تمام مذہبی مقامات کی حفاظت

جس سماج میں ایک سے زائد مذاہب ہیں وہاں ہر مذہب کی عبادت گاہیں بھی ہوں گی جس سے لوگوں کو محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔آپ چاہے جس مذہب کے ماننے والے ہوں۔ آپ کی نظر میں آپ کی عبادت گاہ ایک متبرک جگہ ہے،اسی طرح جو آدمی کسی اور مذہب کا ماننے والا ہے اس کی نظر میں اس کی عبادت گاہ قابل احترام ہے۔لہذا ہر مذہب کی عبادت گاہ کا تحفظ اور

ہرمذہب والے کو اپنے مذہبی معتقدات کے لحاظ سے عبادت کرنے کا حق ایک لازمی بنیادی حق ہے۔مگر اکثر لوگ اس کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں اور جب کوئی ہنگامہ اور فساد ہوتا ہے اس وقت ایک دوسرے کے مذہبی عبادت گاہوں کی بے حرمتی ، اس کو جلانے اور توڑنے کی کوشش ہوتی ہے ۔وہاں رکھے صحیفوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔اس طرح کی حرکتوں کا درد کبھی کبھی قتل وخون اور جان ومال کی تباہی سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ چیز رشتوں کو دائمی طور پر خراب کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

ماضی بعید میں جب بادشاہوں کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں اور بالخصوص جب ایک بادشاہ ایک مذہب کا ماننے والا ہوتا تھا اور دوسرا دوسرے مذہب کا ۔اس طرح جو بادشاہ جیتتا تھا وہ اپنے جیت کا جشن دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو توڑ کر یا اس کی ہیئت تبدیل کر کے اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کے طور پر کرتا تھا۔یہ کئی صدی پہلے کی بات ہے ۔اگر آج بھی ہم اس ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے اس کا مطلب ہے کہ ہم آج بھی عہد ماضی میں جی رہے ہیں۔

ہمیں ماضی کی اچھی روایتوں کو ضرور آگے بڑھانا چاہئیے مگر آج تاریخ کی غلطیوں کو صحیح کرنے کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں گے تو ملک کو بدامنی اور فساد کی آگ میں ڈھکیل دیں گے جس کی آگ صرف انہیں کو نہیں جلائے گی جن کو آگ لگائی جارہی ہے بلکہ اس سے جو شعلہ اٹھے گا وہ پورے سماج اور ملک کو جلا کر خاک کردے گا۔لہذا ہم ایسی خطرناک حماقتوں سے جتنی جلدی باہر آجائیں ملک وقوم کی بہتری کے لئے اتنا ہی اچھا ہے۔قرآن نے تمام مذاہب کی عبادت گاہیں جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے اس کی حفاظت کی تلقین کی ہے۔ بلکہ اسلامی جہاد جس کو آج کل بہت بدنام کیا جاتا ہے اس کا ایک مقصد تمام مذاہب کی عبادت خانوں کی حفاظت بھی ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

> اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومعہ اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن مین اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔مسمار کردئے جاتے۔(الحج)

اس آیت میں آپ دیکھیں یہودی عبادت خانے ،عیسائی عبادت خانے ،اور معبد جہاں بت ہوتے ہیں یعنی ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے عبادت خانے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسجد جہاں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سب کی حفاظت کی بات کی گئی ہے۔

ایک تکثیری اور مشترک سماج میں یہ فرقہ وارانہ امن اور خیر سگالی کی لازمی شرط ہے۔ لہٰذا ہر مذہب والے کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسرے مذہب والوں کی عبادت گاہ کی بے حرمتی نہ ہو اور نہ اس کو کوئی نقصان پہنچایا جائے۔ اگر ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرلیں اور اس کے مطابق اپنے طرز عمل کو بہتر بنالیں تو ہمارے سماج میں جو فساد ہوتا ہے۔ اس میں پچاس فیصد کی کمی آجائے گی۔

بھارت میں اب تک جو فساد ہوئے ہیں ان میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد میں سور کا گوشت پھینک دیا گیا یا مندر میں گائے کا گوشت یا اس کا کوئی حصہ ڈال دیا گیا۔ مذہبی جلوس نکلا اور ٹھیک مسجد کے سامنے جمع ہو کر زور زور سے گانے بجانے لگے یا اشتعال انگیز نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ یا کسی مذہبی جلوس پر کسی نے پتھر پھینک دیا یا پھر مسجد کے مینار پر چڑھ کر بھگوا جھنڈا لہرا دیا یا پھر مسجد کو توڑنے اور جلانے کی کوشش کی گئی یا اس کی بے حرمتی کی گئی۔

ٹھیک ہے جب فساد ہوتا ہے اور فسادیوں کی جذباتی بھیڑ ہوتی ہے جو جہاں لوگوں کو مار کاٹ رہے ہیں اس میں اگر انہوں نے عبادت خانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اس صورت میں لاء اینڈ آرڈر ایجنسی کا رول کیا ہونا چاہئے اور اس کو کیسا طرز عمل اپنانا چاہئے۔ افسوس کی بات ہے کہ بسا اوقات ہماری پولس اور لاء اینڈ آڈر کی ایجنسیاں بعض سیاسی وجوہات سے محافظ کے بجائے فسادی بن جاتی ہیں اور اپنی ذمہ داریاں ٹھیک ڈھنگ سے انجام نہیں دیتیں۔ یہ وہ اپنی ذہنیت کی وجہ سے کرتی ہیں یا اوپر سے کوئی حکم اور ھدایت ہوتی ہے یہ تو تحقیق کا موضوع ہے۔ ممکن ہے دونوں طرح کے عوامل کارفرما ہوں تاہم یہ طرز عمل ممکن ہے جو لوگ فرقہ پرستی کے مرض مین مبتلا ہیں ان کو ٹھیک لگتا ہو، مگر ملک اور سماج کے نقطۂ نظر سے یہ بہت ہی مہلک طرز عمل ہے جس سے نہ صرف ملک کی بدنامی ہوگی بلکہ ملک کی ترقی کی رفتار دھیمی ہوگی جس کا خمیازہ پورے ملک کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے فرقہ وارانہ امن اور خیر سگالی کے لئے ہمیں تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کو یقینی بنانا ہوگا۔ ایک مشترک تکثیری، جمہوری، جدید سماج میں اس کی بڑی اہمیت ہے جس کا ایماندارانہ نفاذ ہونا چاہئے۔

(۵) نیکی میں تعاون برائی میں عدم تعاون

اسلام ہم اور ہماری قوم غلط یا صحیح کو ایک جاہلی نعرہ مانتا ہے۔ہم اقدار پر مبنی سماج ہیں۔ لہذا جو صحیح ہے اس میں ہم ساتھ ساتھ ہیں لیکن جو غلط ہے اس میں ہمارا ساتھ نہیں ہے۔ ہمارے سماج میں اور دنیا کے بیشتر سماج میں لوگ غلط اور صحیح نہیں دیکھتے بلکہ آنکھ بند کر کے اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔اسی کو عصبیت اور فرقہ پرستی کہتے ہیں۔ایک سماج میں جہاں بہت سے مذاہب اور رنگ ونسل ،زبان اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں لوگ اقدار سے عاری ہو کر اور صحیح غلط کی تمیز سے آزاد ہو کر اگر ہر ایک دوسرے کی اندھی حمایت یا مخالفت کریں گے تو سماج میں کبھی امن اور خیر سگالی قائم نہیں رہ سکتی ہے بلکہ ہمیشہ فساد اور بدامنی کی فضا بنی رہے گی۔اس لئے قرآن سماجی امن کے لئے ایک بنیادی اصول دیتا ہے اور وہ ہے قرآن کے الفاظ میں۔

اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔نہیں جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔اللہ سے ڈرو،اس کی سزا بہت سخت ہے۔(۵:۲)

آپ اس آیت کو غور سے پڑھیں۔اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مکہ والوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام یعنی کعبہ میں آنے سے روک دیا تھا اور ان کا راستہ بند کر دیا تھا۔مسلمانوں کا اس پر مشتعل ہونا فطری تھا لہذا مسلمانوں نے جو دوسرے لوگ مکہ جارہے تھے ان کا راستہ روکنا چاہا اور ان کا سامان چھیننا چاہا۔مگر اللہ نے وحی نازل کر ان کو اس طرح کی حرکتوں سے باز رہنے کا حکم دیا اور مستقل ایک اصول بنا دیا کہ کسی قوم کی زیادتی کا جواب زیادتی نہیں ہے اور ایسے کسی عمل میں حصہ داری نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ تعاون ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے کام میں ہوگا جو ظلم اور گناہ کے کام ہیں اس میں کسی کے ساتھ کوئی تعاون نہیں ہوگا۔اللہ نے صاف صاف کہا کہ اللہ سے ڈرو کیونکہ اس کی سزا بہت سخت ہے کوئی آدمی یہ حرکت کر کے اگر دنیا میں بچ بھی جائے تو خدا کی عدالت میں نہیں بچ سکتا ہے اس لئے اگر وہ صاحب ایمان ہے تو ایسی جسارت نہیں کر سکتا ہے۔

یہ حکم خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کر کے دیا گیا ہے مگر اس میں جو اصول عام بیان کیا گیا ہے وہ دائمی اور عالمی ہے جس کا اطلاق کسی ملک، سماج اور مقام پر ہوسکتا ہے۔ یہ اصول یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں کسی سے بھی تعاون کیا جاسکتا ہے بلکہ کرنا چاہئے مگر ظلم اور گناہ کے کام میں کسی کی مدد نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم اس اصول کو اپنالیں تو ہمارے سماج میں جو ظلم و گناہ ہوتا ہے اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا اور سماج میں جو خیر اور بھلائی کی طاقتیں ہیں وہ مضبوط ہوں گی۔ اس اصول عام کو اپنانے سے جو کمزور لوگ ہیں یا جن کی تعداد کم ہے ایک تو ان پر ظلم نہیں ہوگا اور دوسرے ایک ساتھ کئی ہاتھ اس کی مدد کے لئے اٹھیں گے جس سے واقعی اس کا مسئلہ حل ہوگا۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ نے پوچھا مظلوم ہونے کی صورت میں تو مدد سمجھ میں آتی ہے ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا ظلم سے اس کا ہاتھ روک لو۔ اس کا مطلب ہے کہ سماج میں اگر کوئی ظلم اور گناہ ہو رہا ہے تو سماج میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو سماج کے مورل فورس بن کر ابھریں اور ایسے لوگوں کو ظلم سے باز رکھیں ورنہ کمزوروں کے لئے سماج میں جینا مشکل ہو جائے گا۔

ایک ایسے تکثیری اور مشترک سماج میں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور ان میں کسی کی تعداد کم اور کسی کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر ایسی صورت میں کوئی گروہ محض اپنی طاقت یا عددی برتری کی وجہ سے کسی دوسرے گروہ پر جو طاقت میں کمزور ہے اور جس کی عددی تعداد بھی کم ہے اس پر جبراً اور ظلماً کوئی چیز تھوپنے کی کوشش کرے اس وقت سول سوسائٹی کے لوگوں کو اس کے خلاف کھڑا ہونے کی ضرورت ہے بصورت دیگر وہ سماج ظلم اور فساد سے بھر جائے گا جو اس کے امن و نظم کو غارت کرسکتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا جو شخص کسی ظالم کا ساتھ دے کر اسے قوت پہنچائے دراں حالیکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلامیت سے خارج ہوگیا۔ (مشکوۃ) اس طرح یہ حدیث خاص طور پر مسلمانوں کو یہ ھدایت دیتی ہے کہ وہ اگر جانتے ہیں کہ ان کے درمیان کا کوئی فرد یا گروہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کر رہا ہے اور اس کے باوجود بھی وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں تو گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ وہ مسلمان رہتے ایسی حرکت نہیں کرسکتا ہے۔ حدیث

میں ایک مسلم اور مومن کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے سب محفوظ رہیں۔ یعنی نہ تو وہ کسی کو اپنے ہاتھ سے ناروا تکلیف دے اور نہ اپنی زبان سے کسی کو تکلیف دہ بات کہے۔

اس طرح ایک مشترک سماج میں مل جل کر نیک اور اچھے کام میں مدد اور مل جل کر برے کاموں سے ایک دوسرے کو روکنے کی کوشش سماج کو بہت ساری بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھے گا۔ حکومت، انتظامیہ، پولس اور عدالت سب تبھی کارگر طریقے سے کام کریں گے جب ایک بیدار اور حساس رائے عامہ ملک کے بنیادی اخلاق اور اجتماعی ضمیر کی ہر وقت نگرانی کرتا رہے گا اور اس کو اپنے حدود اور خطوط پر قائم رہنے کے لئے آمادہ اور مجبور کرے گا۔

(۶) نقاط اتحاد کی تلاش

اس کے باوجود یکہ ہر مذہب اور ہر کلچر اپنے عقائد، طریق عبادات اور سماجی اور عائلی معاملات میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اس کے باوجود ایسے بہت سے معاملات ہیں جس میں یکسانیت ہوسکتی ہے اور جن کی بنیاد پر باہمی اتفاق واتحاد ہوسکتا ہے تمام انسان چاہے وہ جس مذہب کے ماننے والے ہوں یا جس سماج اور قوم کے فرد ہوں ایک انسان ہونے کے ناطے نہ صرف ان کی اناٹومی اور فیزولوجی ایک جیسی ہوتی ہے بلکہ ان کی ضرورت واحتیاج بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ خوشی اور غم کے اظہار کا طریقہ بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ سکھ دکھ کا احساس بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سے معاملات ہیں جس میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جاسکتی ہے۔

مذاہب کا ایک حصہ اعتقادات سے متعلق ہوتا ہے اور دوسرا حصہ عبادات سے متعلق ہوتا ہے اور ایک اہم حصہ اخلاقیات سے متعلق ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مذاہب میں اچھے اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اس معاملے میں مذاہب کی تعلیمات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ یہ بات جزوی طور پر صحیح ہے۔ لہذا ایسے سماج میں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اگر ہم ایک دوسرے کے درمیان جو اختلافی امور ومعاملات ہیں اس پر زور دیں گے تو اس سے ان کے درمیان دوری بڑھے گی اور یہ اختلاف تصادم کی شکل اختیار کرسکتا ہے بلکہ آج کل جیسا ماحول دیکھنے کو مل رہا ہے لوگ زبردستی ہر چھوٹی بڑی بات پر اختلاف کو ہوا دیتے ہیں اور سماج میں

ٹکراؤ اور بکھراؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے پیچھے محض سیاسی مقصد ہوتا ہے اور سیاسی برتری حاصل کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے لوگوں کے جذبات کو غلط طریقے سے گرما کران کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح سماج کو مستقل انتشار کی آگ میں جھونکتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ طرز عمل سیاسی پارٹیوں کے نقطہ نظر سے مفید ہوسکتا ہے مگر سماج کے نقطہ نظر سے تباہ کن ہے۔ جس کے انجام بد سے اس وقت پورا ہندوستان تباہی کے اندھے کنویں پر کھڑا ہے۔

ایسی صورت میں ان کے عقیدے میں تضاد واضح ہے جو مختلف حیلے بہانے اور دلائل سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ یہ اپنے آپ میں ایک لچر دلیل ہے۔ لہذا مسلمان شرک کے حق میں ان کے ان دلائل یا جواز کو صحیح نہیں مانتے ہیں اس لئے وہ ان تمام قوموں سے کہتے ہیں کہ ہم تم پر اپنا عقیدہ زبردستی نہیں تھوپیں گے۔ تم اپنے عقیدے پر قائم رہنا چاہتے ہو تو رہو مگر ہم توحید کے پابند ہیں یہ ایک واضح بات ہے۔

نظریہ توحید مذاہب کے درمیان اتحاد کی ایک جامع بنیاد بن سکتی ہے بشرطیکہ کہ لوگ اس کو تسلیم کریں اور اپنے عقیدے کو تحلیل نہ کریں۔ ظاہر ہے عیسائی اور یہودی اہل کتاب ہونے کے باوجود توحید کے عقیدے سے منحرف ہیں پھر بھی اسلام نے ان کو ان معاملات میں جن پر ان دونوں کے نظریات ایک جیسے ہیں اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور یہ دعوت عام ہے جس میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل ہوسکتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام مذاہب کی مشترک باتوں کو ملا کر ایک نیا مذہب بنالیا جائے جیسا اکبر نے دین الٰہی کے نام پر کیا تھا اور جیسا بہت سے اصلاح پسند لوگ پیوند کاری کر کے ایک ایسا جامہ تیار کرتے ہیں جو کسی جسم پر فٹ نہیں آتا۔ ماضی میں ایسی بہت سی کوششیں ہوتی رہی مگر لوگوں نے ان کو قبول نہیں کیا ہے اور وہ وقتی چمک دکھا کر آتش بازی کی طرح ابھری اور بجھ گئیں۔ ہم جس بات کی وکالت کر رہے ہیں وہ مذاہب کا ملغوبہ بنانا نہیں ہے بلکہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب کی جو اچھی تعلیمات ہیں جو عام انسانوں کے لئے بھلائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس کو اپنے لوگوں میں عام کریں اور اس کی بنیاد پر سماج میں ایک سمجھ پیدا کریں کہ خیر اور بھلائی کے کام میں ایک

دوسرے کی مدد کریں اورظلم اور گناہ کے کام میں کسی کی مدد نہ کی جائے۔اب خیر کیا ہے، بھلائی کیا ہے،ظلم کیا ہے، گناہ کیا ہے یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے۔ ہر وہ کام جو کسی انسان کو فائدہ پہنچاتا ہے،اس کے دکھ درد کو کم کرتا ہے خیر اور بھلائی ہے اور وہ کام جس سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہے، کسی کی عزت اور مال پر ناجائز حملہ ہوتا ہے وہ ظلم اور گناہ ہے۔ ہر سماج اپنے اپنے دائرے میں بھی اور مختلف سماج اور برادریوں کے ساتھ مل کر بھی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔اگر یہ ممکن نہیں ہو تب بھی وہ جو بھی بھلائی کا کام کرتے ہیں وہ کسی کا دھرم پوچھ کر اور کسی کی ذات پوچھ کر نہ کریں بلکہ جو کوئی بھوکا ہے، بیمار ہے، مجبور ہے، مظلوم ہے اس کی مدد کے لئے آگے بڑھیں۔تو نہ صرف یہ کہ اس سے مانوتا کی سیوا ہوگی بلکہ سماج میں جو دوری ہے، غلط فہمی، فرقہ واریت نفرت اور عصبیت ہے اس کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔

قرآن وحدیث اور سیرت وسنت کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو بے شمار رہنمائی اورھدایت مل سکتی ہے جو انسانیت عامہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوسکتی ہے۔تاہم ہم نے ایک مشترک اور ساجھا سماج میں فرقہ وارانہ امن وانصاف کی بحالی اور اتحاد وتعمیر کے جو اصول پیش کئے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

غیر مسلم سماج کو ہماری ضرورت ہے یا نہیں یہ میں نہیں جانتا۔ غیر مسلم سماج میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو بین المذاہب مشترکہ حکمت عملی کے قائل ہیں اس کی بھی کوئی واضح جانکاری مجھے نہیں ہے۔مگر میرا خیال ہے کہ ہر سماج میں اچھے لوگ موجود ہیں جن کو تلاش کرنے کی ذمہ داری ہماری ہے۔کوئی اپنا فرض پورا کرے نہ کرے ہم کو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔لوگ ہم سے کٹ کر رہ سکتے ہیں ہم لوگوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔اس لئے نہیں کہ ہماری ضرورت ان کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ہمارا فرض منصبی ہے ہم قرآن کی زبان مین بات کریں تو لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔اب ہم اس انتظار میں تو نہیں رہ سکتے کہ جب لوگ ہمارے در پر بھلائی طلب کرنے کے لئے آئینگے تب ہم ان کی بھلائی کریں گے نہیں بلکہ ہمیں تلاش کر کے لوگوں کے پاس پہنچنا ہے اور اس کے ساتھ بھلائی کرنی ہے۔ بھلائی کا یہ ناقص تصور ہے کہ جو ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا ہم اس کے ساتھ بھلائی کریں گے یہ تو بدلہ ہوگیا۔ بھلائی یہ ہے کہ جو ہمارے ساتھ بھلائی

نہ بھی کرے ہم اس کے ساتھ بھلائی کریں اس کو قرآن کی زبان میں احسان کہا گیا ہے اور یہ انسانیت اور روحانیت کی اعلیٰ منزل ہے۔

غرض یہ کہ وہ فہم وفکر اور نظریہ اخلاق ویگانگت ہے جس پر حضور کی سیرت وسنت دلالت کرتی ہے لہذا ایک مشترک سماج میں مسلمانوں کو ایسی وسعت نظری، ہمہ گیری اور اعلیٰ اخلاقی رویہ کے ساتھ سماج میں ابھر کر سامنے آنا چاہئے اور اپنے حسن فکر حسن اخلاق اور حسن کردار سے پورے سماج کو خیر وصلاح کی دعوت دینی چاہئے۔

(۷) سماج میں گفتگو کے آداب

میں نے آپ کے سامنے تفصیلی طور پر ایک مشترک سماج میں اسلام کے موقف اور قرآن وحدیث کی روشنی میں سیرت وسنت کے متعدد حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا ہے اور مسلمانوں کو ترغیب دلائی ہے کہ اس فکر وکردار کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سماج میں اپنا مثبت کردار پیش کریں۔لیکن اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے اسلام ایک مشترکہ سماج میں جس ترسیل نظم کی تعلیم دیتا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالتے چلنا ضروری ہے۔اس لئے کہ اس وقت ہمارے سماج میں جو ٹکراؤ اور تصادم ہے اس میں ایک بڑا ہاتھ زبان کی بے احتیاطی کا ہے چونکہ ہمارے سماج میں باہمی گفتگو کے لئے کیا طریقہ اپنایا جانا چاہئے اس کی تربیت کا کوئی نظم نہیں کیا گیا ہے اس وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس پر ہی پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے اس لئے ہمیں اپنی فکر، سیرت واخلاق کے ساتھ ساتھ زبان وبیان پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔کیا بولنا ہے کس سے بولنا ہے۔کہاں بولنا ہے کتنا بولنا ہے اور کیسے بولنا ہے جب تک یہ نہیں جانے اور سیکھیں گے ہم ہمیشہ غلط جگہ پر غلط بات بول کر اپنا وزن بھی کھوئیں گے اور سماج میں فتنہ اور فساد کی وجہ بنیں گے۔اس لئے عوامی گفتگو کے آداب سیکھنا خاص طور پر ایک مشترک سماج میں اور اس سماج میں جہاں معاند عناصر ہر وقت گھات لگائے بیٹھے ہیں اور ہر وقت فتنہ کھڑا کرنے کی تاک میں رہتے ہیں ضروری ہے ۔محتاط ہونے کا مطلب ڈرنا نہیں ہے۔محتاط ہونے کا مطلب غلط اور غیر ذمہ دارانہ طرز گفتگو سے بچنا ہے۔میں قرآن وسنت

کی روشنی میں پبلک ڈس کورس کے جوآداب ہیں ان کونکات وار پیش کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ ہم اس کی روشنی میں اپنے طرز فکر اور طرز گفتگو کی اصلاح کر کے لوگوں سے بات چیت کریں۔ دنیا میں جو فتنہ فساد اور باہمی جنگ وجدال ہوتا ہے اور اکثر دوقومیں اور دوافراد ایک دوسرے سے لڑ جاتے ہیں ان میں ایک زبان کی بے احتیاطی ہے اور دوسرا جنسی بے راہ روی اللہ کے رسول نے فرمایا ''اگر کوئی شخص اپنی زبان اور شرم گاہ کی ضمانت دے تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لے لوں گا۔(بخاری۔سہل ابن سعد)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زبان کے استعمال کی کیا اہمیت ہے ہم لوگ اپنی نجی زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملتے ہیں اور ہر طرح کے موضوعات پر بات کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان تجارتی گفتگو ہوتی ہے۔علمی گفتگو ہوگی۔سیاسی گفتگو ہوتی ہے۔تفریحی گفتگو ہوتی ہے اور ہم لوگ مذہبی معاملات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ہر طرح کی گفتگو کے آداب اور طریقے مختلف ہیں۔ ان تمام موضوعات میں مذہبی گفتگو کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ جب دوہم مذہب اور ہم عقیدہ لوگوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے تو اس کا انداز بالکل دوسرا ہوتا ہے جبکہ اگر گفتگو دوالگ الگ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ہوتو اس کا انداز بالکل دوسرا ہوگا۔ ہم مذہب لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو چونکہ ان کا عقیدہ ایک جیسا ہوتا ہے اس لئے اس کا ریفرنس پوائنٹ ان کے مسلمہ عقائد ہوتے ہیں لیکن جب دومختلف مذاہب کے درمیان گفتگو ہوگی تو چونکہ دونوں کا عقیدہ ایک دوسرے اسے الگ ہوتا ہے اس لئے ان کی گفتگو کا انداز الگ ہوگا ۔ لہذا قرآن اپنے ماننے والوں کو Inter community Discussion&Dialogue. کے کچھ آداب سکھاتا ہے جس کا ایک مشترک سماج میں برتنا بہت ضروری ہے۔ میں اس بحث کے اختتام پر اختصار کے ساتھ نکات وار ان اصول وآداب کا ذکر کروں گا۔

(۱) دعوت حکمت کے ساتھ: قرآن پاک نے اپنے نبیؐ کو اور حضورؐ کے توسط سے پوری امت کو دعوت کا جو طریقہ سکھایا ہے سورہ النحل کی آیت ۲۵ میں اس کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

''اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو''(۱۶:۱۲۵)

اس آیت میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔

(۱) حکمت ہے جس کا انگریزی متبادل Wisdom ہے۔

(۲) موعظت ہے جس کا مناسب انگریزی متبادل تو نہیں تاہم اس کو Kindly exhorstion - beautiful preaelius کہا جاسکتا ہے۔

(۳) جدال احسن ہے جس کا ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے kindly exhortation, beautiful preaching and argue with in the ways that are best کیا ہے اور Marmaduke Pickthal نے Reason with them in the most courteous manner ہے۔

یہ ھدایتیں ہم کو باہمی گفتگو کی ڈسپلین اور آداب سکھاتی ہیں اور کیسے ایک شریفانہ ماحول میں ایک موثر اور دل پذیر گفتگو کی جاسکتی ہے اس کے بنیای نکات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

حکمت کا مطلب ہے بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ موقع محل کو دیکھتے ہوئے دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر بات کی جائے اور اپنے دلائل کو اس طرح پیش کیا جائے کہ مخاطب کے دل و دماغ کو اپیل کرے۔

عمدہ نصیحت کا مطلب صرف دلائل سے مطمئن کرنے کے بجائے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے انسان کی فطرت مین جو برائیوں اور گمراہیوں سے پیدائشی نفرت ہے اس کو ابھارا جائے اور ھدایت وعمل صالح کی طرف رغبت اور شوق پیدا کی جائے۔ نصیحت کا سب سے اہم عنصر دلسوزی اور خیر خواہی ہے۔ مخاطب کو اگر یہ محسوس ہوگا کہ یہ آدمی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ہماری بھلائی کے لئے ہے اور یہ شخص اس نصح وخیر خواہی میں مخلص ہے تو پھر وہ آپ کی بات سننے اور ماننے کے لئے آمادہ ہوگا۔

اسی طرح جب ہم کسی سے بحث کریں تو اس کی نوعیت مناظرہ، عقلی کشتی، ذہنی دنگل، کج بحثیاں، الزام تراشیاں، چوٹیں، پھبتیاں اور حریف کو بالمقابل چپ کر دینا نہیں ہے اور نہ اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجادینا ہے۔ ہم عدالت میں کھڑے وکیل کی طرح غلط کو صحیح ثابت کرنے کے لئے

بحث نہ کریں یا کسی ڈیبٹنگ سوسائٹی میں پوائنٹ اسکور کرنے کے لئے بحث نہ کریں بلکہ جدال احسن میں سب سے اہم چیز اخلاص ہے لہذا اس میں شیریں کلامی، اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق، معقول اور دل لگتے دلائل کے ساتھ اپنی بات رکھی جائے تا کہ مخاطب آپ کی بات سنجیدگی سے سنے اور کسی طرح کی کج بحثی پیدا نہ ہونے دی جائے۔

اس طرح ایک سنجیدہ اور شریفانہ ماحول میں نرمی اور اخلاص کے ساتھ اپنی بات لوگوں تک پہنچائی جائے۔

(۲) کسی کی قابل احترام شخصیت کو برا بھلا نہ کہا جائے

اس بات کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ایک مشترک سماج میں جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں۔ہر مذہب کی کچھ مقتدر شخصیات ہیں جن کا اس مذہب کے لوگ احترام کرتے ہیں اور جن سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔لہذا جب دو یا دو سے زائد مذہبی گروہوں کے درمیان بات چیت ہو تو اس بات چیت کے درمیان اس بات کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے بلکہ ان کے جو معبود ہیں ان کے لئے زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جو ان کے جذبات کو برانگیختہ کر دے اور پھر وہ بھی اپنی حدود کو پھلانگ کر آپ کے عقیدے پر چوٹ کرنے لگیں۔دراصل ہر شخص کو اس کے اعمال اچھے لگتے ہیں اور اس پر کوئی بھونڈا تبصرہ کر دیتا ہے تو ظاہر ہے اس کے جذبات کو نہ صرف ٹھیس لگتی ہے بلکہ وہ بھی حد اعتدال اور شرافت کے دائرے کو پار کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں فتنہ فساد اور جنگ وجدال کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔لہذا اس معاملے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

> جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو برا بھلا نہ کہو۔یہ لوگ نادانی میں خدا کو برا کہنے لگیں۔(انعام۔۱۳)

جب ہم پبلک ڈسکورس میں حصہ لیں تو ان امور کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

(۳) کج بحثی سے بچنا چاہئے

ہم لوگ سماج میں جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور باہم بات چیت ہوتی ہے

بالخصوص دو ایسے لوگوں کے درمیان جو دو الگ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اس وقت جب ان کے درمیان گفتگو ہوتی ہے تو اکثر نزاعی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے زور زور سے بات کرنے لگتے ہیں بلکہ اپنی آواز اونچی کر کے دوسرے کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو بلا وجہ اونچی آواز میں بات کرنا غیر شریفانہ انداز ہے جس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ دوسرے جب بات اپنی حد سے نکل کر کج بحثی کے دائرے میں چلی جائے اس وقت آگے بات جاری رکھنا فضول ہے کیونکہ اس صورت میں کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ لہذا بات کو اسی مقام پر ختم کر دیا جائے اور شریفانہ طور پر اس جگہ سے نکل جائے۔ اسلام نے مومن بندوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے ان کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ

اور جب لوگ جہل و کٹ حجتی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے منہ آنے کے بجائے وہاں سے سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں (۲۵:۶۳)

اسی طرح سے لغو اور بیہودہ باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ دیکھئے ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارا کام لوگوں تک صحیح بات پہنچا دینا ہے۔ منوا دینا نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں بس اتنی کوشش کرنی چاہئے کہ بات معقول انداز میں صحیح تناظر اور صحیح دلائل کے ساتھ لوگوں تک پہنچ جائے۔ اگر ہم ان باتوں کا خیال رکھیں گے تو زبان کے فتنہ سے خود کو بھی اور سماج کو بھی محفوظ رکھیں گے۔

(۴) گفتگو میں نرمی اختیار کرنا

قرآن نے بالخصوص دو ایسے لوگوں کے درمیان جو الگ الگ عقیدہ رکھتے ہیں ان سے گفتگو کرتے وقت مسلمانوں کو تین ہدایت دی ہیں۔ پہلا ہے خذ العفو یعنی نرمی اور درگذر کا طریقہ اختیار کرنا۔ اگر فریق مخالف کی طرف سے کچھ ناروا بات بھی کی جا رہی ہے تو اس کے ساتھ نرمی اور درگذر کا طریقہ اپنایا جائے۔ دوسرا امر بالمعروف یعنی معروف کی تلقین یعنی اس وقت غصہ میں یا جوابا جوابی میں بے تکی اور غلط بات نہ کرے بلکہ جو صحیح اور سچی بات ہے بس وہ کہے اور تیسرا ہے واعرض عن الجہلین یعنی جاہلوں سے نہ الجھنا جاہل کا مطلب جو ضد اور ہٹ دھرمی اختیار کرے اور صرف بحث و تکرار کرنا چاہے ایسے لوگون سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے ان سے الجھنے کے

بجائے بات وہیں روک دے اور وہاں سے سلام کر کے رخصت ہو جائے۔

باتیں ہمیشہ معقول، مستند، مدلل اور شریفانہ ڈھنگ سے رکھنی چاہئے۔ پبلک ڈسکورس اور آرٹ آف ڈیبیٹ ایک آرٹ ہے جس کو سیکھنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو افکار کی دنیا(World of ideas)میں رہتے ہیں اور دنیا میں ترسیل کے لئے ان کے پاس کچھ پیغام ہے ان کے لئے ان چیزوں کو سیکھنا اور ان کو برتنا بہت ضروری ہے۔ یہ اپنے لئے بھی ضروری ہے اور دوسروں کے لئے بھی مفید ہے۔ ہمیں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہمارا مقصد communication ہے conversion نہیں۔ اس لئے پبلک ڈسکورس کے حدود کو سمجھتے ہوئے گفتگو کرنی چاہئے۔

حاصل کلام

میں نے ایک وسیع کینوس میں اس وقت جو عالمی اور ملکی صورت حال ہے اور ہندوستان کی مسلم ملت جن حالات سے دوچار ہے اس میں قرآن وسنت بالخصوص سیرت رسولؐ کا جو پیغام ہے اس کا ایک اطلاقی مطالعہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان حالات میں ہمارا طرز فکر اور طرز عمل کیا ہونا چاہئے اور ہمیں ان آزمائشی صورتحال کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہئے۔ قرآن سورال عمران آیت نمبر ۸۶ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

> مسلمانوں تمہیں جان اور مال دونوں کی آزمائش پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو گے تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔
>
> (۶۸:۳)

اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران کی آخری آیت میں جو حکم اور ھدایت دیا ہے اسے گرہ باندھ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا اور آخرت کی فلاح کی راہ اسی راستے سے ہو کر گذرتی ہے۔ قرآن کا فرمان ہے۔

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی

دکھاؤ حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے (۳:۲۰۰)

اس آیت میں چار باتیں بتائی گئی ہیں جو اس وقت ہمارے جد وجہد کا مرکزی نکتہ ہونا چاہئے۔

(۱) صبر
(۲) باطل کے مقابلے پامردی
(۳) حق کی خدمت کے لئے تیار رہنا
(۴) اللہ کا خوف

اگر ہمارے اندر یہ چار خوبیاں پیدا ہو جائیں اور ہم تنہا بھی ہوں تو کوئی رنج اور خوف کی بات نہیں ہے کیونکہ حضورؐ نے غار ثور میں جو پیغام دیا تھا **لاتحزن ان اللہ معنا** ۔گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے، ہم اس کا عملی مظاہرہ دیکھیں گے۔

ظاہر سی بات ہے کوئی جد وجہد شروع ہوتے ہی کامیاب نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اسے ایک جانکاہ عبوری دور سے گذرنا پڑتا ہے۔دنیا کی تمام تحریکات کا یہ خاصہ رہا ہے۔لہذا یہ ایک مستقل سنت ہے جس کی کوئی استثنا نہیں ہے ایک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے۔کامیابی بغیر آزمائش اور آزمائشی مرحلے کے ممکن نہیں ہے یہ اسباب وعلل کی دنیا ہے جہاں معجزات وکرامات سے لوگوں کی تقدیر نہیں بدلتی ہے۔یہاں استقامت اور سعی مسلسل سے ہی معجزات پیدا کئے جاتے ہیں حضورؐ کی سنت وسیرت اس امر پر دلالت کرتی ہے لہذا ہمیں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے نبی کے بتائے ہوئے طریقہ پر ہر طرح کی آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے اور ہر ہزیمت، شکست اور آزمائش پر پورے اخلاص کے ساتھ اپنے رب سے تعلق پیدا کرنا ہے کونکہ یہی ہمارا سرمایہ ہے۔

دنیا میں حق وباطل کی کش مکش ہمیشہ جاری رہی ہے اور آج بھی جاری ہے۔ہم ایک جہان کہنہ کو چھوڑ آئے ہیں اور جہان تازہ کے آنے میں ابھی دیر ہے۔اس درمیانی مدت کی جو آزمائش ہے ہمیں اس کو برداشت کرنا ہوگا۔

اٹلی کے مارکسٹ مفکر اور مصنف انٹونیز گرامسی(Antonio gramci) نے اٹلی کے نازی جیل سے ۱۹۲۹ میں لکھا تھا۔

The old world is dying and the new world struggles are yet to be born . Now is the time of monsters

''پرانی دنیا مر رہی ہے۔نئی دنیا جس کی جدو جہد کی جا رہی ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے ۔فی الوقت یہ وحشیوں کا دور ہے''

بہر حال ہم لوگ اس وقت دور وحشت میں ہیں ۔ یہ وقت کتنا لمبا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے ۔ مگر جیسے تمام وقت گذر جاتا ہے یہ وقت بھی گذر جائے گا۔کامیابی ان کے قدم چومے گی جو حالات کے سامنے پامردی سے کھڑے رہتے ہیں۔اور مبارک ساعت کا انتظار کرتے ہیں۔ہمیں بیجا خوف اور تو ہم سے بچنا چاہئے اور جھوٹے سہاروں کی تلاش میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے ۔خدا اور خود پر یقین رکھیں یہ ہماری نفسیاتی باز آبادکاری(Psychological Rehabilition) کی پہلی شرط ہے۔اعتماد کے ساتھ سفر شروع کیجئے مشکلیں خود بخود راستہ دیتی چلی جائیں گی۔ پانچویں صدی قبل مسیح ایک چینی فلسفی اور ماہر جنگ سن زو(Sun TZU) اپنی کتاب Art of war میں لکھا ہے۔

probihit the taking of omens , and do away with supertitious doubts . Then untill death itself comes no calamity need be feared.

فال نکالنا بند کر دیجئے ۔ وہم وتذبذب سے باہر آیئے ۔ پھر موت تک کوئی آفت نہیں آئے گی جس سے خوف کھانے کی ضرورت ہے۔

حیات وموت اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔لہذا اس کا فیصلہ زمین پر نہیں آسمان پر ہوتا ہے۔جب موت آجائے گی کوئی بچا نہیں سکتا ہے اور جب حیات باقی رہے گی کوئی مار نہیں سکتا ہے۔موت چاہے آدمی کے ہاتھ سے آئے یا کسی اور ذریعہ سے یہ فیصلہ آسمان پر ہوتا ہے۔ اور جب مرنے کے بعد اللہ ہی کے پاس جانا ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیسا۔جس دن ہمارے دل

سے موت ناگہانی کا خوف نکل جائے گا اور صحیح معنوں میں خدا کا خوف ہمارے دل میں جاگزیں ہوجائے گا سمجھ جایئے ہمارا سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

اس درمیان میں ہمیں ملت کے طبعی باز آبادکاری اور نفسیاتی باز آبادکاری پر دھیان دینا ہے اور وسیع تر انسانیت سے اخلاص کے ساتھ اچھے رشتہ استوار کرکے ان کی محبت اور خدمت میں جڑ جانا ہے اس سے بے پرواہ ہوکر کے وہ بدلے میں ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔

حضورؐ کی معرکتہ الآرا حدیث ہے جس کو ہم تمام مسلمانوں کو اپنا اجتماعی کردار بنانے کا جتن کرنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا۔

میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔

(۱) کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ سے ڈرتا رہوں۔
(۲) غصہ اور خوشی ہر دو حال میں انصاف ہی کی بات کہوں۔
(۳) فقر و غنا ہر دو حال میں راستی اور اعتدال پر قائم رہوں۔
(۴) جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
(۵) جو مجھے محروم کردے میں اسے دوں
(۶) جو مجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کردوں
(۷) میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو
(۸) اور میری گفتگو ذکر الٰہی ہو
(۹) اور میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔

اس طرح یہ ہمارا ملی آئیڈیل ہونا چاہئے جس کی روشنی میں عملی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

لہذا ہمیں کچھ چیزوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شامل کرنا ہوگا۔ ان کو اپنی عادت اور ضرورت بنانا ہوگا۔ اس کو اپنے سیرت و کردار میں ڈھالنا ہوگا۔ اپنے بچوں، نوجوانوں عورتوں، پسماندہ طبقات کو اچھا بنانے اور اوپر اٹھانے کا جامع منصوبہ بنانا ہوگا۔ جہالت کے خلاف جنگ چھیڑنی ہوگی اکثریت اور دیگر برادران وطن کے ساتھ اخلاص محبت اور خدمت کا رشتہ استوار

کرنا ہوگا۔اور ایک نئی پہچان کے ساتھ ہمیں آگے آنا ہوگا۔

اتحاد ہماری طاقت ہے۔مواخواۃ ہماری خصلت ہے،مساوات ہمارا طریقہ ہے۔علم ہمارا ہتھیار ہے خدمت ہماری فطرت ہے،تعاون ہماری عادت ہے۔محنت ہماری خصلت ہے۔اپنا حق حق سے لینا اور دوسروں کا حق حق سے دینا ہماری سیاست ہے۔مظلوموں کی حمایت ہمارا کردار ہے۔ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہماری پہچان ہے۔محبت ہمارا ایمان ہے۔دعوت ہمارا مقصد ہے اور نماز ہمارے آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔یہی اس وقت ہمارا اجتماعی منشور ہونا چاہئے اور اسی پہچان اور پیغام کے ساتھ بھارت میں جینے کا عزم کرنا چاہئے۔

میرے خیال میں اس وقت سیرت کا یہی پیغام ہے جس کو بھارت میں اطلاقی طور پر جاری وساری کرنے کی ضرورت ہے۔

آیئے اللہ کے رسولؐ پر دل کی گہرائیوں سے درود وسلام بھیجیں اور آپ کے اسوے کو اپنی زندگی کا نمونہ عمل بنائیں۔اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہم سبھوں کو اس کی توفیق عنائت فرمائے (آمین)صلی اللہ علیہ وسلم

اکیسویں صدی میں حضورؐ کی دعوت کی ضرورت

اکیسویں صدی کی خصوصیت

وقت اور زمانے کو کسی آب بند خانے (Water Tight Comparment) میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ زمین کی گردش، سورج چاند کا نظام، دن رات کی الٹ پھیر جس سے وقت اور زمانہ عبارت ہے ایک مستقل اور دائمی عمل ہے۔

قرآن کے مطابق وقت اور زمانے کو دن، تاریخ،، ہفتے، مہینہ اور سال میں تقسیم تاریخ کے تعین، عبادات کے اہتمام اور وعدے اور معاہدے کو پورا کرنے میں آسانی کی غرض سے کی گئی ہے جو نامعلوم وقتوں سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ اس میں قمری اور شمشی کلینڈر (Lunar & Solar Calendar) میں کوئی خاص برتری نہیں ہے۔ جس ملک اور مقام پر جو کلینڈر رائج ہے اس کے مطابق دن اور تاریخ کا حساب رکھنا صحیح ہے۔

اس لحاظ سے وقت اور زمانہ میں فرق کا افراد اور اقوام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر دنیا ایک اسٹیج ہے تو افراد اور اقوام ادوار میں آنے والے کردار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون اپنا کردار کس خوبی سے نبھاتا ہے۔

ہر فرد اور ہر قوم کا امتحان ہوتا ہے اور ہر امتحان کی ایک مدت مقرر ہوتی ہے ہر کسی کو اسی Time Perspective میں Perform کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اس کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ہر فرد اور قوم اپنے عہد میں اپنے عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ماضی میں کس نے کیا کیا اور مستقبل میں کون کیا کرے گا اس کی جواب دہی اس پر نہیں ہے۔ وہ آج کیا کر رہا ہے اس کی جواب دہی اسی حد تک ہے لیکن انسان کے افکار و اعمال کے اثرات صرف اس کی ذات اور عہد تک محدود نہیں رہتے بلکہ حال اور مستقبل پر بھی منتج ہوتے ہیں۔ اس لئے اعلیٰ منصب پر فائز لوگوں کو پورے

تاریخی شعور کے ساتھ اپنے فکر وعمل کا جائزہ لینا چاہئے۔

تاریخ قوموں کا حافظہ کہلاتی ہے۔ جس میں اچھی اور بری تمام باتیں درج ہیں۔ تاریخ درس وتعلیم اور عبرت ونصیحت کی چیز ہے اس لئے ہمیں خـذ مـا صفـا و دع مـا کـدر کے اصول پر تاریخ کی اچھی باتوں کو لے لینا چاہئے اور بری باتوں کو چھوڑ دینا چاہئے تاکہ صحت مند روایات کا سلسلہ چلتا رہے اور انسانیت فتنہ وفساد سے محفوظ رہتے ہوئے ترقی اور فلاح کی راہ پر گامزن رہے۔

اس لحاظ سے ہم اگر دیکھیں تو اکیسیوں صدی اور بیسویں صدی یا سترھویں اور اٹھارہویں صدی اور اکتیسویں صدی اور پچاسویں صدی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ ماضی کی صدیوں میں ہم نہیں تھے اور مستقبل کی صدیوں میں ہم نہیں ہوں گے لیکن آج اس صدی اور اس عہد میں ہم ہیں اس لئے یہ عہد اور یہ صدی ہمارے لئے اہم ہے۔ یہ صدی ہمارے لئے علمی موضوع نہیں بلکہ عملی موضوع ہے۔ یہ عہد یہ زمانہ، یہ دن رات، یہ مقام ومنصب جائے امتحان اور وقت امتحان ہے۔ اس لئے یہ وقت، یہ عہد، یہ زمانہ اور یہ صدی ہمار لئے اہم ہے جس میں ہمیں اپنے رول وکردار کو تلاش کرنا اور Perform کرنا ہے۔

اکیسویں صدی جس کے تناظر میں یہ گفتگو ہو رہی ہے کئی حیثیتوں سے اپنی پچھلی صدیوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔

(1) Information اور Communication کے میدان میں جو Technological Revolution آئے ہیں اور مسلسل آتے جا رہے ہیں اس نے زمین اور زمان کی طنابوں کو کھینچ کر پوری انسانیت کو ایک خیمہ Tent میں لا دیا ہے۔ دنیا کے کسی حصہ میں وقوع ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعہ کو آپ چند سکنڈ میں جان بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔

(2) آج دنیا میں علم، جانکاری اور ذرائع علم کا جتنا دار دورہ ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج ایک چھوٹا بچہ اور بالکل ان پڑھ آدمی بھی اتنی معلومات رکھتا ہے جتنا پچھلے زمانوں میں بڑے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی میسر نہیں تھا۔

(3) آج کی دنیا میں وسائل حیات کی جتنی فراوانی ہے اور جیسی آسائشیں عام لوگوں کو میسر ہیں اور Quality of Life میں جو Improvement ہوا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

(4) آج کی دنیا کی تہذیبی چمک دمک جہاں ایک طرف آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں وہیں دوسری طرف جس ہولناک تباہی کا سامان موجود ہے کہ ایک بٹن دباتے ساری دنیا تباہ برباد ہوسکتی ہے ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔

(5) آج ملک اور علاقے قریب آئے ہیں لیکن افراد اور اذہان میں دوری پیدا ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں دور دراز سے Communication بڑھے ہیں لیکن Internal Communication گھٹے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو بھی ٹھیک سے جانتے پہچانتے نہیں ہے۔

(6) اس دنیا میں ایک طرف جہاں Information Boom ہے وہیں دوسری طرف Disinformation بھی ہے آج کا آدمی حد درجہ Individualistic ہوگیا ہے Indifference اور Wilful Ignorance اس کی خصوصیت ہوگئی ہے۔

(7) سماج میں ہر طرف ٹکراؤ ہے ،عدم رواداری اور تشدد ہے، فتنہ اور فساد ہے Human اور Moral Value میں ہراس ہوگیا ہے ۔ ہر چیز پر Materialism اور Commercialism حاوی ہے۔ پیسہ اور اقتدار کی خاطر آدمی کسی Level تک جاسکتا ہے۔ لہذا آج کی دنیا جوالا مکھی کے دہانے پر بسی ایک ایسی خوبصورت بستی ہے جو ایک پل میں راکھ کا ڈھیر بننے کو تیار ہے۔ دنیا اپنی تمام تر ترقیات کے ساتھ ایک زبردست حادثہ سے دوچار ہونے کے لئے آمادہ پیکار ہے۔

آدمی آدمی میں دوری، نسلی تصادم (Economic Clash) انتشار (Insurgency) دہشت گردی (Terrorism) نسلی تطہیر (Ethnic Cleansing) نئی نوآبادیت اور نیا استعمار (Neo- Colonialism & Neo - Imperialism) بڑے ملکوں کی ہوس، چھوٹے ملکوں، علاقوں اور ان کے وسائل کو ہڑپنے کی کوشش Chaos,

Confusionاور Crisisنے پورے انسانی سماج کو جس Impendingخطرے سے دوچار کر دیا ہے اس کا تصور بھی اس سے پہلے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

آج کی انسانیت حفاظت کی ،امن کی، انصاف کی اور اپنے جائز حقوق کی بھیک مانگ رہی ہے جبکہ بدلے میں اسے عدم تحفظ (Insecurity) خوف (Fear) عدم رواداری (Intolerance) ناانصافی (injustice) نابرابری اور حق تلفی کا تحفہ ملا ہے ۔ایسے میں لوگ کیسے امن وانصاف کے ساتھ رہیں؟ کیسے لوگوں کو جائز حق ملے؟ کوئی طاقت ور کسی کمزور کو نہ دبائے ،غربت، جہالت سے چھٹکارہ کیسے حاصل ہو؟ انسان زمین پر انسان کی طرح کیسے رہنا سیکھے؟ اپنی اور اپنی نوع کا محافظ اور ان کی بھلائی کا ضامن کیسے بنے؟ دنیا خطرات سے دہشت گردی (Terrorism) سے کیسے محفوظ رہے؟ Neo - Imperialism کے بڑھتے سائے سے کیسے بچے؟ Nazismاور Fascismپر کیسے روک لگے؟ خدا سے تعلق کیسے پیدا ہو، انسانیت نوازی کا سلیقہ کیسے آئے ۔اس کے لئے ہمارا ایمان ہے کہ دنیائے انسانیت کو حضرت محمدؐ کی ضرورت ہے۔

یہ بات کچھ لوگوں کے لئے مضحکہ خیز ہوگی کیونکہ ان کے خیال میں اس وقت دنیا میں جو بھی ظلم وفساد ہے بے چینی اور بدامنی ہے اس کے 75% ذمہ دار مسلمان ہیں اور مسلمان ملک اور سماج میں سب سے زیادہ اس کے شکار ہیں۔ میں صرف ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ اور اسلام کی تعلیم مسلمانوں کا سماج اور اسلامی تعلیمات دونوں میں بدقسمتی سے کافی بعد وتفاوت پایا جاتا ہے ۔اس لئے دونوں کو ایک سمجھنا اور دونوں پر یکساں حکم لگانا غلط ہے ۔جس سے غلط فہمی پیدا ہوگی اور آپ اس سے کبھی صحیح نتیجہ نہیں نکال سکیں گے ۔ہم ان لوگوں میں نہیں جو یہ مانتے ہیں کہ My nation right or wrong بلکہ ہم ان لوگوں میں بھی جو اپنوں کی غلطی پر اسی طرح اعتراض کرتے ہیں اور ان سے اعراض برتتے ہیں جیسے دوسروں کی غلطی پر۔

موجودہ مسلمان سماج

آج اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی بالعموم اسلام کی نمائندہ نہیں ہے

خلافت راشدہ کے بعد جو بھی حکمراں ہوئے وہ (Unmixed Islamic Ruler) مکمل اسلامی حکمراں نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے بہت سے ایسے کام کئے جو اسلام کے مطابق تھے اور بہت سے ایسے کام بھی کئے جو اسلام کے خلاف تھے۔ انہوں نے جو کام اسلام کے خلاف کیا اس سے اسلام کا کوئی لینا دینا نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر آج کی مسلم سوسائٹی اور اسلام کو دوشی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آج کا مسلمان اگر کوئی کام اسلام کے خلاف کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے تاہم اگر کوئی مسلمان خلاف اسلام عمل کرتا ہے تو عام لوگوں کا غلط فہمی میں مبتلا ہونا فطری ہے اور جب ایسے مسلمانوں کو لوگ غازی اور مجاہد کا درجہ دینے لگتے ہیں تو فطری طور پر ان کے کردہ اور ناکردہ اعمال کو اسلام کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا ہے۔

اسلام ایک آفاقی دین ہے

خدا کا شکر ہے کہ اسلامی تعلیمات، اس کا اصلی ماخذ ومصدر پوری طرح محفوظ ہے اس لئے ہم کسی بھی قول کو جانچ پرکھ کر آسانی سے بتا سکتے ہیں کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور کہاں کتنا انحراف ہوا ہے۔ اسلام کو سمجھنے میں آج سب سے بڑی روکاوٹ خود مسلمانوں کا رول اور رویہ ہے لیکن جو لوگ مسلمانوں کی غلطی کو اسلام پر مڑھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دونوں دو چیزیں ہیں اس لئے اس پر یکساں حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

اب مسلم سماج کا اس سے بڑا دوش اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کو صرف مسلمانوں کا نبی بنا کر پیش کرتا ہے۔ جبکہ قرآن کہتا ہے آپ تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

سورہ اعراف آیت ۱۵۸ میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ۔ قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السموات

اے محمدؐ کہہ دیجئے اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے دوسری جگہ کہا۔ وما ارسلناك الا رحمة للعالمین۔ ہم نے آپ کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تیسری جگہ کہا۔ وما ارسلنک الا کافة للناس بشیرا ونذیرا ولکن اکثر الناس

لا یعلمون۔

اے محمدؐ ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہے۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ قرآن کے دعویٰ کے مطابق آپ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے نبی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں ہیں۔اور بہت سے لوگ جان کر بھی مانتے نہیں ہیں۔لیکن سورج سورج ہے چاند چاند ہے، ہوا ہوا ہے۔زمین زمین ہے،آسمان آسمان ہے۔کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے ہے۔بہت سی چیز ہے جس کو ہم نہیں جانتے یا نہیں مانتے لیکن اس سے اس کی حقیقت نہیں بدل جاتی ہے ٹھیک اسی طرح حضرت محمدؐ کی عالمگیریت ختم نہیں ہوتی۔اس لئے آپ سارے انسانوں کے نبی ہیں مسلمان اس کو مانتے ہیں اور جو مسلمان نہیں ہیں وہ اس کو نہیں مانتے ہیں۔مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو اس سے واقف کرائیں اور دلائل و براہین کی روشنی میں ان کو اس حقیقت کو ماننے پر آمادہ کریں۔پھر بھی اگر کوئی نہ مانے تو اس پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔لیکن اگر وہ اس فریضہ سے غافل ہیں یا اس کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں تو یہ ایک ایسا جرم ہے جو نا قابل معافی ہے مسلمانوں کی ذلت و گمراہی کی ایک بڑی وجہ اپنے داعیانہ کردار سے پہلو تہی ہے۔

اسلام کے بارے میں دوسری بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ حضرت محمدؐ اسلام کے پرورتک (Founder) یعنی بانی اسلام ہیں۔اس سے بسا اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہے بلکہ اسلام کی تاریخ اور تعلیم کے باب میں بھی کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے قبل دنیا کی تاریخ میں اسلام نام کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ لیکن یہ پوری حقیقت نہیں ہے اللہ نے آدم کی تخلیق کی اور ان کو علم و ہدایت دے کر زمین پر اتارا۔پھر اس کے بعد ان کی اولاد سے بہت سی نسلیں اور قومیں وجود میں آئیں جو زمین کے مختلف خطوں میں پھیل اور بس گئیں۔وقت اور زمانے میں تبدیلی کے سبب ان کے رنگ ، زبان ،تہذیب وتمدن میں فرق آیا۔اللہ نے ہر عہد میں۔ ہر قوم میں، ہر زبان میں اپنا نبی اور رسول بھیجا۔جس نے اپنے اپنے عہد میں اپنی زبان میں اپنی قوم کو خدا کی بندگی کی دعوت دی۔نوحؑ ،ابراہیمؑ ،موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اسی

سلسلے کی کڑی ہیں۔ یہ سب انبیاء جو دین لائے عرف عام میں اس کا جو نام رہا ہو اصلاً وہ اسلام ہی تھا۔ اس لئے کہ اس میں توحید رسالت اور آخرت کی تعلیم کے ساتھ خدائے واحد کی خالص اور بے میل مکمل بندگی کی دعوت دی گئی تھی۔ اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

سورہ اعراف میں مسلسل کئی رکوعوں میں مختلف انبیاء کا نام لے کر ان کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔ تمام انبیاء نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا۔ اے میرے قوم کے لوگو! ایک خدا کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سورہ انعام آیت ۸۴۔۹۰ میں تفصیل سے مختلف انبیاء کے نام گنوائے گئے ہیں جن کی دعوت ایک تھی ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی۔ اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی۔ (وہی راہ راست) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو (ہدایت بخشی) اسی طرح ہم نیک کاروں کو نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ اور ذکریا، یحیٰ، عیسیٰ اور الیاس کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں صالح تھا اور اسماعیل الیسع اور یونس اور لوط کو (راستہ دکھایا) ان میں سے ہر ایک کو تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباء واجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انہیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور علم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروانہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہے۔ اے نبی! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ انہیں کے راستے پر چلو اور کہہ دو کہ میں اس تبلیغ و ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے (ان ھو الا ذکری للعلمین)۔

اسی بات کا اعادہ اور تکرار ہمیں سورہ آل عمران کی آیت ۸۴ میں یوں ملتی ہے۔

اے نبی کہو کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہیں۔ ان

تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی تھی۔ اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ ہم اللہ کے تابع فرمان یعنی مسلم ہیں۔

قرآن نے یہ واضح کیا کہ یہ سب چند نام ہیں جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اس کے علاوہ بہت سے انبیاء ہیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ الانبیاء آیت ۱۹۴۔۱۹۵ میں ذکر ہے۔

ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں۔ اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا **وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ**...... یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تا کہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس ان کے مقابلہ کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا رحیم اور دانا ہے۔

لہٰذا اسلام اسم ذات اور اسم صفت یعنی Pronoun اور Adjective دونوں ہے۔ اسلام عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خود سپردگی اور اطاعت کے ہیں عرف عام میں اللہ کے حضور خود کو بلا شرط مکمل طور پر سپرد کر دینے کو اسلام کہتے ہیں جو شخص خود کو محمدؐ کے بتائے ہوئے طریقہ پر اللہ کے حوالے کر دے اس کو مسلم کہتے ہیں۔ مسلمان کو یہ نام قرآن کے بقول حضرت ابراہیم نے جو مذاہب عالم میں تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے جد پیغمبر تھے نے عطا کیا تھا لہٰذا باقی مذاہب یعنی عربی عبرانی اور اس کے آس پاس کی جو زبان ہیں اس میں جو خدا کی ہدایات مختلف اوقات میں مختلف نبیوں پر نازل ہوئیں ان میں بے پناہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ چونکہ تمام انبیاء جس قوم میں آئے انہوں نے اسی قوم کی زبان میں اپنی دعوت پیش کی اور اسی زبان میں خدا کی طرف سے وحی اتری۔ چنانچہ جب مکہ میں لوگوں نے حضور سے سوال کیا کہ آپ پر کسی اور زبان میں یہ کتاب کیوں نہیں اتاری گئی تو قرآن نے کہا اگر تم کسی اور زبان کے بولنے والے ہوتے تو اس زبان میں اس کو نازل کیا جاتا۔ قرآن عربی مبین میں اس لئے نازل ہوئی کیونکہ اس کے اولین مخاطب عرب تھے۔ دنیا کی تمام زبانیں اصل کے اعتبار سے ایک ہیں کیونکہ انسانی فطرت میں یکسانیت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے ایک زبان بولنے والا آدمی ترجمہ کی مدد سے دوسری زبان کے

آدمی تک اپنے مافی الضمیر کی ترسیل کر پاتا ہے۔ ورنہ انسانی طبائع ،نفسیات، احتیاجات اور داعیات میں یکسانیت نہیں ہوتی تو ایک انسان کا دوسرے انسان سے رابطہ اور ترسیل ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ نے زبان کو اللہ کی آیات اور توحید کے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان ایک خدا کے پیدا کردہ اور اس کے بندے ہیں۔ لہذا اسم ذات کے طور پر اسلام ایک مخصوص دین کا نام ہے جو حضور کی بعثت کے بعد اس نام سے معلوم و مشہور ہوا۔ مگر اسم صفت کے طور پر یہ آفاقی اور ابدی دین ہے جو تمام ادیان کا مقصد ہے۔ اگر ان میں تحریف اور تبدیلی نہیں ہوتی تو وقت کے فرق اور بعض جزوی تفصیلات کے سوا اس کی بنیادی تعلیمات بالخصوص اس کے عقائد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

قرآن اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے نبی بھیجے ہیں لکل قوم ھاد۔ اور جو نبی بھی آیا اس نے اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کی۔ چنانچہ قرآن اپنے نبی اور اس کی دعوت کے بارے میں صاف صاف کہتا ہے یہ نبی کوئی نرالا اور انوکھا نہیں ہے اور نہ اس کی دعوت نرالی اور انوکھی ہے اس سے پہلے بھی نبی آئے ہیں اور انہوں نے وہی باتیں کہی ہیں جو یہ نبی تمہیں بتا رہا ہے چنانچہ قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اس سے پہلے آئی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ چونکہ پہلے کی کتابوں میں لوگوں نے بہت سی باتیں بدل دی ہیں اس میں تحریف کر دیا ہے اس لئے وہ کتابیں اور وہ تعلیمات اپنی اصلی شکل میں نہیں ہیں۔ اس لئے قرآن خود کو فرقان یعنی کسوٹی کہہ کر پکارتا ہے۔ جس پر جانچ پرکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کیا صحیح ہے کیا غلط ہے؟ اس طرح قرآن کا انداز تکذیبی نہیں تصدیقی ہے۔ وہ انہیں باتوں کی تردید کرتا ہے جو غلط ہے۔ وہ تمام لوگوں اور بالخصوص تمام ادیان کے حاملین کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ ان باتوں کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک ہیں سواء بینا و بینکم اور اس میں وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہذا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اس بنیاد پر وہ کسی سے بھی اتحاد کا قائل ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو توحید باری کا قائل نہ ہو۔ مگر چونکہ وہ اس کا صحیح ادراک نہیں رکھتے اس لئے توحید اور شرک اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ نظری طور پر توحید کا قائل ہونے کے باوجود عملا وہ شرک میں گلے گلے تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہی اس وقت مذاہب

عالم کا المیہ ہے ورنہ اگر مذاہب عالم کی تاریخ دیکھی جائے اور ان کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ان کی تعلیمات اور اسلام میں گہری مماثلت ہے اس اعتبار سے اسلام ان تمام مذاہب کا سنگم (Confluence of Faiths) ہے بلکہ تمام مذاہب میں اسلامی تعلیمات کی جھلک ملے گی۔ اس لحاظ سے تمام مذاہب میں اسلام کا عنصر (Element of Islam) موجود ہے۔ لہذا اسلام کو بجا طور پر مذاہب عالم کا دولت مشترکہ (Common Wealth of Religion) بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو اس کی عالمیت یا عالمگیریت کا مظہر ہے۔

حضرت محمدؐ کو انبیاء اور ادیان پر تین فضیلتیں حاصل ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ تمام دنیا کے لئے نبی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی تعلیمات اور آپ کا لایا ہوا دین پوری طرح مکمل اور محفوظ ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام تر معاملات میں مکمل اور مستند رہنمائی فرماتا ہے اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے کوئی شخص اگر آپؐ کے لائے ہوئے دین و دعوت کو نہیں مانتا ہے تو وہ گمراہ ہے۔ اس کے اختیار کردہ دین کو خدا کے یہاں شرف قبولیت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ساری دنیا کے انسانوں کو اس دین کو جاننا، سمجھنا اور ماننا چاہیے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

مسلمانوں پر یہی ذمہ داری ہے کہ وہ ساری دنیا کو اس دین و دعوت سے روشناس کرائیں اور جو لوگ جانتے نہیں ہیں ان کو بہترین دعوت اور علمی دلائل کے ساتھ ان تھک جدوجہد کے ذریعہ بتانے اور پہنچانے کا اہتمام کریں۔

یہ دعوت کیسے لوگوں تک پہنچے گی تا کہ لوگ اس کی معنویت اور اہمیت کو سمجھ سکیں۔ یہی اس وقت ہمارے سامنے اکیسویں صدی کا چیلنج ہے مجھے نہیں معلوم امت اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ اگر امت نے اپنی یہ تاریخی ذمہ داری پوری نہیں کی تو وہ جس ذلت و نکبت کے گرداب میں اس وقت پھنسی ہے اس سے باہر آنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہ دعوت نہ صرف انسانیت عامہ کی ہدایت بلکہ مسلمانوں کو خود اپنی کھوئی پوزیشن کو واپس لانے کی واحد

راہ ہے جس میں اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی مضمر ہے۔

مگر یہ کام ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس میں پہلا مرحلہ جہالت، بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے گھنے جنگلوں کو کاٹ کر صاف کرنا ہے اور دوسرا مرحلہ وقت کی زبان محاورات۔ اصطلاحات، مسائل اور حالات کی روشنی میں ایک واضح نقشہ کے ساتھ عالم انسانیت کی رہنمائی کرنا ہے۔

جہاد واجتہاد کا مفہوم اور اس کا مقصد

جہاد واجتہاد اسلام کے دو ہتھیار ہیں جو اس وقت کند پڑے ہوئے ہیں۔ جہاد کا نام آتے ہی لوگوں کے سامنے ایک خوفناک اور بھیانک تصویر ابھرتی ہے۔ دنیا بھر کے مستشرقین اور اسلام دشمن مفکرین ومؤلفین نے جہاد کی ایسی تعبیر وتشریح پیش کیا ہے جیسے لگتا ہے مسلم جنونیوں کا ایک گروہ ہاتھ میں تلوار لئے انسانی آبادی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ظلم و بربریت کا بازار گرم کرکے چنگیز وہلاکو کی روح کو بھی شرمندہ کردیتا ہے۔ جہاد اگر فی الواقع یہی ہے تو اس سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اس صورت میں اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے لیکن یہ جہاد کی بالکل الٹی تشریح ہے جو جہاد کے مفہوم اور مطلب کی نافہمی پر مبنی ہے۔

اولاً تو جہاد جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ قرآن نے جنگ کے لئے ایک دوسرا لفظ قتال استعمال کیا ہے اس طرح جہاد جنگ سے بلند تر ایک چیز ہے جس کا ایک حصہ قتال بھی ہے جہاد کا لفظ جہد سے بنا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرنا۔ یہاں تک کہ آدمی اس میں اپنی جان عزیز تک کو کھپا دے۔ اسلام میں مجرد جنگ اور جہاد کی اجازت نہیں ہے بلکہ اسلامی جہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ جہاد، جہاد فی سبیل اللہ ہو۔ اس لئے ہر جنگ چاہے وہ دو مسلمانوں کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان جہاد نہیں ہے بلکہ وہی جنگ جہاد ہے جو اللہ کی راہ میں لڑی جائے۔ قومی برتری اور مختلف ملکوں اور علاقوں پر قبضہ کرکے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوشش کرنا اگر خدا کے دین کی دعوت واقامت کے لئے نہیں ہے تو یہ محض ہوس ملک گیری ہے امپیریلزم ہے اس لئے اس کو جہاد کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری یہ کہ جہاد بالسیف جہاد کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔اس انتہائی اقدام سے پہلے جہاد کے اور طریقے ہیں جس کو بروئے کارلائے بغیر محض تلوار کے ذریعہ جنگ کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔تلوار سے زمینوں اور ملکوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے ذہن وروح پر نہیں۔اور جب تک ذہن وروح مطیع وفرمان بردار نہیں بنتے جہاد کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔اس لئے جہاد کے کئی اور طریقے ہیں جن کو اختیار کرنے کے بعد ہی تلوار کا سہارا لینا چاہئے۔جہاد زبان سے ہوتا ہے۔جہاد قلم سے ہوتا ہے۔جہاد خود آدمی کے اپنے نفس سے ہوتا ہے دوسروں پر طاقت اور علم کے زور پر قبضہ کرلینا آسان ہوتا ہے لیکن خود اپنے نفس پر کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ جہاد بالسیف جہاد اصغر ہے اور جہاد بالنفس جہاد اکبر ہے۔حضرت علیؓ کے بقول جو شخص خود اپنے نفس پر کنٹرول نہیں کرسکتا وہ صحیح طور پر جہاد نہیں کرسکتا فارسی میں کہا گیا ہے'' بالنفس جہاد کن شجاعت ایں است''

یہاں ایک بات اور اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جہاد ہمیشہ ایک Establishment کا کسی دوسرے Establishment کے خلاف ہوگا۔یعنی اس کا مزاج اجتماعی ہے۔ہر شخص اور گروہ کو جہاد کی اجازت نہیں ہے جہاد کا مطلب Regime Change کی کوشش ہے۔فتنہ فساد پھیلانا جہاد نہیں ہے۔اس لئے دہشت گردی Terrorism جہاد نہیں ہے۔کوئی شخص یا گروہ جب چاہے جس کے خلاف چاہے جہاد کا اعلان نہیں کرسکتا۔جہاد کے چند شرائط ہیں جب تک وہ شرائط پورے نہیں ہوتے اسے جہاد نہیں کہا جاسکتا۔

جہاد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاد ان کے خلاف ہوگا جو لڑنے والے ہیں پرامن عوام کے خلاف جہاد نہیں ہے قرآن کے بقول وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ گذرو بلاشبہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اگر آپ جہاد کے بارے میں قرآنی تعلیمات کا جائزہ لیں تو قرآن نے جہاد کے پانچ واضح مقاصد بیان کئے ہیں۔

(۱) ظلم کا خاتمہ۔قرآن کہتا ہے ''جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں اللہ کی طرف سے لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے ۔اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں ان کا قصور صرف یہ تھا کہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے ہیں ۔(الحجہ ۳۹۔۴۰)

(۲) جہاد کا دوسرا مقصد فتنہ اور فساد سے سماج کو محفوظ رکھنا ہے ۔اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی ،مگر دنیا پر اس کا فضل و کرم ہے وہ دفع ضرر کا انتظام کرتا رہتا ہے۔

(۳) جہاد کا تیسرا مقصد مختلف مذاہب کے معبدوں کی حفاظت ہے ۔لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام دیگر مذاہب کے معبدوں کو توڑنے اور مٹانے کے لئے آیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔اسلام یہ مانتا ہے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہیں ہے ۔جو کوئی اس کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا وہ اللہ کے حضور ہرگز قبول نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ دین کے معاملے میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہے قرآن اپنے رسولؐ سے صاف صاف کہتا ہے کہ آپ کا کام تمام لوگوں تک اللہ کی بات پوری طرح پہنچا دینا ہے ۔ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔آپ لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں کہ زبردستی لوگوں کو اپنی بات ماننے پر مجبور کریں۔یہ ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے رد کردے تاہم وہ یہ انتباہ ضرور دیتا ہے کہ اس کے نہ ماننے کی سزا آخرت میں سخت ہوگی ۔قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسان ایک ہی دین پر ہوتے ۔مگر جب اللہ نے زبردستی اس کا پابند نہیں کیا ہے تو بندے کو کہاں سے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی کو زبردستی اس کا پابند کردے وہ تو لوگوں کو حکمت اور بہترین بحث و دلائل کے ساتھ خدا کے راستے کی طرف بلانے کی دعوت دیتا ہے لہذا وہ نہ صرف اسلام کا بلکہ دیگر ادیان کا محافظ بن کر اٹھتا ہے ۔انسانی سماج بنیادی طور پر تکثیری سماج ہے ۔لہذا اسلام دوسرے عقیدے کو باطل ماننے کے باوجود اس کے احترام کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو ۔بلکہ جب ایک آدمی ہر طرح کے دلائل وشواہد کے باوجود دین حق کو تسلیم

نہیں کرتا تو وہ بس اتنا کہتا ہے کہ تب ٹھیک ہے۔ اگر تم ہمارے دین وعقیدے کو نہیں مانتے تو ہم بھی تمہارے دین وعقیدے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا دین ہمارے لئے اور تمہارا دین تمہارے لئے ہے۔ اب جو کوئی اس سنہرے قانون کی خلاف ورزی کرے گا وہ مجرم ہوگا۔

اس پس منظر میں اسلامی جہاد کا ایک مقصد دیگر ادیان کے معبدوں کی حفاظت بھی ہے۔ قرآن کے مطابق۔

اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومع اور گرجے اور معبد (عیسائیوں کے راہب خانے، مجوسیوں کے معبد، صابیوں کے عبادت خانے عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنائس) اور مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے مسمار کردئے جاتے۔

اس طرح اسلامی جہاد کا مقصد محض اپنی مسجدوں کی حفاظت نہیں ہے بلکہ دیگر مذاہب کے عبادت خانوں کی حفاظت بھی ہے۔ اب اتنی واضح ہدایت کے باوجود کسی مذہب کی عبادت گاہوں کو جہاد کے نام پر توڑنے اور برباد کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اور اگر کسی نے یہ حرکت کی ہے تو اس کی تائید کس طرح کی جاسکتی ہے؟

(۴) اسلامی جہاد کا چوتھا مقصد کمزوروں کی حمایت ہے۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم وجفا کار ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ ومددگار مقرر فرما۔ (النساء۷۵)

(۵) جہاد اسلامی کا پانچواں مقصد اپنے دین کی حفاظت ہے۔ اسلام جہاں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی پر ظلم وزیادتی کرے اور زبردستی کسی کو اپنا دین بدلنے پر مجبور کرے۔ وہیں وہ کسی کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ مسلم ملکوں اور آبادیوں پر جبراً کوئی دوسرا دین تھوپے یا مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے تو ان کے خلاف، جہاد ضروری ہے۔

قرآن صاف صاف اعلان کرتا ہے۔ جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، ان سے خدا کی راہ میں

جنگ کرو مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو (یعنی ظلم پر نہ اتر آؤ) کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو۔ کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ تم ان سے برابر جنگ کئے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ پس جو کوئی تم سے زیادتی کرے اس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو۔ مگر اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ صرف متقیوں کے ساتھ ہے۔ (البقرہ ۱۹۰۔۱۹۴)

یہ جہاد کی مختصر ترین اور جامع ہدایت ہے جس میں نہ صرف اسلام بلکہ حیات انسانی کے امن وعزت کی حفاظت کا سامان موجود ہے۔ بہت سے لوگوں نے جہاد کے نام پر وہ حرکتیں بھی کی ہیں جس کو مٹانے اور ختم کرنے کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے اس لئے جب تک اسلام کے نظریاتی اساس کو ٹھیک سے سمجھا نہیں جاتا اس وقت تک جہاد کے مفہوم اور اس کی اہمیت وضرورت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاد کی حقیقت کو واضح انداز سے لوگوں کے سامنے لایا جائے تا کہ نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے بلکہ لوگ اس کی ضرورت واہمیت کے قائل ہوں اور انسانی تعمیر کے کسی منصوبے میں اس کو ایک لازمی عنصر کے طور پر قبول واستعمال کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہمیں اپنے ملکوں، آبادیوں اور وسائل کی حفاظت کے لئے State of the Art کے ساتھ دفاعی تیاری کرنی چاہئے تا کہ ہم حکمت اور طاقت کے ساتھ کسی بھی فتنہ کا مقابلہ کر سکیں۔ حضورؐ کی سیرت ہمیں اس باب میں جو نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا جانا چاہئے تا کہ جدید عہد کے تقاضوں کے تحت ہم اس کو اپنانے اور برتنے کے اہل ہو سکیں۔ اس کے لئے اجتہاد ضروری ہے۔ لیکن اس وقت جہاد سے زیادہ اجتہاد کے باب میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے تو کچھ لوگ یہ مان کر چل رہے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پر جدید معاشرت وریاست کی تشکیل نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اسلام کو چھوڑ کر ہی کوئی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اصولی اور نظری طور پر لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام ایک مکمل اور آخری دین ہے جو زندگی کے تمام جملہ معاملات میں رہنمائی کرتا ہے مگر عملاً وہ عقائد، عبادات، چند اجتماعی معاملات اسلام کے دائرے اثر سے باہر

ہیں بالخصوص سیاست ،معیشت ، بین الاقوامی تعلقات، ترقیاتی ماڈل اور دیگر تمدنی وثقافتی دائروں میں لوگ اسلام کو چھوڑ کر ہی بات کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں اسلام ان معاملات میں جدید انسانی گروہ کی رہنمائی کی اہلیت نہیں رکھتا۔

کبھی کبھی ہمیں بعض ملکوں اور علاقوں میں اسلامی حکومت کے قیام کی بات سننے کو ملتی ہے لیکن جلدی ہی سارے اعلانات وبیانات ٹائیں ٹائیں فش ہوجاتے ہیں گویا کہ اس دور میں اسلام کے نام پر کوئی اجتماعی نظام برپا نہیں کیا جاسکتا۔

سوال یہ ہے کہ ہمیں بار بار ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑتا ہے۔اس کی چند بڑی وجہیں ہیں پہلی یہ کہ جولوگ اسلامی انقلاب یا حکومت کی بات کرتے ہیں اکثر وہ لوگ مخلص نہیں ہوتے۔عام طور پر ایسے لوگ فوجی حکمراں ہوتے ہیں جو کسی بغاوت یا انقلاب کے نتیجہ میں برسر اقتدار آجاتے ہیں۔مسلمان ملکوں اور آبادیوں میں اپنی حکومت کو سند قبولیت عطا کرنے کے لئے اور مسلم عوام میں ایک جذباتی اپیل پیدا کرنے کے لئے وہ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں اور چند علامتی اعلانات و اقدام کے ذریعہ اپنی حکومت کو اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کسی شخصی حکومت کا قیام تو عمل میں آسکتا ہے۔اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہیں ہے۔اسلامی حکومت عوام کی رضا کارانہ اطاعت کا متقاضی ہے۔اس کو بجبر دوسرے پر تھوپنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی ۔اس کے لئے ایمان میں مضبوطی ، اللہ کا خوف ،حضور سے محبت، آخرت کی جوابدہی کا احساس ضروری ہے۔اس کے علاوہ مسلمانوں کا دین سے واقف ہونا اور اس پر عمل کرنے کے لئے ایک اجتماعی ماحول پیدا کرنا بھی ضروری ہے جس کے لئے تعلیم اور تزکیہ کی ضرورت ہوگی ۔ جب تک عوام کے ایک بڑے طبقہ کو تربیت کے پورے نظام سے گذار کر اصلاح وعمل کے لئے آمادہ نہ کرلیا جائے یہ ممکن نہیں ہے۔لہذا یہ کام انقلاب وبغاوت کے ذریعہ ممکن نہیں۔ انقلاب وبغاوت سے حکومت تبدیل ہوجائے گی۔سماج کو تبدیل کرنے کئے لئے اس کو ایک سماجی عمل سے گذرنا ہوگا۔یہ اس مسئلہ کا ایک پہلو ہے۔

میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مسلمان عوام کسی اسلامی نظام میں رہنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ میرا احساس ہے کہ مسلمان اسلامی نظام کو کسی دوسرے نظام سے زیادہ پسند

کرتے ہیں بشرطیکہ وہ نظام ان کے جملہ ضروریات کو پورا کرنے کا اہل ہو۔اس کے لئے بڑی علمی تیاری کی ضرورت ہے۔آج ہمارے پاس جو علمی سرمایہ موجود ہے۔اس سے اسلام کی بنیاد پر کسی جدید سماج اور ریاست کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔

آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔اس صدی کے حالات ومسائل ، چیلنجز اور معاملات کا ماضی کی صدیوں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی کے فقہی سرمایہ سے موجودہ صدی کے حالات ومسائل کا حل ممکن نہیں ہے مجھے عالم اسلام کی علمی کاوشوں کا اندازہ نہیں ہے لیکن اگر وہ اس لائق ہوتیں کہ اس کی بنیاد پر کسی جدید اسلامی ریاست کی تشکیل کی جاسکتی تو کہیں نہ کہیں اس کو ضرور بروئے کار لایا جاتا۔میرا احساس ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور علامہ اقبال نے ملت کو جس فکری سطح پر چھوڑا تھا ملت علمی اعتبار سے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھی ہے۔اس علمی انفجار کے دور میں جب کوئی قوم علمی تعطل (Intellectual Stagnation) کی شکار ہو تو اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔آج مسلمان سماج اسلام پر اس لئے بھی عمل نہیں کر پارہا ہے کیونکہ اسے معاملات زندگی کے باب میں مثبت علمی رہنمائی نہیں ملتی ۔ اس پر منفی رجحان غالب ہے اور وہ اندر سے احساس کمتری میں مبتلا ہے۔

اس نفسیاتی کیفیت کے ساتھ کوئی قوم اعتماد کے ساتھ پیش قدمی نہیں کرسکتی ہے۔اس وقت عالم اسلام میں جو Retreat کا ماحول ہے اس کی ایک بڑی وجہ واضح مثبت علمی رہنمائی سے محرومی ہے۔لہذا اس وقت اجتہاد کی ضرورت سے وہی لوگ انکار کرسکتے ہیں جو اسلام کی محکومی پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ خود حضور پاکؐ نے اپنے عہد میں اپنے ہاتھوں سے کھولا تھا اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دروازہ بند ہو چکا ہے۔یہ صحیح ہے کہ اجتہاد کی کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود وقیود ہیں۔ہر کس و ناکس کو اجتہاد کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور ہر رائے کو اجتہادی رائے کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اجتہاد کے لئے سب سے اولین شرط ایمان علم اور اخلاص ہے اس کے بعد اصابت فکر

وکردار تقویٰ اور پرہیز گاری آتی ہے ۔ اصول استنباط کے جو طریقے متعین کئے گئے ہیں اس کا استحضار ضروری ہے بہرحال میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اس وقت اجتہاد کی اشد ضرورت ہے تا کہ فکر اسلامی کی جدید تقاضوں کے تحت تدوین وتالیف کی جا سکے اور انسانی معاملات کے جملہ میدانوں میں رہنمائی دی جا سکے ۔ یہ اجتہاد صرف فقہی امور ومعاملات میں ہی نہیں بلکہ سائنس اور معاش اور دیگر شعبۂ حیات میں بھی کرنے کی ضرورت ہے ۔ الگ الگ دائروں میں اجتہاد کے الگ الگ تقاضے اور طریقے ہوں گے ۔ اب یہ اجتہاد انفرادی سطح پر ہوں گے یا اداروں کے ذریعہ یا اس کے لئے ملکی اور بین الاقوامی پیمانے پر ادارے اور ایجنسیاں قائم کرنے کی ضرورت ہوگی ۔ اس کے لئے کوئی شورائی نظام وضع کیا جائے گا یا علمی وتحقیقی اداروں کے ذریعہ یہ کام ہوگا یا کھلے بحث ومباحثہ کے ذریعہ انجام دیا جائے گا یہ دراصل مسائل و معاملات کی نوعیت پر منحصر کرتا ہے ۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بغیر اجتہاد کے عہد جدید میں اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہے ۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ کہ ہم جس ماحول اور زمانے میں رہ رہے ہیں ہمارا کوئی فکر و خیال کسی Close Model میں پروان نہیں چڑھ سکتا ۔ اس کے باوجود کہ آج کل نیشنلزم کا زمانہ ہے اور قومی خودمختاری (National Sovereignty) کی بات بڑے زور شور سے کی جاتی ہے مگر ہم بین الاقوامیت کے ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں دنیا کے کسی چھوٹے سے چھوٹے خطہ میں ہونے والا کوئی واقعہ عالمی اثر رکھتا ہے ۔ اس لئے ہمیں اس وقت ایک نئے تاریخی اور عالمی شعور کی ضرورت ہے جس کے بغیر ہم فکر اسلامی کی تشکیل جدید صحیح خطوط پر نہیں کر سکتے ہیں ۔

اس وقت ایک دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے زیر اثر جس نئے عالمی نظام کی تشکیل ہوئی ہے اس میں سیکولر دائرے میں جن قدروں کو عالمی قدروں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور بین الاقوامی انجمنوں اور اداروں سے لے کر ملی اور بین الاقوامی معاہدوں اور دستاویزات میں نیز ساری دنیا کے دساتیر (Constitution) میں جن انسانی قدروں کی ضابطہ بندی کی گئی ہیں ۔ وہ سب اسلام سے مستعار ہیں ۔

نبیؐ کے پیغام کو عام کرنے کی ضرورت

مثال کے طور پر انسانی شرف واحترام کا نظریہ، انسانی وحدت ومساوات کا اصول، قانون کی حکمرانی، ایک عدل پرور نظام کی تلاش، ظلم واستحصال کے خلاف جنگ، انسانی حقوق کا احترام، رواداری اور بقائے باہم کا اصول۔ یہ اس وقت وہ عالمی قدریں ہیں جن کو ساری دنیا کسی نہ کسی طور پر تسلیم کرتی ہے۔ لیکن جیسا مارکس نے ہیگل کے جدلیاتی نظریہ کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی فکر اپنے سر کے بل کھڑی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ ساری قدریں سر کے بل کھڑی ہیں۔ ان کو دو پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو ایک ٹھوس عقیدے کا پابند کیا جائے۔ جب تک جوابدہی کا احساس نہیں ابھرتا ہے تو محض قانونی اداروں کے قیام سے قانون اور حدود کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ انسانوں کو اپنے دائرے میں رکھنے کے لئے خدا کا خوف بیدار رائے عامہ کی گرفت اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ قوت واقتدار، علم ودولت آدمی کو ظلم پر آمادہ کرنے سے نہیں روک سکتی۔ انسان کو سچی آزادی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی ہے جب تک وہ انسانوں کی ہر نوع کی غلامی سے آزاد نہیں ہو جاتا اور جب تک انسان کو یہ آزادی نصیب نہیں ہوتی کہ وہ محض خدا کا بندہ ہے وہ حقیقی فلاح سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جس کا حصول آسان نہیں ہے۔ اس کام کے لئے زبردست علم، اخلاقی قوت اور بہت مضبوط اجتماعیت درکار ہے۔ مسلمانوں نے ابھی تک حضورؐ کی شان میں عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں اب ضرورت ہے کہ اسلام کو اپنی بھرپور ذہنی صلاحیتوں کا عطیہ دیا جائے اور بے مثال اخلاق وقربانی کے ذریعہ ایک نئے عہد کی تعمیر کے لئے آگے آیا جائے۔ منصب نبوت کی تکمیل ہو چکی ہے لیکن کار نبوت باقی ہے ہمیں دو کام بڑے پیمانے پر کرنے ہیں۔ ایک ناواقف دنیا کو حضورؐ کی سیرت وشخصیت دعوت وپیغام سے واقف کرنا ہے اور دوسرے معلوم دنیا کی اس بنیاد پر تہذیب وتعمیر کرنی ہے تب ہی کار نبوت کی تکمیل ممکن ہے اور لوگ حضورؐ کی عالمگیر رحمت ورافت سے مستفیض ہو سکتے ہیں جو دنیا اور آخرت میں ان کے بھلائی کی ضامن ہے۔ کیا اکیسویں صدی میں ہم یہ کام کر سکیں گے؟

حضوراور ہم

خوداحتسابی کی ضرورت

ہم جو پیدائشی اور پشتینی مسلمان ہیں، جسے اسلام وراثت میں ملی ہے دین اورحضورؐ سے محبت رکھنے کے باوجوداس کی قدرو قیمت سے ناواقف ہیں اوراس کا صحیح طور پرحق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس وقت اسلام ساری دنیا میں مغلوب ومہجور ہے ان ملکوں میں بھی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔اور ان جگہوں پر بھی جہاں اقلیت میں ہیں۔کچھ ملک اورعلاقے ایسے ہیں جہاں انہیں اپنی علامتوں کے ساتھ جینے کی آزادی نہیں ہے۔اذان،نماز، جمعہ، جماعت،روزہ ،زکوۃ اور حج جیسے فرائض کی آزادی نہیں ہے۔انہیں حرام کرنے اورحرام کھانے پرمجبور کیا جاتا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق چین میںمار اورکئی دیگر جگہوں کے مسلمان سخت آزمائشی دور سے گذر رہے ہیں اوراپنے ایمان واسلام کو چھپا کروہاں جینے پرمجبور ہیں یا پھرمرتد ہورہے ہیں۔

کچھ جگہوں پرانہیں یہ آزادی میسر ہے،مگر بہت کم لوگ اس پر کاربند نظر آتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ نماز کا اسلام میں وہی مقام ہے جوایک زندہ جسم میں سانس کا ہے۔سانس چل رہی ہے گویا آدمی زندہ ہے سانس بند ہوگئی آدمی مرگیا جب ایک بندہ نماز ادا کرتا ہے گویا اس کے اندر ایمان کی سانس چل رہی ہے اوراسلام اس کے اندر زندہ ہے۔نماز نہیں ادا کیا گویا اسلام اس کے جسم وجان سے نکل گیا۔اب آپ مسلمان سوسائٹی پرنظر دوڑائیں۔اتنی تاکید اورتبلیغ کے باوجودمشکل سے پورے ہندوستان میں دس فیصد مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔نوے فیصداس سے غافل ہیں۔اس میں تعلیم یافتہ،غیرتعلیم یافتہ،شہری دیہاتی عورت مرد،امیرغریب سب شامل ہیں۔

اسلام علم کا دوسرانام ہے۔اللہ نے آدمی کو پیدا کیا اس کواپنا خلیفہ بنایا۔دنیا کی تمام مخلوق حتی کہ قدسی صفت فرشتوں پراس کوترجیح دی،ان سے انسان کاسجدہ کروایا کیوں کہ انسان کوان سے اونچے منصب پرفائز کیا تھا اوراس کوعلم میں برتری دی تھی۔خلافت علم کے بغیر بلکہ مکمل اور برترعلم

کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مسلمان اسلام کے علم بردار ہیں تو انہیں ساری دنیا میں علم کا بھی علم بردار ہونا چاہئے۔مگر آج صورتحال کیا ہے۔ساری دنیا میں جو قوم علم سے سب سے زیادہ محروم اور جہالت میں مبتلا ہے وہ مسلمان ہیں۔مسلمانوں کی عالمی پسماندگی اور درماندگی کی یہ سب سے بڑی وجہ ہے۔

مسلمانوں نے علم کو دینی اور دنیوی دو خانہ میں بانٹ دیا ہے اور کہا کہ دینی علم، علم ہے جس کا سیکھنا ضروری ہے، دنیوی علم سیکھنا ضروری نہیں ہے۔اس اعتبار سے کم سے کم مسلمانوں کو دینی علم تو حاصل ہونا چاہئے اور انہیں اس حد تک خواندہ اور پڑھا لکھا ہونا چاہئے۔جبکہ آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمان مرد و عورت کی غالب اکثریت 90.95% دینی علم سے بالکل بے بہرہ ہے۔خود ہندوستان میں ایسے کروڑوں مسلمان مرد و عورت ہیں جو پہلا اور دوسرا کلمہ نہیں جانتے مسلمانوں کی موجودہ معاشی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی پسماندگی اور کمزوری کی سب سے بڑی وجہ ان کی جہالت ہے جس نے بیس کروڑ کی مضبوط آبادی والی قوم کو بے وزن اور دوسروں کے رحم و کرم پر جینے پر مجبور کر دیا ہے۔

اسلام نے علم کو دو خانے میں بانٹا ہے۔ایک علم نافع اور دوسرا غیر نافع۔اگر آپ موجودہ علم کے تمام تر شعبہ جات کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تمام علوم نافعہ میں آتے ہیں جس نے انسانوں کے مسائل حل کئے ہیں اور انہیں سہولت اور بہتر کارکردگی سے ہم کنار کیا ہے۔جس نے انسان کی بڑھتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اس کی مدد کی ہے۔اس لئے ان تمام علوم کا حصول اور اس میں درجہ کمال کا حصول ہر مسلمان کا مطمح نظر ہونا چاہئے۔علمی برتری کسی قوم کو دنیا میں امین و امام بناتی ہے اور مسلمانوں کو اس منصب کے حاصل کرنے میں آج کی اصطلاح میں سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ، تمام تکنیکی علم، جغرافیہ، معاشیات، سیاست، نفسیات اور جدید علم کے تمام شعبہ جات علم نافع کی تعریف میں آتے ہیں اور اس پر قائم رہنے کے لئے ہمیشہ علمی برتری کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔

آج یورپ اور امریکہ جدید علوم کے امام بنے ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا پر ان کی معنوی اور عملی چودھراہٹ قائم ہے اور پوری دنیا ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر سانس لینے سے بھی قاصر ہے۔وہ جو اقدار اور طرز معاشرت چاہتے ہیں دنیا اس کو جدید فیشن سمجھ کر اپناتی ہے کیونکہ وہ غالب

قوم کا خاصہ اور کلچر ہے۔ ہم جب اس پر تنقید کرتے ہیں تو دنیا ہماری بات سننے ماننے کے بجائے ہمیں خود ہی رجعت پسند اور دقیانوسی قرار دیتی ہے اور خود مسلمانوں کا سواد اعظم ان چیزوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ بڑے بڑے متقی اور اللہ والوں کی اولادیں دہریہ اور بے دین ہو کر عملاً مرتد ہو رہی ہیں۔

عوام وخواص دونوں حلقوں میں عملا اسلام سے بے اعتنائی اور دوری بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ ان کی سوچ، اخلاق، کردار، عادات، منہاج اور معاشرت سب پر بے دینی کا رنگ غالب ہے جس کی سرحدیں کفر وشرک سے ملتی ہیں جس کو دیکھ کر غیر اسلامی قوتوں کے منہ میں رال آتا ہے کہ وہ انہیں پھر سے اپنے دین میں واپس لے جائیں گے اور وہ انہیں گھر واپسی کی دعوت دے رہی ہیں۔

یہی وقت ہے کہ ہمیں حضورؐ کی سیرت وسنت کو اپنی زندگی کا اسوہ بنانا چاہئے اور آپ کی دامن رحمت میں پناہ لینے کے لئے دوڑ پڑنا چاہئے۔

آیئے ہم سب حضورؐ کے پاس چلیں جہاں سے اکتساب فیض کر کے اپنی اندھیری راہوں کو پرنور بنالیں جس کی روشنی میں صراط مستقیم پر چلنا آسان ہو جائے۔

حضور ﷺ کو اللہ نے غار حرا میں سب سے پہلا حکم کیا دیا۔ پڑھو اللہ کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا۔ کتاب اور قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ بات بتائی جو تم نہیں جانتے تھے۔ خدا شاہد وغائب دونوں کا علم رکھتا ہے اور ایک مومن کو دونوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ نے جو علم دیا ہے اس کو بھی مانو اور جو دینے والا ہے اس کو بھی مانو۔ اس طرح علم کے بغیر بندگی اور خلافت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا علم حاصل کرو۔ اس علم کا مبنیٰ نبی کریم اور اللہ کی کتاب ہے۔ اس کی رہنمائی میں دنیا برتنی ہے اس کی رہنمائی میں دین حاصل کرنی ہے۔ اس میں ہی فلاح وکامیابی ہے اللہ کی رضا اور نجات ہے۔ جہنم سے بچنے اور جنت میں جانے کا راستہ ہے۔

توحید علم کی انتہا ہے جو رسالت پر ایمان لائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ ایک آدمی دنیا کی بھول بھلیاں میں ایسے گم ہو جائے گا کہ اجناس ومظاہر کو ہی الہٰ ومالک سمجھ بیٹھے گا اور خالق اجناس ومظاہر تک اس کی رسائی نہیں ہو سکے گی نتیجتاً خود پر بھی ظلم کرے گا اور دوسروں کو بھی ظالم بنائے گا اور

انصاف واعتدال کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔

آج جو صورتحال ہے وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کی مشرک اور ملحد قوموں کا رویہ ہمارے سامنے ہے وہ ایسے باؤلے ہو گئے ہیں کہ آنکھوں دیکھی حقیقت کے ادراک سے بھی قاصر ہیں اور اتنے گم کردہ راہ ہیں کہ انہیں سمت و منزل کا پتہ نہیں چلتا۔

حضورﷺ نے فاران کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بتایا کہ وہ ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہیں جس سے پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ سکتے ہیں جب کہ ان کے سامنے جو لوگ کھڑے ہیں وہ ایک جانب دیکھ سکتے ہیں۔ لہذا وہ نہیں جانتے کہ پہاڑ کی دوسری جانب کیا ہے؟ آپ کی صدق و امانت انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ آپ جو کہیں گے سچ کہیں گے۔ پھر آپ نے ان کو باخبر کیا کہ تم جس شرک میں مبتلا ہو وہ غلط ہے۔ اللہ ایک ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ نے مجھے تمہاری ھدایت پر مامور کیا ہے۔ لہذا میری رسالت اور رہنمائی تسلیم کرو اور خدا کے حکم اور میرے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرو۔ یہی تمہارے نجات و فلاح کی راہ ہے۔

یہ دعوت ان کے سابقہ تصورات اور عقیدے پر بجلی بن کر گری کسی نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن لوگوں نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

یہ دعوت صرف اس نظام عقیدہ کے خلاف نہیں تھی۔ بلکہ اس نظام عقیدہ نے جو معاشرت، جو تہذیب، جو نظام سیاست جو نظام معیشت اور جو ضابطہ اخلاق بنایا تھا جو طرز حیات، جو فنون لطیفہ اور جو پاور سنٹر تشکیل کرتے تھے اس کے خلاف تھی۔ لہذا ہر کوئی اپنی دفاع میں دوڑ پڑا اور مزاحمت کی مضبوط دیوار کھڑی کر دی۔

پھر کیا تھا قدم قدم پر مزاحمت شروع ہوگئی۔ کیا گھر کیا باہر دوست، رشتہ دار، عزیز، ہم سایہ، تاجر، مہاجن، چودھری پٹواری سب مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ طنز، استہزا، گالی گلوج، تشدد اور سازش سب شروع ہوگئی۔ ایک طرف حضور کی ذات دوسری طرف پورا مکہ۔ سودے بازی شروع ہوئی۔ قبیلہ اور خاندان پر دباؤ ڈالا جانے لگا۔ حضور نے سب کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا۔

اگر یہ لوگ ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی لا کر رکھ دیں تب بھی یہ کام نہیں رکے گا۔

تب لوگوں نے بائیکاٹ کی سیاست شروع کی اور آپ کے پورے خاندان کو محصور کر کے آپ کے حمائتیوں کو آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کیا مگر قبائلی اخلاقیات نے چند استثنا کے سوا اس کے باوجود کہ وہ براہ راست آپ پر ایمان نہیں لائے تھے مگر مشکل حالات میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔

جب دیکھا کہ اب کوئی حربہ کارگر نہیں ہو رہا ہے تو آپ کے قتل کی سازش رچنی شروع کی ۔ اسی بیچ اللہ نے مدینہ میں آپ کے لئے قبولیت کا ماحول پیدا کر دیا اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے ۔ انبیا کی لمبی تاریخ رہی ہے ۔ حضرت آدم سے حضور تک بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا کے تمام حصوں، قوموں ملکوں اور زمانوں میں آئے ۔ قرآن کے بقول کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی رسول نہ آیا ہو ۔ حضور سب سے آخری نبی ہیں ۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ۔ آج کی تاریخ میں کوئی نبی ہونے کا دعویٰ کرے یا کوئی کسی کو نبی مانے دونوں جھوٹا ہے ۔ آپ نے فرمایا کسی نبی کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا آپ کو ستایا گیا ۔ طائف میں تو لوگوں نے حد ہی کر دی تھی جس سے زمین و آسمان تھرا اٹھے ۔ اللہ کے نبی کو اشارہ ہوا آپ بددعا کر دیں تو انہیں دو پہاڑوں کے بیچ پس کر ہلاک کر دیا جائے مگر آپ نے اس سخت آزمائشی حالات میں بھی امید ورجا سے بھری بات کہی آپ نے کہا میں نبی رحمت ہوں، نبی عذاب نہیں اور دوسری بات یہ کہی کہ یہ نہیں تو ان کی آئندہ نسلیں اس دین کو سمجھیں گی اور مانے گیں اور بالکل ایسا ہی ہوا ۔ چند سالوں میں ہی دیکھتے دیکھتے حالات بدل گئے اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے ۔

حضورؐ کی مدنی زندگی بھی آرام وراحت سے نہ گذری ۔ مسلسل اندرونی اور بیرونی حملے ہوتے رہے ۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا رہا ۔ مگر حضور کی یکسوئی اور پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی ۔ ان تمام مرحلوں میں آپ کی ذات اللہ کے فضل اور الٰہی ھدایات کی بدولت نیز اپنے جانثار ساتھیوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں پہاڑ کی طرح جمی رہی اور ہر مشکل گھڑی میں اللہ کا یہ فرمان آپ کو مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم رکھتا رہا کہ لاتحزن ان اللہ معنا، گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے یہ ایسا عروۃ الوثقیٰ یعنی مضبوط سہارا تھا جس نے نہ صرف حضور اور آپ کے ساتھیوں کو مشکل ترین حالات میں ثابت قدم رکھا بلکہ جس نے آپ کو کامیابی سے ہم کنار کیا ۔

حضور جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اس وقت آپ نے لوگوں سے کہا میں تمہارے سامنے دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت ۔تم اگر ان دونوں کو سختی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ اور ناکامیاب نہیں ہو گے۔

آپ کی یہ دونوں چیزیں اس وقت ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان دونوں چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور اس سے کس درجہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔اگر ہم نے اس کی ایماندارانہ پیروی کی تو ہم لاکھ آزمائشی حالات کے باوجود کامیاب اور فلاح یافتہ ہوں گے اور خدانخواستہ ہمارے ہاتھ سے قرآن وسنت کی رسی چھوٹ گئی تو کوئی بھی ہم کو نقصان اور گمرہی سے نہیں بچا سکتا۔

آج کی تاریخ میں یہ سوال ہر مسلمان مرد اور عورت کے سامنے ہے اور اسے انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کا جواب دینا ہے۔ہم سب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا ہم حضور کے وفادار ہیں اور آپ کے دین ودعوت کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی سیرت وسنت کو اختیار کرنے کے لئے بغیر کسی دباؤ اور دبش کے تیار ہیں۔

غیر مسلم دنیا کو حضورؐ کی دعوت سے کیوں خوف آتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ غیر اسلامی دنیا کس شخص سے سب سے زیادہ ڈرتی ہے اور کیوں؟ حضورؐ کا نام آتے ہی ایوان کفر میں زلزلہ آجاتا ہے ہے اور آپ کی سادگی اور صداقت سے ان کی ملمہ سازی اور جھوٹ کے واضح ہونے کا خوف ان پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ وہ چاہتے کہ ہیں نور محمدی کو اپنے پھونک سے مٹا دیں کیوں؟ علامہ اقبال نے آپ کی دین وشریعت کی خوبیاں گناتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

حافظ ناموس زن ، مردآزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع کی غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیاہے فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

لہذا پورے ابلیسی لاؤلشکر کے ساتھ اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ لوگوں کی آنکھوں سے اس آئین کو پوشیدہ رکھا جائے اور لوگوں کو اس سے ڈرایا جائے ورنہ ان کی چودھراہٹ خاک میں مل جائے گی۔

یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جو علمی اور سائنسی انقلابات آئے اور نوآبادیاتی نظام کے تحت انہیں دنیا کے اقوام پر جو سیاسی تسلط جمانے کا موقع ملا اور سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں نے جس طرز سیاست اور طرز تمدن کو فروغ دیا، دنیا نے یہ سمجھا کہ اب اس نے مذہب کا خاتمہ کر دیا ہے اور ایک ایسی طرز تمدن وسیاست کی بنا رکھ دی ہے جس میں مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا مذہب کے دائرے کو محدود کر کے اس کو ہر طرح کے اجتماعی معاملات سے بے دخل کر دیا گیا۔

دنیا کی تمام مذاہب واقوام نے یکے بعد دیگرے اس تصور کو تسلیم کرلیا ور ایک غیر خدا پرستانہ طرز معاشرت وسیاست وقت کا چلن بن گئی۔مگر اہالیان اسلام نے اس تصور کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس فکر کا ڈٹ کر علمی اور عملی مقابلہ کیا اور اس فکر کے تار و پید بکھیر کر رکھ دیئے۔ اس سے گھبرا کر اہل کفر نے طنز و استہزا اور شب وشتم کی روش شروع کی اور اہل ایمان کو بدنام کرنے کی نت نئی سازشیں رچی جانے لگیں۔

جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل بہت تیز ہوتا ہے اور وہ اندرونی کش مکش اور تضاد کی شکار ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں اندرونی اور بیرونی سازشیں اس کو مزید کمزور اور بے وزن بنانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں تاکہ انہیں بدنام اور ذلیل کیا جائے۔ اس پوری مہم کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کمیونیٹی میں ایک counter narrative پیدا کیا جائے تاکہ انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ رہے اور وہ من مانے ڈھنگ سے ان کی آبادیوں اور وسائل کو لوٹتے رہیں۔

اگر آپ موجودہ مسلم دنیا پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت بہت واشگاف طریقہ سے نظر آئے گی۔

اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں امید کی چند کرنیں ان قدسی نفوس میں نظر آتی ہیں جو اشک سحر گاہی سے وضو کرتے ہیں اور اب تک اپنے اندر شرار آرزو کی چنگاری جگائے ہوئے ہیں اور بیداری امت کے لئے کوشاں ہیں جس دن وہ کھڑے ہوگئے احتساب کائنات کا عمل شروع ہوجائے گا اور لات ومنات کے خود تراشیدہ بت دھراشائی ہوجائیں گے۔

حالانکہ یہ آواز بہت کمزور ہے اور خود مسلمانوں کے سواد اعظم نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے تاہم غیر اسلامی قوتیں اس سے واقف ہیں۔ لہذا وہ ہر نوع اس کا راستہ روکنا چاہتی ہیں۔ ان کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اس فکر کا پاور ہاؤس کہاں ہے؟ اس فکر کا دوہی پاور ہاؤس ہے ایک خدائے واحد کی ذات اور دوسرا حضور سرور کائنات کی سیرت وشخصیت۔ خدا کی کوئی مادی تجسیم نہیں ہے اور وہ کسی نہ کسی طور پر خدا کو مانتے ہیں اس لئے اس کا مذاق اڑانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لہذا انہوں نے اپنے دل کا بھڑاس نکالنے اور اپنی خباثت نفس کا مظاہرہ کرنے کے لئے حضورؐ کی ذات کو نشانہ بنانے کا مذموم سلسلہ شروع کیا ہے۔

حضور کے خلاف اہل کفر کی چیرہ دستیاں

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اہل کفر کا یہ ہمیشہ سے آزمودہ نسخہ رہا ہے حضورؐ کی حیات طیبہ میں مکہ میں آپ کو طرح طرح کے برے ناموں سے پکارا، آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر طنز واستہزا کے تیر چھوڑے، آپ کے سر پر اونٹ کا گندا اوجھ لید سمیت ڈال دیا، آپ کے گردن میں رسی باندھ کر گلا گھونٹنے کی کوشش کی طائف میں آپ کو گالیاں دی گئیں اور پتھر مارے گئے۔ مدینہ میں آپ کو اونچی جگہ سے دھکیلنے اور زہر دے کر مارنے کی سازش کی گئی۔

آپ کی بیٹیوں کو طلاق دلوایا گیا۔ آپ کی پاک باز شریک حیات پر بہتان تراشی کی گئی۔ غرض وہ کون سا طریقہ تھا جس کے ذریعہ آپ کو ایذا نہیں پہنچائی گئی مگر ان تمام مرحلوں میں آپ نے صبر وشکر کی روش اختیار کی اور کمال ضبط سے کام لیا اور آپ کے جانثار ساتھیوں نے بھی نہایت ضبط ومتانت کا ثبوت دیا اور کبھی جبر وتشدد سے کام نہیں لیا۔ لہذا آج حضورؐ کی شان میں جس طرح کی گستاخیاں کی جارہی ہیں وہ نئی نہیں ہیں بلکہ یہ ہمیشہ سے بولہبی قوتوں کا وطیرہ رہا ہے۔ علامہ اقبال

نے کیا خوب کہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اگر آپ قدیم وجدید عیسائی اور یہودی لٹریچر کا مطالعہ کریں اور مستشرقین کے دفتر کو کھنگالیں تو وہاں آپ کو جھوٹ وافترا کا پلندہ ملے گا وہ کون سی دشنام طرازی ہے جو حضورؐ کی شان میں نہیں کی گئی ہے۔ آپ کی سیرت وکردار کو داغدار کر کے پیش کرنے کے لئے انہوں نے جس طرح تحقیق کے جوہر دکھائیں اور اپنے اندر کی خباثت کو ظاہر کیا ہے اس سے حضورؐ سے ان کے اندر جو ڈر، تعصب اور برہمی ہے وہ ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا سارا زور اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کا حضورؐ سے جو والہانہ لگاؤ، جانثاری اور محبت ہے وہ کم اور ختم کیا جائے تا کہ ان کے روح وجسم اور ذہن وجذبات پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے ۔ پھر انہیں وہ جس طرح اور جس طرف چاہیں گے موڑ دیں گے۔ بصورت دیگر ان کی ساری سازشیں اور کوششیں کبھی بارآور نہیں ہو سکتی ہیں ۔ یہ آزادی اظہار رائے اور فن اور فکر کی آزادی نہیں بلکہ اس کا غلط اور بیہودہ استعمال ہے جس کی کسی آزاد اور ذمہ دار معاشرے میں اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

پچھلے ایک ہزار سال میں یہودی اور عیسائی مذہبی شخصیات ، اداروں ، شاعروں ادیبوں اور فنکاروں نے ایسی سینکڑوں تصانیف، خاکے ،افسانے ، ڈرامے کہانیاں، نظمیں ، تصویریں ،کارٹون اور ڈرامے لکھے بنائے اور اسٹیج کئے ہیں جس میں کسی نہ کسی طور پر حضورؐ کی ہجو کی گئی ہے اور آپ کے سیرت وکردار کو داغ دار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ مسلمانوں نے کبھی کسی یہودی اور عیسائی مذہبی شخصیات پر بھولے سے بھی زبان درازی نہیں کی ہے ۔ یہودی اور عیسائی حضورؐ کے منکر ہیں جبکہ مسلمان حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل میں مبعوث دیگر انبیاء پر اسی طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح یہودی اور عیسائی لاتے ہیں کیونکہ وہ سب کے سب اللہ کے نبی تھے۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ ہم نبیوں کی وحدت میں کوئی فرق نہیں کرتے بلکہ اللہ کی طرف سے جو بھی نبی آئے ہیں اور جہاں بھی آئے ہیں اور جب بھی ،جس قوم اور زبان میں آئے ہیں ہم سب کی تصدیق کرتے

ہیں اور سب کا احترام کرتے ہیں ان تمام انبیا پر ایمان اور ان کا احترام ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

آج ہندوؤں ، بدھوں، جینیوں ،چینیوں، جاپانیوں اور چند دیگر اقوام میں ایسے لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً حضورؐ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اور قابل اعتراض بات کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض مسلمان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے ہیں اور وہ تشدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ہم کسی تشدد آمیز کارروائی اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کرتے ہیں ۔ایسے تمام موقعوں پر اگر کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو ملک کے دستور اور قانون کی رو سے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیئے نہ کہ قتل اور تشدد پر آمادہ ہونا چاہئے۔

ردعمل نہیں مثبت عمل کی ضرورت

میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسے جذباتی ماحول میں جب کہ مسلمان شرک و بت پرستی کو غلط مانتے ہیں ۔غیر مسلموں کی جو مقدس شخصیات ہیں ۔ان کے دیوی دیوتا ہیں ۔ان کو برا بھلا نہیں کہتے ۔قرآن نے صاف صاف الفاظ میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ان معبودوں کو جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اور احترام کرتے ہیں ۔ان کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے کجا یہ کہ ان کا مذاق اڑانا اور ان کی تضحیک کرنا کیونکہ قرآن نے یہ کہا اگر تم ان معبودوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ پلٹ کر نادانی میں خدا کی شان میں گستاخیاں کریں گے۔

اپنے باپ کے احترام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کے باپ کا احترام کریں ۔اگر آپ کسی کے باپ کی بے عزتی کریں گے وہ بھی آپ کے باپ کی بے عزتی سے باز نہیں آئے گا ۔اللہ کے رسول نے فرمایا کوئی آدمی اپنے باپ کو گالی نہ دے ۔صحابہ نے پوچھا کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جو اپنے باپ کو گالی دے گا ۔آپ نے فرمایا جب تم کسی کے باپ کو گالی دو گے تو پلٹ کر وہ بھی تمہارے باپ کو گالی دے گا ۔گویا تم ایسی حرکت نہ کرو کہ لوگ تمہارے ماں باپ کی بے عزتی یا گالی گلوچ پر آمادہ ہو جائیں۔

اسلام نے جو تہذیب اور شرافت سکھائی ہے اگر لوگ ان اصولوں کی پیروی کریں تو مختلف اور متضاد عقائد و معاشرت میں بھی لوگ باہمی احترام اور خیر سگالی کے ماحول میں رہ سکتے ہیں

اور کبھی بھی دو قوموں اور ان کے افراد کے درمیان ان امور پر تصادم نہیں ہوگا۔ آپ کا دین آپ کے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلیم کریں۔ برداشت کریں۔ ایک دوسرے کو آزادی دیں اور ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کریں تو تمام تر تضاد واختلاف کے باوجود پر امن بقائے باہم کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

ایک تکثیری سماج میں ایک Plural Society میں یہ ایک Golden rule ہے جس کا اگر ایمانداری سے پالن کیا جائے تو ہمارے سماج میں مذہبی بنیاد پر کبھی کوئی ٹکراؤ نہیں ہوگا مگر کوئی شخص، سماج، سیاست یا دھرم اس سنہرے اصول کی خلاف ورزی کرے گا تو سماج میں بدامنی اور انتشار پھیلے گی جو دیش کی ترقی میں بادھا پیدا کرے گی اور ساری دنیا میں دیش کی بدنامی ہوگی۔ پھر کوئی بھی اس دیش میں پونجی نہیں لگائے گا۔ دیش میں پیداوار اور روزگار کے مواقع محدود ہوں گے اور ہم غریبی اور پچھڑے پن سے باہر نہیں نکل پائیں گے۔

لوگ اکثر مسلمان پر پھبتی کستے ہیں کہ مسلمانوں میں Tolerance نہیں ہیں۔ وہ دوسرے سماج کے ساتھ Adjust کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یہ بددیانتی پر مبنی ایک جھوٹ ہے جو اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے اسلام کی شبیہہ بگاڑنے کے لئے تسلسل کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ مگر جس کو اسلام کا ذرا بھی شدبد ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اسلام وہ پہلا اور اکیلا دین ہے جس نے دین کے مقابلے میں جبر کی نفی کی ہے دوسرے اس نے صاف صاف کہا کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ ایک گروہ ہوگا جو اس دین ودعوت کو قبول نہیں کرے گا لہٰذا ہر دو گروہ کو اس نے ھدایت دی کہ ایک دوسرے کے معاملات دین میں مداخلت نہ کیا جائے تمہارا دین تمہارے لئے او رہمارا دین ہمارے لئے۔ دین کے رد وقبول کو اس نے لوگوں کے آزادنہ مرضی پر چھوڑا ہے لہٰذا اسلام کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دوسرے دین کو برداشت نہیں کرتا ہے یا دوسری قوموں کے ساتھ Adjust کرنے اور پر امن بقائے باہم کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک اتہام ہے جو بددیانتی پر مبنی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کو برداشت کرنے اور ان کو اپنے دین پر عمل کرنے کا موقع دینے میں نہایت تنگ دل ہیں ازمنہ وسطیٰ میں ہی نہیں جبکہ اسلام، عیسائیت، یہودیت اور دیگر مذاہب کے حاملین کے درمیان سخت سیاسی کش مکش تھی اس روشن خیال دور میں یوروپ اور

امریکہ کے جدید تعلیم یافتہ تہذیب یافتہ ۔لبرل اور سیکولر ممالک میں جہاں عریانی فحاشی، اباحیت، لواطت ،لسبت کی کھلی چھوٹ ہے ایک مسلمان خاتون کو اسکارف باندھنے اور حجاب میں رہنے پر پابندی لگائی جارہی ہے۔

مسلمانوں کو اذان دینے اور نماز پڑھنے سے روکا جاتا ہے۔وہ اپنے گھر میں انفرادی اور عائلی معاملات میں بھی شریعت کے مطابق عمل نہیں کرسکتے ۔یہ لوگ مسلمانوں پر منہ آتے ہیں کہ مسلمانوں میں برداشت اور رواداری نہیں ہے یہ وہی بات ہوئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔ میں یہاں صرف اصول نہیں بتارہا ہوں حضوؐر کی سیرت سے اس کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔حضور جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آگئے تو مکے والوں نے یہاں ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور پے در پے حملے کر کے آپ کی اس چھوٹی سی جماعت اور اس بستی کو نیست و نابود کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔اس حال میں مکے میں قحط پڑا تو آپ نے پانی برسنے کی دعاء کی اور مکے والوں کے لئے امدادی سامان بھیجا۔صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے مکے والوں سے جو صلح کی ہے اس کے بعض شرائط ایسے تھے جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتے تھے۔مثلاً جب صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو آپؐ نے لکھوایا محمد رسول اللہ کی طرف سے یہ صلح نامہ کیا جاتا ہے ۔اس پر عروہ بن سہیل جو مکے والوں کی طرف سے صلح کرنے آئے تھے نے اعتراض کیا کہ میں صلح محمد رسول اللہ سے نہیں محمد بن عبد اللہ سے کررہا ہوں۔اس کی وجہ سے صحابہ میں کافی بے چینی پیدا ہوئی مگر حضور نے صلح کی خاطر اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ مٹادیا اور محمد بن عبداللہ لکھوایا۔پھر ایک شق یہ تھی کہ ہمارا جو آدمی آپ کے پاس جائے گا اسے واپس کرنا ہوگا مگر آپ کا کوئی آدمی آئے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔حضورؐ نے اس کو بھی تسلیم کرلیا۔اس کے بعد بھی کوئی اگر یہ کہتا ہے کہ اسلام میں تحمل، برداشت، صلح جوئی اور امن پسندی اور دوسری قوموں کے ساتھ رہنے کا جذبہ نہیں ہے تو اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوسکتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ بعض سیاسی اور دیگر وجوہات سے مسلمانوں کے بعض گروہوں میں عدم تحمل کا رجحان بڑھا ہے۔

یہ دراصل اسلام کا قصور نہیں ہے بلکہ اس وقت جو جارحانہ قوم پرستی کا رجحان ہے اس کا رد

عمل ہے۔ہم اسے صحت مند سوچ نہیں مانتے Reactionary Approach کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔اس لئے ہم مسلمانوں میں وہ لوگ جو شدت جذبات سے مغلوب ہوکر تشدد آمیز کاروائی پرآمادہ ہوجاتے ہیں یا شرافت وسنجیدگی کے بجائے دشنام طرازی کرنے لگتے ہیں ان کے رویہ کو غلط مانتے ہیں اور ایسے کسی رجحان کوملت کے لئے نقصاندہ مانتے ہیں بلکہ دراصل اس طرح وہ اسلام دشمن طاقتوں کے جال اور چال میں پھنس جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کواسلام کو بدنام کرنے اور مسلم آبادیوں پرحملہ کرنے اور ان کی جان مال عزت آبرو سے کھیلنے کا جواز مل جاتا ہے۔ہمیں موجودہ ماحول میں کمال صبر وضبط سے کام لینا ہوگا اور انتہائی Provocative atmosphere میں بھی اپنے جذبات پرقابو رکھنا ہوگا۔خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جواسلام اور مسلمان کے دشمن ہیں وہ پوری طرح منظّم اور تیار بیٹھے ہیں کہ جیسے ہی کوئی جواز ملے وہ ان پرٹوٹ پڑیں اور ان کوتہس نہس کردیں۔یہ اکیسویں صدی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ایک بار پھر ہم مکی دور میں ہیں مکہ میں تمام ظلم وجور کے مقابلے حضورؐ کے ساتھیوں نے کمال صبر وضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔اور اللہ نے حکم دیا تھا اپنے ہاتھ روکے رکھو۔آج پھر وہی وقت ہے ہمیں پرعزیمت صبر کا مظاہرہ کرنا ہے اور طاقت اور جوابی کاروائی کی صلاحیت رکھنے کے باوجود جبر وتشدد تو دور کی بات ہے، ہاتھ نہیں اٹھانا ہے۔

ہندوستان میں گاندھی جی کے اہنسا کی بڑی تعریف کی جاتی ہے گاندھی جی نے یہ اہنسا کہاں اور کس سے سیکھی۔خان عبدالغفار خان جن کولوگ سرحدی گاندھی کہتے ہیں نے کہا گاندھی جی نے اہنسا کا درس حضورؐ کی مکی زندگی سے سیکھا۔گاندھی جی جب ساوتھ افریقہ سے واپس ہندوستان آئے اور اس ملک کی قیادت سونپی گئی۔پہلے انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور یہاں کی جدوجہد کی تاریخ دیکھی۔انہوں نے دیکھا کہ عوام غریب، ان پڑھ، بے شعور، منتشر اور بہت ڈرے ہوئے ہیں۔یہاں جومزاحمتی گروہ ہیں وہ عوام کے تعاون کے بغیر محض چند پرجوش افراد کے سہارے اپنی عسکری تحریک چلارہے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ انگریزوں کی فوج اور طاقت کے مقابلے ان کی طاقت محدود ہے اور ان کوعوامی تائید وحمایت بھی حاصل نہیں ہے۔اس لئے بھی پوری جرات وبہادری اور بے پناہ قربانی کے جذبے کے باووجود وہ ہر معرکے میں ہار جاتے ہیں اور ان کی ہر ہار انگریزی

اقتدار کو مضبوط کر دیتی ہے۔

پہلا کام گاندھی نے یہ کیا کہ لوگوں کو جوڑا، ان کے اندر بیداری پیدا کی، ان کے دل سے خوف نکالا اور ان کو ظلم سہنے اور جوابی کاروائی نہ کرنے کا سبق پڑھایا۔ اس کو عدم تشدد یا اہنسا کہتے ہیں۔ اور اس اہنسا کے ہتھیار سے انہوں نے ہنسا کرنے والوں کو بے نقاب کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ہندستانی ہی نہیں بہت سے غیر ملکی لوگ گاندھی کے موقف کو سراہنے لگے اور انگریزوں پر ہندوستان کی آزادی کے لئے عالمی دباؤ پڑنے لگا۔ بالآخر ملک آزاد ہوا۔

لہذا ہنسا کے بجائے اہنسا وہ ہتھیار ہے جو جنگ اور امن دونوں حالات میں کارگر ہے ۔حضورؐ کے اسوہ سے اس کی تائید ہوتی ہے ۔لہذا وقت اور حالات کے تحت ہمارے لئے یہ کارگر ہتھیار ہوسکتا ہے۔ ہم اگر دو چار لوگوں کو مار بھی دیں تو کیا اس سے کفر مٹ جائے گا یا وہ مقصد حاصل ہوجائے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ جولوگ کسی نوع کے تشدد پر یقین رکھتے ہیں۔ انہیں از سر نو اپنی Strategy کا جائزہ لینا چاہئے ۔موجودہ حالات میں تشدد اور دہشت گردی کا راستہ غلط ہی نہیں، غیر اسلامی ہے اور یہ اسلام اور انسانیت کے خلاف ایک سنگین جرم ہے۔ پوری مسلم سوسائٹی کو ایسے عناصر کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور پوری قوت سے ایسی حرکتوں کو روکنے کے لئے آگے آنا چاہئے۔

اس وقت عالمی استعمار اور صیہونی طاقتوں نے مل کر جو چال چلی ہے اور جو رن نیتی بنائی ہے اس نے پوری مسلم دنیا کو آگ اور خون کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔ ان کے ملک اور آبادیاں تباہ ہورہی ہیں ان کے وسائل کی لوٹ مچی ہے۔ برادر کشی نے جنگل کے جانوروں کو شرمندہ کر دیا ہے۔ ساری دنیا میں اسلام اور مسلمان کا وقار مجروح ہورہا ہے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، اپاہج مسافر، مقیم سب مارے جارہے ہیں۔ لوگ اپنی آبادیوں اور بستیوں میں محصور ہیں کروڑوں افراد اپنا گھر بار چھوڑنے اور رفیوجی بننے پر مجبور ہیں قدم قدم پر انسانی حقوق کی پامالی ہورہی ہے۔ مسلم دنیا میں حشر کا عالم بپا ہے۔ ہر جگہ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ہر شخص کی زبان پر الاماں الاماں کا ورد ہے۔ مگر بچاؤ اور پناہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے اسلام کے خیمہ کی طنابیں توڑ دی ہیں جس کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں ایک عالم بے پناہی میں آگئے ہیں۔

ایسے ماحول میں جب ان کے جذبات مجروح ہیں، وہ اندر سے مشتعل ہیں ان کو مزید برانگیختہ کرنے کے لئے کبھی ڈنمارک میں حضورؐ کا کارٹون بنا کر کبھی فرانس میں Caricature کر کے اور کبھی ہندوستان میں لغو اور بیہودہ بیان بازی کر کے مسلمانوں کے زخم پر نمک چھڑکنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں جب کوئی مسلمان اپنا آپا کھو دیتا ہے اور مار دھار پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ساری دنیا کی میڈیا ان ظالموں کی سرزنش کرنے کے بجائے مسلمانوں پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑتی ہیں اور اپنے دل اور ذہن کی ساری غلاظت لاکر پبلک پلیس پر ڈال دیتی ہیں جس کو دیکھنے کے بعد اقبال کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ

چہرہ روشن اندروں چنگیز تر

بظاہر سوٹ بوٹ میں ملبوس ہیں، اچھی شکل وصورت کے حامل ہیں۔ پڑھے لکھے اور مہذب لگتے ہیں۔ اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ عام معاملات میں متین اور سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ مگر جیسے ہی اسلام اور مسلمان کا نام آتا ہے اپنا جامہ اتار کر پوری طرح بھری مجلس میں ننگے ہو جاتے ہیں اور بڑی بے شرمی سے کہتے ہیں یہ تو فکر و خیال اور قول وعمل کی آزادی ہے۔ وہ آزدی کو اخلاق واقدار سے عاری مانتے ہیں۔ ان کے دوہرے معیار اور دوہرے چرتر کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ عام Discourse میں جب کوئی غیر اخلاقی بات کہی جاتی ہے تو اسے وہ Unparliametary مانتے ہیں اور ان کو کہنے سے منع کرتے ہیں۔ جب کہ پارلیامنٹ جمہوریت کی پنچایت کا نام ہے جس میں سرکار اور اپوزیشن دونوں عوام کے ووٹ سے چنی ہوتی ہے اور ان کو تنقید اور تبصرہ کی آزادی ہوتی ہے۔ وہاں وہ آزادی کو مشروط کرتے ہیں اور کچھ چیزوں کو صحیح نہیں مانتے۔ مگر سماجی اور مذہبی معاملات میں وہ خود کو ہر قید و بند سے آزاد مانتے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ ایک بے اصول ضابطہ اخلاق کے پابند ہیں۔ ان کا اخلاق بدلتے ہوئے فیشن کی طرح ہے۔ جہاں عریانیت ایک Style اور اباحیت ایک تہذیب ہے۔

بہر حال میں یہاں مسلمانوں سے ایک بہت ہی سنجیدہ اور عملی بات کہنا چاہتا ہوں۔

اسوۂ حضور کی پیروی اور صحابہ کے طریقے پر عمل کی ضرورت

قرآن نے حضورؐ کا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے کہ آپ تمام انسانوں کی طرف بشارت دینے والے اور انجام بد سے باخبر کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اگر دنیا کے نقشے اور عالمی آبادی پر نظر ڈالیں تو دنیا میں اس وقت کم وبیش دوسو ممالک ہیں اور سات ارب سے اوپر کی آبادی ہے۔ ان دوسو ملکوں میں پچاس باون ممالک وہ ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے یا جہاں ان کی اکثریت ہے اور سات ارب میں لگ بھگ پونے دوارب مسلمان جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ لگ بھگ سوا پانچ ارب وہ لوگ ہیں جو یا تو محمد ﷺ کو جانتے اور مانتے نہیں ہیں۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں جنہوں نے آج تک آپؐ کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ لہذا جب وہ آپؐ کو جانتے ہی نہیں تو ماننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے اور جب مانتے نہیں ہیں تو پھر وہ آپؐ کا احترام کیسے کریں گے۔ ٹھیک ہے تہذیب وشرافت کا تقاضا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ بدتمیزی نہ کریں بلکہ اجنبی لوگوں کے ساتھ بھی شریفانہ برتاؤ رکھیں۔

مگر میں یہاں ایک اصولی سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ حضورؐ کا احترام کس پر واجب ولازم ہے؟ اگر آپ قرآن وسنت کا مطالعہ کریں تو آپ کو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ آپ کا احترام مسلمانوں پر واجب ہے اور یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن نے مسلمانوں سے حضورؐ کے احترام کا مطالبہ کیا ہے۔ غیر مسلموں سے نہیں اور ان کو اس کی ھدایت وتعلیم دی ہے۔ جب تک کوئی آدمی آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ آپ کے مقام ومرتبہ کو سمجھنے سے قاصر ہوگا لہذا اس کا رویہ وہ نہیں ہوگا جو ایک مسلمان کا ہے۔ مکہ میں حضور کے ساتھیوں اور آپ کا انکار کرنے والوں کے برتاؤ سے یہ فرق اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے ایک شخص حضورؐ سے کہتا ہے کہ جب تک میں آپ پر ایمان نہیں لایا تھا آپ سے میں شدید نفرت کرتا تھا، مگر جیسے ہی آپ پر ایمان لایا آپ میری نظر میں دنیا کی محبوب ترین شخصیت ہوگئے ہیں۔ گویا ایمان نے اس کے فکر ونظر اور عقیدے اور اخلاق میں انقلابی تبدیلی پیدا کی، اس کے سابقہ اقدار کی جگہ نئے ایمانی اقدار نے جگہ بنالی اور اس کے دل کی دنیا بدل گئی اور جو چیز پہلے انتہائی ناپسندیدہ تھی وہ نہایت پسندیدہ بن گئی۔

صحابہ کرام حضور سے جس درجہ محبت کرتے تھے اور اس کی نادر مثالیں انہوں نے پیش کی

ہیں دنیا میں شاید ہی کسی شخص کو اتنے جانثار ساتھی میسر ہوئے ہوں گے۔

مکے میں جہاں ایک طرف حضورؐ پر ہر طرف سے اور ہر طرح کے دباؤ بنائے جارہے تھے اور پورا مکہ آپ کو اور آپ کی تحریک کو ملیا میٹ کرنے پر تلا ہوا تھا کفار مکہ نے حضور کے ساتھیوں کی جس طرح جانثاری دیکھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ انہوں نے شام وفارس کے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں، مگر ان کے عوام وخدام اور وزیر وامیر اپنے بادشاہوں کی اتنی عزت نہیں کرتے اور اس طرح ان میں اتنی فدائیت نہیں پائی جاتی جس طرح محمدؐ کے ماننے والے ان کی عزت کرتے ہیں اور ان پر فدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے وضو کے پانی کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے بلکہ اسے اپنے چلو میں لے کر پورے بدن پر مل لیتے ہیں۔

ایک بار ایک صحابی رسولؐ کو مکے کے کافروں نے پکڑا اور ان کو قید کر کے عقوبت پہنچانی شروع کی تا کہ وہ اپنے دین سے باز آجائیں۔ اس ظلم وتشدد کے بعد بھی ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ بالآخر انہوں نے ان کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ان کو قتل کرنے جارہے تھے تو کافروں نے پوچھا کیا تمہیں یہ خیال نہیں آرہا کہ کاش تم چھوڑ دیئے جاتے اور تمہاری جگہ محمدؐ کو پھانسی دیدی جاتی ۔اس انتہائی آزمائشی حالت میں بھی اس صحابی رسولؐ نے نہایت عزیمت اوراحترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں چاہوں گا کہ مجھے ٹکرے ٹکرے کر دیا جائے مگر حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چوبھے۔

قرآن نے مسلمانوں کو تعلیم دی کہ رسولؐ سے آگے نہ چلو، اپنی آواز کو نیچی رکھو رسول جو دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ، رسولؐ جب گھر کے اندر ہوں تو آواز نہ دو بلکہ انتظار کرو، غرض رسولؐ کی ذات کا احترام تمہارا ایمان اور تمہارا تہذیبی رویہ ہونا چاہئے۔

صحابہ رسولؐ کا کتنا احترام کرتے تھے کہ ایک صحابی رسولؐ کی آواز فطری طور پر تھوڑی بلند تھی۔ اسی زمانہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے اور تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ انہیں اس بات کا بڑا صدمہ ہوا کہ حضور کی محفل میں انہوں نے بلند آواز میں بات کی نتیجتاً انہوں نے خود کو گھر میں باندھ کر محصور کر لیا۔ جب حضورؐ کو اس کی اطلاع

ہوئی تو آپ نے ان کو تسلی دی کہ اس کا اطلاق ان پر نہیں ہے بلکہ ان لوگوں پر ہے جو جان بوجھ کر حضورؐ کی مجلس میں بلند آواز میں بات کرتے ہیں۔

صحابہ کے دل میں حضور کی عظمت واحترام اس قدر جا گزیں تھا کہ یہ ان کے شعور وآگہی کا حصہ بن گیا تھا اور غیر ارادی طور پر بھی ان سے کبھی ایسی حرکت نہیں ہوتی جو دور دور تک حضورؐ کے کسر شان سمجھی جاتی۔ایک بار حضرت عباس جو حضورؐ کے چچا تھے سے کسی نے پوچھا آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ۔ پوچھنے والے کا مقصد یہ تھا کہ عمر میں حضور بڑے ہیں یا حضرت عباس۔حضرت عباس حضورؐ کے اپنے چچا ہیں۔ظاہر ہے رشتہ میں وہ ان سے بڑے تھے۔حضرت عباس کی پیدائش حضور سے پہلے ہوئی تھی۔اس لئے عمر میں بھی بڑے تھے۔لیکن حضرت عباس نے جو جواب دیا وہ سونے کے پانی سے لکھے جانے کے لائق ہے اور اس جواب میں ہمارے لئے جو سبق ہے وہ قابل تقلید ہے۔حضرت عباس نے فرمایا بڑے تو حضورؐ ہیں، پیدا پہلے میں ہوا تھا رشتہ اور عمر میں بڑے ہونے کے باوجود حضورؐ کو جو منصب اور مقام حاصل ہے لہذا اس پوری کائنات میں خدا کے بعد حضورؐ سے بڑا نہ کوئی ہے اور نہ کوئی ہوسکتا ہے۔یہی تمام اہل ایمان کا ایمان ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یہ صرف صحابہ کا رویہ نہیں ہے بلکہ حضورؐ نے اپنے قول سے بھی اس کو واضح کیا ہے اور ایمان والوں سے صاف صاف کہا ہے۔آپ کی دو مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم اس طرح ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا۔تم اس وقت تک مومن و مسلم نہیں ہوسکتے جب تک تم مجھے یعنی حضورؐ کو اپنے ماں باپ، مال واولاد یہاں تک کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ سمجھو۔اور ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا کہ تم اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے۔جب تک تم ان چیزوں کو نہ ماننے لگو جو میں لے کر آیا ہوں۔

ان دونوں حدیثوں سے حضورؐ کے سلسلہ میں مسلمانوں کا رویہ واضح ہوتا ہے۔ایک میں حضورؐ کی ذات کو سب چیزوں سے مقدم رکھنا اور دوسرے میں آپ کے دین ودعوت کو ہر چیز سے اوپر رکھنا اور نرم وگرم ہر طرح کے حالات میں اس کی بجا آوری کرنا اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ

جنگ احد کا واقعہ ہے۔اس میں مسلمانوں کو زک اٹھانی پڑی اور کافی صحابی شہید ہوگئے تھے۔ایک صحابی خاتون کے شوہر، بھائی اور بیٹے کی شہادت ہوچکی تھی۔اسے جب خبر ملی کہ حضوؐر شہید ہوگئے ہیں تو وہ دیوانہ وار میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑی۔راستے میں لوگوں نے ان کے شوہر بھائی اور بیٹے کی شہادت کی اطلاع دی مگر وہ دیوانہ وار ہر کسی سے پوچھتی تھی کہ حضوؐر کیسے ہیں؟ جب ان کی نظر حضوؐر کے رخ انور پر پڑی تو اس نے کہا آپ سلامت ہیں تو اپنے عزیزوں کی شہادت کا کوئی غم نہیں ہے۔حضوؐر سے مسلمانوں کا عام طرز تخاطب یہ ہوتا یا رسول اللہ فداہ ابی وامی۔اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان۔اور آپ کے حکموں کے آگے ان کے جان و مال کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ابتدائے اسلام میں حضوؐر کے مشن کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب آپ کے ساتھیوں کی جانثاری تھی۔

آپؑ نے دیکھا حضرت ابوبکر کو کہ جب حضوؐر نے ہجرت کا ارادہ کیا تو بغیر کسی لیت و لعل کے یہ جاننے کے باوجود کہ ہر قدم پر جان کا خطرہ ہے آپ کے ساتھ نکل پڑے۔آپؑ نے دیکھا کے غار ثور میں سب سے پہلے وہ داخل ہوئے۔اس کو صاف کیا اور ہر سوراخ کو اپنا کپڑا پھاڑ پھاڑ کر بند کیا پھر حضوؐر کو اندر بلایا۔اپنے زانو پر بٹھایا۔ایک سوراخ بند ہونے سے رہ گیا تھا تو اس پر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے بند کیا کہ کہیں کوئی موذی جانور آپ کو تکلیف نہ پہنچائے۔اتفاق سے اس بل میں ایک سانپ تھا جس نے حضرت ابوبکر کو ڈس لیا۔مگر حضوؐر جو تھکن کی وجہ سے سو رہے تھے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔جب زہر پھیلنے لگا اور درد میں شدت پیدا ہوئی تو آپ ضبط نہ کر سکے اور آپؑ کے آنکھ سے آنسو نکل آیا جس کی ایک بوند حضوؐر کے رخ روشن پر گری تو آپ نے پوچھا کیا بات ہے؟ آپ نے وجہ بیان کی تو حضوؐر نے اپنا لعاب دہن لگا دیا اس طرح زہر زائل ہوگیا اور آپ کو راحت ملی۔

یہ محبت اور جانثاری کی انتہا تھی کہ جب معلوم ہوا کہ کفار مکہ نے رات میں حضوؐر کو شہید کرنے کی چال طے کر رکھی ہے تو آپ نے اسی رات مکہ سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور حضرت علی

کواپنے بستر پر سونے کا حکم دیا یہ معلوم تھا کہ کسی وقت بھی آپ پر حملہ ہوسکتا ہے اور آپ شہید کئے جاسکتے ہیں وہ اطمنیان سے حضوؐر کے بستر پر سوگئے اور اس خطرے کی کوئی پروانہیں کی۔

سیرت اور احوال صحابہ سے ایسی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں جس سے صحابہ کرام کی حضوؐر سے والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک طرف دشمنان اسلام کی سازشیں، بدتمیزیاں اور ریشہ دوانیاں اور ظلم وجور جس درجہ میں بڑھتی جارہی تھیں دوسری طرف صحابہ کرام کی جانثاری، جانبازی، عزت ومحبت، اطاعت واخلاص میں اس درجہ بلکہ اس سے بڑھ کر اضافہ ہوتا جارہا تھا یہاں تک کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔اور اللہ کا نور جس کو وہ اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے تھے مکمل ہوکر رہا اور دین غالب ہوگیا۔

آج ہمارے سامنے وہی اسوہ اور وہی رویہ مشعل راہ ہے ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ دوسرے حضوؐر کی عزت کرتے ہیں یا نہیں۔وہ آپؐ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں یا آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔یہ تو ان کے کفر کا خاصہ ہے جب ایک کافر خدا کی عصمت کوتار تار کرکے بہت سے جھوٹے اور خیالی خداؤں کو پوجتا ہے جو اللہ وحدہ لاشریک جس نے اس پوری کائنات اور خود اس کو پیدا کیا ہے اس کی عزت نہیں کرتا تو وہ رسولؐ خدا کی عزت کیا کرے گا۔لہذا ایسے گستاخ لوگوں سے ہمیں نہ شریفانہ رویہ کی توقع کرنی چاہئے اور نہ ان سے تعارض کرنا چاہئے۔وہ ہمارے جذبات کو اس لئے برانگیختہ کرتے ہیں کہ ہم ان سے الجھ پڑیں اور اس طرح اپنے کام اور مشن سے باز آکر ان کے بچھائے جال میں پھنس جائیں ۔یہ ان یہ راستہ آسان نہیں ہے بلکہ بڑی عزیمت اور اولوالعزمی کا ہے۔جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی جان دے دینا ورکسی کی جان لے لینا آسان ہے مگر اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے تاعمر اس کی پیروی کرنا اور انتہائی اشتعال انگیز ماحول میں صبر وضبط کا مظاہرہ کرنا مشکل ترین کام ہے ۔جس کے لئے برے مضبوط علم اور ایمان اور بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔آپ نے سنا نہیں ایک بار جنگ میں ایک کافر جس کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔حضرت علی نے پچھاڑ دیا اس نے اپنی خفت مٹانے کے لئے آپ کے منہ پر تھوک دیا۔آپ کو غصہ آگیا ۔مگر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ اس کے سینے سے اٹھ گئے اور اس کو چھوڑ دیا وہ اس رویہ سے بھونچکا رہ گا۔اس نے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔حضرت علی نے فرمایا

میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے میں خدا کی راہ میں اخلاص کے ساتھ لڑتا ہوں۔مگر جب تم نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے غصہ آ گیا۔اس وقت میں تمہیں قتل کرتا تو اپنے نفس کی تسکین کے لئے کرتا خدا کے واسطے نہیں ہوتا اس لئے میں نے تمہیں چھوڑ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دشمن ایمان لے آیا ہمیں بھی یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم جو کرر ہے ہیں وہ نفس کی تسکین کے لئے کرر ہے ہیں یا خدا کی رضا کے لئے کرر ہے ہیں۔اپنے نفس کو کنٹرول کرنا سب سے بڑا جہاد ہے اور یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان جو نماز روزہ کے پابند نہیں ہیں۔دین کی پوری سمجھ نہیں رکھتے۔عام معاملات میں دین پر عمل نہیں کرتے مگر جب کوئی جذباتی بات ہوتی ہے مثلاً حضوؐر کی شان میں گستاخی کی خبر ملتی ہے۔یا شریعت کو ختم کرنے کی سازش کی جاتی ہے یا کسی مسجد پر حملہ ہوتا ہے تو فرط جذبات سے مغلوب ہو کر مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر ایمان کی چنگاری موجود ہے۔اس کو مٹانے دبانے اور بجھانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ایک تعمیری اور مثبت رخ دینے کی ضرورت ہے۔یہ کام ہمارے علما، دانش ور اور دینی و ملی تنظیموں کا ہے کہ وہ افراد امت کی کیسی تربیت کرتے ہیں اور انہیں کس طرح ایک بڑے مقصد کے لئے تیار کرتے ہیں۔

حضوؐر جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے کہا ساری دنیا کے نبی ہیں اور رہتی دنیا تک کے نبی ہیں۔اب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔اپنے عہد میں اس دین و دعوت پر عمل کرنے اور لوگوں تک پہنچانے کا کام حضوؐر نے اور آپ کے پیارے ساتھیوں نے ہر طرح کا ظلم و جبر برداشت کر کے اور ہر طرح کی قربانی دے کر انجام دیا ہے۔قرآن نے کہا وہ ایک امت ایک گروہ تھا جو گذر گیا اس کے اعمال اس کے لئے تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں۔ان سے تمہارے بارے میں اور تم سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ہر شخص خدا کے حضوؐر اپنی شخصی حیثیت میں جوابدہ ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

سیرت رسول کی روشنی میں اس وقت ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے

اس میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس دین کے بارے میں اس کا رویہ کیا تھا۔ کیا وہ مشرک و کافر تھا یا منافق اور فاسق یا پھر مومن و مسلم تھا جس نے اس دین پر اخلاص کے ساتھ عمل کیا اور لوگوں تک اس کو پہنچایا جیسا اس کا حق تھا۔ اگر اس نے اخلاص کے ساتھ اپنی بساط بھر اس کام کو انجام دیا ہے۔ اپنی، اپنے بچوں اور اپنے گھر والوں کو اس دین سے واقف کرایا ہے اور ان کو عملاً اس پر چلنے کی تلقین کی ہے تو مانا جائے گا کہ اس نے اپنی گھریلو ذمہ داری پوری کی۔ اسی طرح جو لوگ اس کے پڑوس میں ہیں۔ جن کے ساتھ اس کا روز کا ملنا جلنا ہے جن کے ساتھ وہ کام کر رہا ہے۔ ان تک اس نے اس دین کو پہنچایا ان کو اس سے واقف کرایا۔ اللہ نے زبان و قلم کی جو صلاحیت بخشی ہے اور ترسیل و تبلیغ کے جو ذرائع عطا کئے ہیں اس سے کام لے کر زبانی یا تحریری یا کسی اور شکل میں اس نے اس دین کو لوگوں تک پہنچایا تو گویا اس نے اپنی زندگی کا مقصد پورا کیا۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں کو معاف فرمائے گا۔ اور اپنی رضا اور اپنے پسند کے گھر میں جگہ دے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ بصورت دیگر اگر اس نے اس فریضہ سے کوتاہی برتی تو دنیا کی گمرہی کا وبال اس کے سر بھی آئے گا جو اسے خدا کے آخری فیصلے میں ناکام کر سکتی ہے لہذا اسے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی اور اس کی ترجیحات کو طے کرنا چاہئے تاکہ دنیا و آخرت ہر دو جگہ وہ کامیاب اور بامراد ہو۔

اس وقت سیرت رسولؐ کا ہم سے کیا تقاضہ ہے اور موجودہ صورتحال میں ہم اس کو کیسے پورا کر سکتے ہیں۔ یہ ملین ڈالر کا سوال ہے جس پر ہمیں پوری سنجیدگی اور ایمانداری سے غور کرنا چاہئے۔ میں یہاں اپنی علم و صلاحیت کے بقدر کچھ نکات آپ کے انفرادی اور اجتماعی غور و فیصلہ کے لئے رکھنا چاہتا ہوں آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ اس کو دل کے کانوں سے سنیں اور سنجیدگی سے غور کریں اور اس میں جو باتیں آپ کو آسان و قابل عمل لگیں اس کو اپنی زندگی میں اتاریں تو میں سمجھوں گا کہ ہماری یہ کوشش کامیاب ہوئی جو یقیناً ہمارے لئے توشۂ آخرت بنے گی۔

(۱) ہمارا سب سے پہلا کام ہے اس دین کو جاننا، سمجھنا اور دل سے اس پر ایمان لانا اور حسب

توفیق اس پرعمل کرنا۔دین کو جاننے کا سب سے مستند طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی کتاب یعنی قرآن پاک کی تلاوت کریں،اس کو سمجھ کر پڑھیں۔ہماری زبان عربی نہیں ہے۔اس لئے ہم قرآن کی عربی عبارت پڑھ کراس کے معنی اور مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ہمارے بہت سے بزرگوں نے ہمیں قرآن کی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے اسے ہماری زبانوں میں یعنی اردو،ہندوی،انگریزی اور ہندوستان میں بولی اور لکھی جانے والی تمام زبانوں میں قرآن مجید کا عام فہم ترجمہ اوراس کی ضروری تشریح کردی ہے جس سے ہم اللہ کی کتاب میں اللہ نے ہم سے کیا مطالبہ کیا ہے۔کن چیزوں پرایمان لانے کا حکم دیا ہے۔کن چیزوں کو کرنے اور کن کو نہ کرنے کا حکم دیا ہے ہم پرکس کے کیا حقوق ہیں اور ہمیں اپنی زندگی کیسے گذارنی چاہئے اس کی پوری جانکاری دی ہے۔لہذا ہمیں اس کو جاننا چاہئے اور اس پرعمل کرنا ہے اسی طرح حضوؐر کی زندگی کیسی تھی۔آپؐ کی سیرت وسنت کیا ہے ہم آپؐ کے اسوہ کی کیسے پیروی کرسکتے ہیں۔اس کی جانکاری ہمیں حدیث اور سیرت کی کتاب سے حاصل ہوگی۔لہذا ہمارا سب سے پہلا کام ہے کہ ہم قرآن وسنت کو جانیں تاکہ ہم جہالت اورگمراہی سے بچ سکیں۔آج مسلمانوں کی گمرہی کی بڑی وجہ ان کی دین سے ناواقفیت ہے۔اس لئے ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم اپنے چوبیس گھنٹے میں سے تمام ضروری کاموں کے ساتھ ساتھ آدھا سے ایک گھنٹہ کا وقت قرآن،حدیث،سیرت اور بنیادی اسلامی لٹریچر پڑھنے کے لئے نکالیں تاکہ ہم دین کی بنیادی باتوں سے خود واقف ہوسکیں۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پرفرض ہے دین کو صحیح اوراچھی طرح جانے بغیر ہم نہ تو دین پر صحیح ڈھنگ سے عمل کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کے بارے میں بتاسکتے ہیں۔ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم دین سیکھیں اور دوسروں کو سیکھائیں۔دین کے بارے میں جہالت کے ساتھ بات کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔حضوؐر نے کہا جس نے ہماری طرف غلط بات منسوب کرکے کہی یعنی جو بات آپ نے نہیں کہی ہے اس کو آپ کی بات بتاکر پیش کیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔لہذا حضوؐر کے بارے میں لاعلمی کے ساتھ کلام کرنا بہت خطرناک ہے۔۔وہیں آپؐ نے تاکید کی کہ اگر میری ایک بات بھی معلوم ہے تو لوگوں تک اس کو پہنچادو۔اس طرح لوگوں تک

جو بات بھی پہنچے گی وہ صحیح ہوگی۔لہذا حضورؐ کی باتوں کو جاننا اور لوگوں تک اس کو پہنچانا عین تقاضائے ایمان واسلام ہے ہمارے نوجوان ساتھیوں کو یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہئے۔ایک شخص گھوڑے پر سوار حضورؐ کے پاس آتا ہے۔اور آپؐ سے پوچھتا ہے کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔آپؐ نے فرمایا ہاں میں ہی اللہ کا رسول ہوں۔اس نے سوال کیا کیا آپؐ فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔آپؐ فرمایا ہاں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔اس نے پوچھا کی آپ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔آپ نے فرمایا ہاں۔اس نے پوچھا رمضان کے روزے فرض ہیں۔آپؐ نے فرمایا ہاں۔پھر اس نے پوچھا جن کو اللہ نے مال دیا ہے ان پر زکوۃ فرض ہے اور زندگی میں ایک بار حج فرض ہے آپ نے فرمایا ہاں وہ شخص گھوڑے سے اترا اور ایک تنکا اٹھایا اور کہتا ہوا روانہ ہوگیا کہ میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم۔حضورؐ نے موجود صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا جس کو دیکھنا ہو کہ کون جنتی ہے تو اس شخص کو دیکھ لے۔اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جو جانکاری اس کو دین کے بارے میں ملی تھی، اس کی اس نے تصدیق کرائی۔جب اس کو معلوم ہوگیا کہ یہ صحیح اور سچی تعلیمات ہیں تو پھر اس نے عہد کیا کہ وہ اس پر عمل کرے گا جس پر حضورؐ نے اس کو جنت کی بشارت دی۔

آج یہی اسوہ ہمارا ہونا چاہئے۔ہمیں اسی طرح کے علم، ایمان اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہئے۔تبھی ہم محبت رسول کا حق ادا کرسکتے ہیں ورنہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہوگا۔جس کا کوئی حاصل نہیں ہے بلکہ یہی چیز ہمارے لئے وبال جان بن جائے گی۔اس لئے پہلا کام دین کو جاننے اور سیکھنے کے لئے تھوڑا وقت نکالنا ہے اور جس زبان کو ہم آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں اس کے ذریعہ دین کو صحیح ڈھنگ سے جاننا ہے۔کیا ہم دین کا یہ چھوٹا سا مگر ضروری مطالبہ نہیں پورا کرسکتے ہیں؟ یہ دین کے تحفظ اور اس پر عمل کرنے کے باب میں ہمارا پہلا بنیادی قدم ہوگا۔جس پر آج کے حالات میں عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔ورنہ ہم اس ملک اور ماحول میں اپنے دین اور ناموس رسولؐ کی حفاظت نہیں کرسکتے ہیں۔جو لوگ محبت رسول کا دم بھرتے ہیں اور حضورؐ کی عصمت کی حفاظت کے لئے جان دینے کو تیار ہیں ان کو سب سے پہلے دین کو جاننے اور سمجھنے کے لئے آدھا ایک گھنٹہ ضرور نکالنا چاہئے۔

(۲) کسی قوم کا مستقبل اس کے بچے اور جوان ہوتے ہیں۔لہذا بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم واصلاح کے بغیر کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔اللہ نے جتنے نبی بھیجے وہ سب کے سب جوان تھے۔حضورؐ کے کم وبیش سارے ساتھی نو سے ۳۹ سال کے درمیان کے تھے۔ان کے عزم وہمت جانثاری اور وفاداری، جہد وقربانی کے نتیجہ میں ہی یہ دین غالب ہوااور آج بھی اس دین وملت کا مستقبل ہماری نوجوان قوت پر منحصر ہےاس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوانوں کواپنے اندر اعلیٰ علمی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے اور اپنے آپ کوتوانا اور تندرست رکھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

آج ہم ۱ے ارکروڑ کی مضبوط آبادی رکھنے کے باوجود اپنی جہالت اور علمی پس ماندگی کی وجہ سے ایک پسماندہ اور کمزور اقلیت سمجھے جاتے ہیں جس کو جب جہاں چاہتا ہے ٹھوکر مار کر نکل جاتا ہے اور ہم آنسو بہاتے رہ جاتے ہیں ہمیں اس پسماندگی سے باہر نکلنا ہے اور خود کو طاقت ور اور مضبوط بنانا ہے۔

آئین پیغمبر کی طرف مراجعت: اہمیت اور ضرورت

مبارک ساعت

انسانی تاریخ میں بعض ساعت، بعض دن، بعض تاریخ، بعض مہینہ، بعض سال، بعض عہد، اور بعض زمانہ اتنے مبارک اور اتنے پرسعادت ہوتے ہیں کہ کوئی بھی عہد وزمانہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انسانی اور اسلامی کلینڈر میں ربیع الاول کا مہینہ اور اس کی بارہویں تاریخ اور اس کی وہ صبح سعادت جس میں حضورؐ پرنور حضرت محمد رسولؐ اللہ کا مولود مسعود ہوا جس کے بارے میں مولانا حالی نے کہا ؎

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

حضورؐ کی آمد کا انتظار اس دنیا کو زمانہ قدیم سے تھا۔ چنانچہ ہر نبی نے آپؐ کے آنے کی اطلاع اپنی قوم اور اپنے ماننے والوں کو دی۔ ملائکہ اس دن اور لمحہ کے انتظار میں نظریں بچھائے بیٹھے تھے اور اس زمین و آسمان کی نگاہیں اسی جانب لگی ہوئی تھیں اور سورج چاند کی گردش اسی بنا پر قائم تھی۔

نقطۂ تبدیل

جب انسانیت گمراہی اور ضلالت کی آخری حد پر پہنچ گئی اور ہر طرف ظلم و جور کا دار دورہ تھا، معصوم بچیوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہوگئی تھی، یتیم، بے نوا، مسکین، غریب، غلام، کمزور اور بے سہارا لوگوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ انسان استحصال کی چکی میں پس رہا تھا۔ مٹھی بھر لوگوں کو چھوڑ کر خلق خدا غربت و ذلت اور انتہائی کسمپرسی کی حالت میں جی رہی تھی۔ عورت مظلوم، نوجوان آوارہ اور بڑے بے مقصد زندگی گزار رہے تھے۔ امن و انصاف عنقا ہوگیا تھا۔ بدامنی اور شقاوت ملک کا دستور اور نظام بن گیا تھا۔ ہر جگہ انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی تھی۔ آدمی، عورت، جانور، کھیتی

اور باغات، ندی نالے، چرند و پرند سب تراہی تراہی کر رہے تھے۔ اس وقت اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور اللہ تعالیٰ نے وجہ کائنات، فخر موجودات، سرور کائنات حضرت محمدؐ کے ورود مسعود کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے بارہ ربیع الاول کی تاریخ سعید متعیّن کی۔ یہ دن ہمارے لئے عید کی طرح خوشی منانے کا ہے۔ لیکن اللہ نے اور اللہ کے رسول نے اسے کوئی تہوار کا دن نہیں بنایا تا کہ یہ دن محض رسمیات اور تفریح کا دن بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس دن کو ایک ایسے تاریخ کے طور پر ثبت کر دیا جو انسانی تاریخ میں ایک Turning point کہا جاسکتا ہے۔

حضورؐ، نبوت سے پہلے

اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضورؐ کو گہوارے میں ہی خلعت نبوت عطا نہیں کر دی بلکہ چالیس سال مکے میں آپ کو ایک عام انسان کی طرح رکھا اور آپ کی شناخت ایسی رہی کہ لوگ آپ کو اپنے میں کا ایک سمجھتے رہے حالانکہ وقتاً فوقتاً ایسے آثار بھی دکھائے جاتے رہے جو آپ کی غیر معمولی شخصیت کا آئینہ دار تھی۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور حجر اسود کے نصب کرنے پر مکے کے مختلف قبیلوں کے درمیان نزاع پیدا ہو گیا۔ اس وقت آپؐ نے ان کو ایسی راہ سجھائی جس نے ان کے دلوں کو مطمئن کر دیا اور وہ ایک بڑے خونی جنگ سے بچ گئے۔

مکے میں جب بدامنی پھیل گئی اور اندر اور باہر کے لوگوں کے لئے تجارت اور آمد و رفت مشکل ہو گئی اس وقت آپؐ نے حلف الفضول میں شامل ہو کر ان کو بدامنی سے بچایا۔ مکے میں جب کسی غریب، مسکین و بے نوا اور غلام کو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس وقت آپؐ لوگوں کی دست گیری کرتے اور ان کی مدد کرتے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں سچائی، ایمانداری اور امانت عنقا تھی آپؐ ان کے درمیان صادق اور امین کی حیثیت سے تھے اور وہ آپؐ پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ اپنا قیمتی اثاثہ آپؐ کے پاس رکھتے۔ یہ واقعات اشارہ کر رہے تھے کہ اللہ نے آپؐ کو کچھ مخصوص کام کے لئے بھیجا ہے مگر غیب کا پردہ اٹھنے میں ابھی دیر تھی۔

اعلان نبوت

اسکیم الہیٰ کے طور پر وہ ساعت آ گئی جب حکمت الہیٰ نے یہ واضح کرنا ضروری سمجھا کہ آپ کون ہیں اور کس کام کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں، تو اللہ نے غار حرا میں، جب آپؐ اپنے رب سے لو لگائے بیٹھے تھے، اپنا فرستادہ بھیجا اور نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اللہ نے اعلان کیا اب جہالت و گمراہی کا دور ختم ہوتا ہے اور اب سے علم و ہدایت کا دور شروع ہوتا ہے۔ پڑھو اللہ کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا اور انسان کو علم دیا جس کو نہیں جانتا تھا۔ علامہ حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

علم و ہدایت کا دور

دنیا میں حضور کی آمد علم اور ہدایت کی آمد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ کو دو بڑے عہد میں بانٹا ہے۔ حضورؐ سے قبل کی تاریخ اور زمانے کو اس نے زمانۂ جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور حضورؐ کے بعد عہد اور زمانے کو اس نے زمانۂ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ زمانۂ اسلام کا مطلب علم و ہدایت کا زمانہ۔ چونکہ آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اس لئے اب آپ کا زمانہ آپ کی بعثت سے قیامت تک کا زمانہ ہے۔ حضورؐ کا عہد صرف وہ عہد نہیں ہے جب آپ بہ نفس نفیس اس روئے زمین پر موجود تھے بلکہ حضور کا عہد قیامت تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم آپ اس وقت عہد محمدی میں جی رہے ہیں اور ہمارے بعد بھی دنیا میں جتنی نسلیں اور قومیں آئیں گی وہ سب کے سب عہد محمد میں آئیں گی۔

علم کا حاصل کرنا فرض ہے

آپؐ نے انسانیت کو جہالت و گمراہی کے اندھیرے سے نکال کر علم و ہدایت کی روشنی میں لایا۔ آپ دنیا کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے حصول علم کو فرض قرار دیا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپ کا ہتھیار کیا ہے، آپ نے فرمایا العلم سلاحی، علم ہمارا ہتھیار ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ حضرت

موسیٰ عصا اور ید بیضا لے کر آئے، حضرت عیسیٰ کو اللہ نے اندھوں اور بیماروں کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا کیا تھا، آپؐ کیا لے کر آئے ہیں۔ آپؐ نے سورہ آل عمران کی آیات تلاوت کی جس میں علم تفقہ، غور و فکر، تحقیق و جستجو کی طرف دعوت دی گئی ہے، اور کہا میں یہ لے کر آیا ہوں۔

قرآن حضورؐ کو دیا جانے والا سب سے بڑا معجزہ ہے جو علم و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ حضورؐ کی ذات ایک علمی انقلاب کا اعلان ہے۔ آپؐ کی امت کو شاہد و امین، امت وسط اور امت العلم ہونا چاہئے۔ ابتداًا ایسا ہوا بھی مگر بعد کے لوگوں نے اس امانت کی حفاظت نہیں کی اور لوگ اپنا منصب و مقصد بھول گئے۔ مسلمان ایک امت سے ایک قوم بن گئے اور انھوں نے علم کے بجائے جہالت کو اپنا قومی شعار بنالیا۔

مسلمانوں میں جہالت و پسماندگی

اسلامی تعلیم کا تقاضہ تو یہ تھا کہ پوری قوم علم کے جوہر سے آراستہ ہوتی جبکہ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمان جہالت و پسماندگی کا ہم معنی لفظ بن گیا ہے۔ یہ صورت حال صرف ہندوستان میں نہیں ہے کہ ہم کہہ دیں کہ یہ حکومت اور اکثریت کی نا مہربانی کا نتیجہ ہے۔ یقیناً مسلمانوں کی جہالت و پسماندگی میں حکومت بھی ذمہ دار ہے مگر جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جہاں ان کی حکمرانی ہے وہاں بھی وہ اسی طرح کے صورت حال سے دوچار ہیں بلکہ ان میں سے بعض ملکوں میں ہندوستانی مسلمانوں سے بھی زیادہ جہالت و ناخواندگی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ محض حکومت یا غربت نہیں ہوسکتی بلکہ کہیں نہ کہیں یہ ہمارے فہم و نفسیات کا قصور ہے اور ہماری دینی و ثقافتی لیڈرشپ کی ناکامی ہے۔

علم کا ناقص تصور

حضورؐ کا ارشاد ہے علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ایک تو مسلمان میں صرف مردوں کی تعلیم پر زور دیا گیا اور عورتوں کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا جبکہ لفظ مسلمان کا اطلاق مسلمان مرد

اور مسلمان عورت دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔اللہ نے دونوں کو خلیفہ بنایا ہے۔دونوں کی ذمہ داریاں متعین کیں ہیں اور دونوں کو جوابدہ بنایا ہے۔اس طرح عورتوں کی تعلیم کو کم اہمیت دیا گیا اور اپنی آدھی آبادی کو نظرانداز کر دیا گیا۔دوسرا بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ علم کے دائرے کو مختصر اور محدود کر دیا گیا اور اس کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔کہا گیا علم دو طرح کے ہیں ایک علم دین اور دوسرا علم دنیا۔پھر کہا گیا کہ علم دین سیکھنا فرض ہے۔حدیث کے الفاظ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے علم کو دین و دنیا میں تقسیم کیا جائے یا اس کو صرف دینی علم تک محدود رکھا جائے بلکہ حدیث میں علم نافع کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کا مطلب وہ علم جو مفید ہے جس سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے۔اور جس سے ثواب دارین حاصل ہوتا ہے۔تھوڑی دیر کے لئے ہم اس تعبیر و تشریح کو صحیح مان بھی لیں تو کم سے کم یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان دنیوی علم سے تو ناواقف ہیں مگر دینی علم سے آراستہ ہیں۔مگر یہاں کی صورت حال اور بھی افسوسناک ہے۔

دینی علم سے واقف ہونا تو دور مسلمانوں کی غالب اکثریت ناخواندہ اور کلمہ نماز سے بھی ناواقف ہیں۔بلکہ ذرا آپ قریب سے جا کر مسلمان سماج اور اس میں پڑھے لکھے لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں اگر مجموعی جہالت 60% ہے تو دینی جہالت 65% ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ معروف معنوں میں پڑھے لکھے سمجھے جاتے ہیں مثلاً میٹرک، گریجوئٹ، پوسٹ گریجوئٹ، ڈاکٹر، انجینئر، آفیسر، پروفیسر، وکیل، صحافی، سیاسی لیڈران، شاعر، ادیب، کلرک مختلف پیشوں کے ماہرین، تجارت پیشہ، آپ ذرا ان کی دینی معلومات کا سروے کریں تو معلوم ہوگا کہ دین کے بارے میں ان کا علم یا تو بہت محدود ہے یا بہت ناقص ہے۔اور وہ بھی ایسے ذرائع سے ہے جو ناقابل اعتبار ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ایمانی اخلاقی حالت بہت کمزور ہے۔جب ہمارے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیہاتی اور شہری مسلمانوں کا کیا حال ہوگا؟ جبکہ مسلمانوں کی غالب اکثریت پس ماندہ لوگوں پر مشتمل ہے جن کو زندگی کی کڑی آزمائش نے علم حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔

علمائے دین کا حال

دوسری طرف جو ہمارے سند یافتہ علمائے دین ہیں ان کی بھی دین سے کچھ اچھی واقفیت نہیں ہوتی بلکہ بقول اقبال ؎

یہ امت خرافات میں کھو گئی
حقیقت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور وہ ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی ، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

ہمارے بیشتر علمائے دین علمائے مسلک ہیں۔ ہمارے دینی اداروں میں پورے دین کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ واجبی قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔اور سارا وقت اور سارا زور اپنے فقہ اور مسلک کی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک بگھا پن یعنی یک رخے عالم دین پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے مسلک اور دوسرے فقہ سے بالکل واقف نہیں ہوتے۔ یا ان کی واقفیت بہت ناقص ہوتی ہے۔اس پر مستزاد ان کی عصبیت کی وجہ سے ملت میں ہر وقت اختلاف و انتشار کا ماحول بنا رہتا ہے۔جو ایک طرف دین کی غلط تصویر پیش کرنے کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف ملت کو اندر اور باہر سے کمزور کرنے کا سبب۔ان سب کا علاج یہ ہے کہ رسولؐ کی اس حیثیت کو یاد کیا جائے۔حضورؐ نے فرمایا، مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے اور میں تمہارے درمیان اخلاق کی تکمیل کے لئے آیا ہوں۔

ہمیں اس وقت جو سب سے پہلی اور بنیادی جنگ جو مسلم سماج کے اندر اور باہر لڑتی ہے وہ ناخواندگی اور جہالت کے خلاف جنگ ہے۔ جب تک جہالت و ناخواندگی پر ہم فتح حاصل نہیں کرتے دنیا کی قوموں میں ہمارا کوئی مقام وقار نہیں ہوگا اور ہم دنیا کو کبھی اسلام کا قائل نہیں کر سکتے۔

افکار کی جنگ تلوار سے نہیں جیتی جا سکتی۔اس وقت دنیا میں علم بم کی طرح پھٹ پڑا ہے۔مگر دنیا کی علمی قیادت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔جس طرح اسلام مکمل ہے اسی طرح کفر بھی مکمل ہے۔کفر غالب ہوگا تو اسلام کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو جائے گا۔ہم کفر و اسلام کا ملغوبہ بنا کر نہیں جی سکتے۔ اسلام غالب ہوگا کفر مٹ جائے گا۔آج ہم نظام کفر میں اسلام کا پیوند لگا کر جی رہے ہیں جس نے ہماری صورت کو بدنما داغ دار اور گھنونا بنا دیا ہے۔اور ہم دنیا والوں کے سامنے مذاق اور استہزا کی چیز بن گئے ہیں۔

جہاد بالقلم

اس وقت اسلام کو ایک زبردست علمی انقلاب کی ضرورت ہے۔یہ وقت تلوار سے جنگ کا نہیں ہے قلم سے جہاد کا ہے۔جس کے لئے ہمارے باصلاحیت، محنتی، ذہین نو جوانوں، دانشوروں، علما اور ماہرین کو سخت محنت اور جانکاہی کے ساتھ دنیا کی علمی قیادت اپنے ہاتھ میں لینی ہو گی ورنہ ہم غلامی و پس ماندگی سے کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔عزت و آزادی، طاقت اور خوشحالی سے کبھی بہرور نہیں ہو سکتے۔اقلیت کی کمزور نفسیات سے کبھی باہر نہیں آسکتے۔ذلت و نکبت سے کبھی خود کو بچا نہیں سکتے۔خوب جان لیجئے کہ ہم تعداد کا مقابلہ استعداد اور اکثریت کا مقابلہ اہلیت سے کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔اللہ نے فرمایا تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ یعنی اگر تم صاحب ایمان ہو، صاحب کردار ہو، متحد اور منظّم ہو Forward looking ہو، عالی حوصلہ اور عالی ظرف ہو، ثابت قدم اور مضبوط ارادوں کے مالک ہو، خدا سے ڈرنے والے اور رسول پر جان دینے والے ہو اور آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتے ہو، قرآن پڑھنے والے، اس کو سمجھنے والے، اس پر عمل کرنے والے، خود چلنے والے اور دنیا کو چلانے والے ہو تو پھر تم ہی غالب رہو گے یہ اللہ کا وعدہ ہے۔اس کی طرف سے پیش گوئی ہے۔اس کی طرف سے پروانہ فتح ہے۔مگر ان شرائط کو پورا کئے بغیر تم غالب ہونا چاہو گے تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ دنیا وجہ، اثر Cause&Effect کے اٹل اصول کے تحت بنائی گئی ہے جو اللہ کی سنت ہے اور اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔

لہذا آج حضورؐ کی سیرت و تعلیم کا سب سے پہلا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی بنیادی نہج پر

واپس آئیں،علم حاصل کریں اور دنیا کو صحیح علم سے واقف کرائیں۔علم ہر بھلائی کی کنجی اور ہر خیر کا سر چشمہ ہے اور اسی کے ذریعہ دنیا کے تمام مسائل حل ہوں گے۔

اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں پیدا کی جس کا علاج نہ ہو اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل نہ ہو۔ناممکنات دنیائے امکانات میں ناقص فکر وعمل کی غماز ہے ورنہ اس آسمانی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔سمندروں کو پار کرنا،فضائے بسیط میں گھومنا،سورج کی شعاؤں کو گرفتار کرنا، چاند اور مریخ پر جانا، ہزاروں میل دور بیٹھے شخص کو دیکھنا اور بات کرنا کیا چیز ناممکن ہے؟ یہ سب ممکن اور آسان ہے۔جو کام دوسرے لوگ کر سکتے ہیں،آپ کیوں نہیں کر سکتے؟ اس کے لئے جس علم، فن و فکر، تحقیق،محنت و جانکاری،لگن، ذہانت وزیرکی، ہمت وحوصلہ،سرمایہ اور تکنیک کی ضرورت ہے وہ اگر حاصل ہو تو پھر کیا چیز ناممکن ہوگی۔

دنیا کی سب سے زرخیز چیز سب سے بڑا معدنی ذخیرہ اور سب سے بڑی جوہری قوت انسان کا دماغ ہے۔جس نے ذہن کی صلاحیتوں کا سلیقہ سے استعمال کرنا سیکھ لیا پھر اس کے لئے دنیا فتح کرنا آسان ہوگا۔یہی وہ گم شدہ پونجی ہے جو ہم سے گم ہوگئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا حکمت مومن کی گمشدہ پونجی ہے،اسے جہاں پاؤ اپنالو۔

یہ زمین مومنوں کی میراث ہے۔اس کا حصول وحفاظت ، اس کا فروغ و بقا اور اس کی بھلائی وعظمت ایمان ،علم اور عمل صالح کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے اور اس میں کوتاہی موت و ذلت کا پیغام ہے۔اور جب کبھی یہ صورت حال پیدا ہو جائے اس وقت مسلمان نظام کفر سے لاکھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں اسلام مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگے گا اور لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے اور مسلمان منہ چھپاتے پھریں گے۔آج کی صورت حال یہی ہے۔حضورؐ جو دین وشریعت لے کر آئے اس کا ایک پہلو بقول اقبال یہ ہے ۔

حافظ ناموس زن،مرد آزما مرد آفریں

اسلامی شریعت کی خصوصیات

یعنی یہ ایک ایسی شریعت ہے جو عورت کی عزت و ناموس کی محافظ ہے اور یہ ایسے مرد

پیدا کرتی ہے جو ہر طرح کی لالچ ،خوف ، دباؤ اور ترغیب کے مقابلے اپنے اصولوں پر پہاڑ کی طرح اٹل رہنے والے ہیں۔ ہر طرح کی نفسانی کمزوری سے پاک اعلیٰ صفت انسان جو مودت ورحمت کا نمونہ اور خیر الناس من نفع الناس کی تصویر ہیں۔یعنی تم میں سے سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کے لئے فائدہ پہنچانے والا ہے۔

۱۶ دسمبر۲۰۱۲ کو دہلی میں ایک ۲۳ سالہ لڑکی کے ساتھ جو انسانیت سوز ، اندوہناک اور انتہائی شرمناک واقعہ پیش آیا اس نے نہ صرف پورے ہندوستان کا سر شرم سے جھکا دیا بلکہ ہزاروں نو جوان مرد عورت کے دل میں اس کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جس نے انھیں سڑکوں پر نکلنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے عورتوں کے حقوق، آزادی اور حفاظت کے باب میں اتنی زوردار آواز اٹھائی کہ حکومت جو کنبھ کرن کی نیند سوئی ہوئی تھی اس کو جگنے پر مجبور کر دیا۔ اکثر انتظامیہ اور پولیس محض خانہ پوری کر کے معاملے کو دبانے میں ماہر ہوتی ہے۔اس کو جوابدہی کے کٹہرے میں کھینچا یہاں تک کہ ملک کی عدالت کو بھی فیصلے میں اپنی سست رفتاری پر شرم آنے لگی اور جلد انصاف کی بات کی جانے لگی۔موجودہ قانون کی خامیاں اجاگر کی گئیں۔جلد انصاف اور سخت سزا کا مطالبہ کیا گیا اور حفاظت کے پختہ انتظام کی بات کی گئی۔ بات صرف عورتوں کی حفاظت تک ہی نہیں رکی بلکہ اس نے پورے Pandoras Box کھول دیا۔عورت مرد کے تعلقات ،عورت کی سماج میں حیثیت،عورت کی آزادی ، موجودہ کرمنل جسٹس سسٹم، پولس ایڈمنسٹریشن، سول سوسائیٹی ، ذرائع ابلاغ حکومت اور اپوزیشن کا رول، گھر ، سماج، اسکول ،تعلیم گاہ، ورک پلیس، سفر، دفتر، پبلک ٹرانسپورٹ، تفریح، اشتہار ، گانے ، فلمی ڈائلاگ، آئٹیم نمبر، بچوں کے جرائم، گھر اور قریبی رشتہ داروں سے نابالغ اور دیگر عورتوں کی حفاظت جیسے بیشتر مسائل، بچوں کا ماں کے پیٹ ہی میں قتل، ڈوری سسٹم، کاسٹ سسٹم، کھاپ پنچایت، آنر کلنگ تمام طرح کے مسائل زیر غور آئے اور اس پر بحث جاری ہے۔حکومت نے سابق چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس جے ایس ورما کی قیادت میں قانون میں بدلاؤ اور جلد انصاف کے لئے ایک کمیشن تشکیل دی جس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔

ہم جس علمی انقلاب کی بات کر رہے تھے اس کا ایک پہلو عورت و مرد تعلقات، سماج میں عورت کی حیثیت اور جنسی جرائم سے متعلق سزا بھی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اسلام نے عورت کی

حفاظت، عزت وآزادی، طاقت واختیار اوران کے خلاف ہونے والے مظالم وجرائم کے سدباب کے لئے ہدایات، اقدامات، اور سزائیں متعین کی ہیں ان کا ایک بار پھر سے حکمت کے ساتھ اعادہ کیا جائے تاکہ اسلام کے احسانات وتعلیمات واضح ہوجائیں۔

(۱) آپ قرآن پاک کھولیں، آپ پر یہ حقائق پوری طرح واضح ہوجائیں گے۔ اللہ نے آدم کی تخلیق کی پھر اس سے اس کا جوڑ بنایا۔ پھر اس جوڑے سے دنیا میں بہت سے مردوعورت پھیلا دیئے دنیا کے تمام انسان اسی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس لئے سب برابر ہیں اور سب یکساں عزت واحترام کے مستحق ہیں۔ آدم وحوا دونوں کو خلیفہ بنایا، دونوں کو عزت وشرف سے نوازہ، دونوں خدا کے نزدیک یکساں جواب دہ ہیں اور دونوں کو ایک ہی طرح کے جزا وسزا سے گزرنا ہے۔ اس لئے دونوں یکساں ذمہ دار اور یکساں جوابدہ ہیں۔ انسانیت کا وجود وبقا اور ارتقا ان دونوں کے درمیان متوازن رویہ پر منحصر ہے۔ بائبل نے کہا عورت پاپ کی جننی ہے، اس نے آدم کو بہکایا۔ قرآن کہتا ہے ہم نے آدم کو اپنے عزم میں پکا نہیں پایا اور دونوں شیطان کے جھانسے میں آگئے۔ اس لئے عورت پر یہ الزام غلط ہے۔ اسلام نے عورت کو اس خطائے ازلی سے بری کردیا۔

(۲) لوگ بیٹی کی پیدائش کو باعث ذلت سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اس کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ قرآن نے اس کا واضح نقشہ کھینچا ہے کہ جب انھیں بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو ان کے چہرے کالے پڑ جاتے تھے اور وہ شرم سے منہ چھپائے پھرتے تھے۔ ان کا یہی شرم بیٹیوں کی جان لینے پر بھی مجبور کردیتا تھا۔

اسلام نے اس ذہنیت کی اصلاح کی اور بیٹی کی پیدائش کو خیر وبرکت اور حصول جنت کا ذریعہ بتایا۔ حضورؐ نے فرمایا جس کو اللہ نے دو یا تین بیٹی دی اور اس کی اچھی پرورش وپرداخت کی، ٹھیک سے کھلایا پلایا، بیٹی پر بیٹے کو ترجیح نہیں دیا بلکہ دونوں کو ایک طرح رکھا، ان کی اچھی تعلیم وتربیت کی اور جب وہ بالغ ہوگئیں تو ان کی مناسب جگہ شادی کردی تو وہ شخص اور حضورؐ جنت میں ایک دوسرے کے قریبی ہمسایہ ہونگے۔ یہ سعادت ایک شخص کو بیٹی کی پیدائش پر حاصل ہوگی، بیٹے کی پیدائش اور پرورش پر یہ مژدہ نہیں سنایا گیا۔

آپ کہیں گے یہ زمانۂ جاہلیت کی باتیں ہیں آج کے ترقی یافتہ دور میں عورت مرد برابر ہیں۔ لوگ بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں کرتے۔ تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ غلط فہمی میں ہیں، بلکہ سائنس اور ٹکنولوجی کا جتنا غلط استعمال کر کے آج کے ترقی یافتہ مہذب، پڑھے لکھے، خوشحال شہری لوگ بیٹیوں کو پیدا ہونے سے پہلے مار دیتے ہیں اس کا تذکرہ آئے دن اخباروں میں، ٹی وی پر اور رسائل میں ہوتا ہے۔ حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کے اعداد وشمار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ پنجاب اور ہریانہ ہندوستان کی فی کس آمدنی کے اعتبار سے سب سے ترقی یافتہ ریاستیں ہیں۔ وہاں مردوں اور عورتوں کا تناسب پورے ہندوستان میں سب سے کم ہے۔ اور یہی وہ ریاستیں ہیں جہاں عورتوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ بھرون ہتیا انھیں ریاستوں میں ہوتی ہے اور سب سے زیادہ آنرکلنگ بھی یہیں ہوتی ہے۔ زنا اور زنا بالجبر کے واردات بھی یہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ، مہاراسٹر، گجرات، آندھر پردیش، بہار، یوپی، مدھیہ پردیش غرض پورے ہندوستان میں بچیوں کو مارنے اور عورتوں کو ذلیل کرنے کا عمل جاری ہے۔ آپ کسی بھی میٹروپولیٹن سیٹی میں عورتوں اور مردوں کی آبادی دیکھ لیں کیرالہ کو چھوڑ کر قریب قریب تمام ملک میں لاکھوں بچیوں کو پیدا ہونے سے پہلے مار ڈالا جاتا ہے اور یہ مارنے والے ماں باپ اور ڈاکٹر ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بچی کی پیدائش ان کے معیار زندگی کو گھٹا دے گی، آرام وراحت میں کمی پیدا کرے گی اس لئے ڈاکٹروں، نرسوں کو تھوڑے پیسے دے کر قتل کا یہ کھیل بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔ اس لئے ہمیں اس مادی ذہنیت اور خودغرضانہ سوچ کو بدلنا ہوگا اور عورت جو انسانیت کی عمارت کی بنیاد ہے اس کی حفاظت کرنی ہوگی ورنہ عورت کے وجود سے کائنات میں جو رنگ ہے وہ ختم ہو جائے گا اور یہ نخلستان ریگستان میں تبدیل ہو جائے گا۔

(۳) عورت اور لڑکی اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کا حق ہے کہ اس کو اچھی تعلیم دی جائے، اس کے عصمت وعزت کی حفاظت کی جائے۔ اس کے معاشی حقوق محفوظ اور متعین کئے جائیں اور اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کی شادی نہ کی جائے اور اگر اس کے خلاف ظلم وذلت کا برتاؤ ہوتا ہے تو اسے علاحدگی کا حق دیا جائے نیز اس کی حفاظت وکفالت کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۴) عورت کی عزت سب سے محترم چیز ہے۔ کوئی اس کی عصمت و عزت پر ہاتھ نہ ڈال سکے، اس پر جھوٹا الزام نہ لگا سکے، جو ایسا کرے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔ زنا ایک گندہ اور گھنونا فعل ہے۔ شادی کے علاوہ ہر طرح سے کے جنسی تعلق کو غلط اور حرام قرار دیا جائے اور اس کے مرتکب کو سزا دی جائے۔ طلاق اور شادی کا طریقہ آسان بنایا جائے بیوہ کی شادی کی ترغیب دی جائے۔ عورت کو ہر طرح کے ظلم و جور اور بے عزتی سے بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

(۵) سماج میں پاکیزگی کا چلن عام کیا جائے۔ عصمت و عفت صرف عورت کی نہیں ہوتی مرد کی بھی ہوتی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کو اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کی فکر کرنی چاہئیے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: تم مجھے دو چیزوں کی ضمانت دو ایک زبان اور دوسری شرم گاہ میں میں تمھیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اقبال نے جب اپنے بیٹے جاوید اقبال کو لندن اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجا تو بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے ایک نظم لکھی جو جاوید کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا یہ شعر قابل غور ہے۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

آج حالات ایسے ہیں کہ صرف عورتوں کی عصمت دری کا مسئلہ نہیں بلکہ مردوں کی عصمت دری کا مسئلہ بھی ہے۔ لہذا دونوں کو پاکیزہ رکھنے کا اہتمام کرنا حکومت و سماج دونوں کی ذمہ داری ہے اور ہر فرد اور خاندان کو اس کی فکر کرنی چاہیئے۔

(۱) اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کے لئے ہر شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت حساس، بیدار مستعد اور چوکنا رہنا چاہئے۔ آپ کی ذرا سی چوک آپ کو خطرے اور مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔

(۲) ہر خاندان کو اپنے بیٹے بیٹی کی ایسی تربیت کرنی چاہئے جس سے وہ غلط راستے پر نہ جائیں اور ہر اس چیز سے بچیں جوان کے عصمت و آبرو کو خطرے میں ڈالتی ہوں۔

(۳) ہر سماج کو اتنا حساس اور بیدار ہونا چاہئے کہ اگر ان کے ارد گرد کوئی غلط حرکت ہو رہی ہے تو اس پر روک لگانے کے لئے موثر اقدام کر سکے۔

(۴) حکومت اور امن وقانون کی مشنری کو اتنا ذمہ دار، چاق چوبند، حساس اور مستعد رہنا چاہئے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کر سکے۔ شہریوں کے جان و مال، عزت وآبرو کی حفاظت حکومت اور اس کی ایجنسی کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت شہریوں کے جان و مال، عزت آبرو کی حفاظت میں ناکام ہوتی ہے تو اسے حکومت کرنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی حق نہیں ہے۔ حکومت ایسی ہونی چاہئے، جیسا حضورؐ نے فرمایا ''ایک عورت سونا اچھالتی ہوئی مکہ سے حضر موت تک تنہا سفر کرے اور راستے میں اسے صرف خدا کے خوف کے کسی کا خوف نہ ہو۔ نہ چور اچکے کا، نہ ڈاکو اور رہزن کا، نہ زانی اور شرابی کا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی پیاسا مرتا ہے تو اس کی ذمہ داری خلیفۂ وقت پر ہوگی۔ لہٰذا حکومت ایسی کوتاہیوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ عورت کیسا لباس پہنتی ہے، کس وقت باہر نکلتی ہے، تنہا جاتی ہے یا کسی کے ساتھ جاتی یہ سب بعد کا سوال ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ لا اینڈ آرڈر مشنری اپنی ذمہ داری ٹھیک سے ادا کر رہی ہے یا نہیں۔ ہم حکومت کی کوتاہی کو شہریوں کی غلطی کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

صحیح ہے آج فیشن نے عورت سے شرم وحیا کے زیور چھین لئے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ خود فتنہ بن گئی ہیں اور فتنے کا شکار ہوتی ہیں، مگر سماج میں جس قسم کی جنس زدگی پیدا ہوگئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے گھروں میں اپنے باپ بھائی، چچا، دادا، نانا اور دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ ہمارا سماج پوری طرح سڑ گیا ہے اور اس کا خون پیپ بن کر باہر آرہا ہے۔ اس کو بچانا بہت ضروری ہے۔ جو آدمی اپنی بہن بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے اس کو چند پیسوں کے عوض بیچتا ہے وہ اگر دوسری عورت یا لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اس وحشی جانور کو جینے کا حق دینا گویا عصمت دری کا لائسنس دینا ہے۔ کل تک لوگ اسلامی سزاؤں کے منہ آتے تھے، آج کے حالات نے انھیں سخت سزا، موت کی سزا، پھانسی کی سزا کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم اس مسئلہ کو Piecemeal میں حل نہیں کر سکے۔ اس کو پورا سماجی، اخلاقی، اقتصادی، ثقافتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا ہوگا اور جب تک ان مسائل پر In wholesome غور نہیں کیا جائے گا، کچھ جزوی اصلاح سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

کیا آج کے انسان کی Psychology Anatony, Physiology میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ جوانسان کل تھا وہی آج ہے۔ مو جو دہ تہذیب Technology Driven تہذیب ہے جس نے زمین وزمان، وقت اور دوری کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ Interaction اور Mobility بڑھ گئی ہے۔ دوسری طرف Scale بڑا ہو گیا ہے۔ کل تک دنیا کی آبادی چند کروڑ تھی، لوگ الگ تھلگ رہتے تھے۔ آج دنیا کی آبادی اربوں میں ہے اور لوگوں کے بیچ چلت پھرت تیز ہو گئی ہے۔ لہذا اس نے نئے حالات اور نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ماضی میں جو Productioh & Development model تھا وہ اب کام نہیں دے گا۔ ایسے میں عورت اور مرد کے تعلقات کو نئے سرے سے Define کرنے کی ضرورت ہے اور اس کو نئی طرح سے Design کرنا ہوگا۔ یہ امر اسلامی سماج کے لئے اجتہاد کا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ہمیں عہد جدید کی صورت گری کرنی ہے اور ایک Vibrant, Progressive سوسائیٹی احترام ومساوات کی بنیاد پر بنانا ہے۔ اس کے لئے اسلامی علوم میں گہری بصیرت اور بصارت وزمانے کی سمجھ ضروری ہے۔ یہی وقت فراست مومن کے امتحان کا ہے۔ ہم نے اگر ایک بار علم وحکمت سے لیس ہو کر بند تقدیر کی گرہ کھول دی پھر آپ دیکھیں گے کہ کافر دنیا بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گی کہ یہی صحیح اور قابل قبول حل ہے۔ اس کے لئے اپنی بیٹیوں کو بچانا، اس کو پڑھانا، اس کو باشعور، باحیا اور بااختیار بنانا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے ہم سب کو ایمانداری سے ایک بار پھر آئین پیمبر گی طرف آنا ہوگا۔ یہی انسانیت بالخصوص عورت کے دکھوں کا مداوا ہے۔

اختلافی امور میں حضورؐ کا اسوہ

اختلاف ایک فطری عمل

انسان ایک متنوع وجود ہے اور اسی طرح انسانی سماج بھی، اس لئے انسانی سماج میں اختلافات کا پایا جانا فطری ہے۔ عہد نبوی کا اسلامی سماج بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اس مختصر سے مقالہ میں سب سے پہلے اختلاف کے محرکات پر اصولی گفتگو ہوگی، پھر رسولؐ اللہ کی اصولی اور قانونی حیثیت اور پھر ان اختلافی امور کا تذکرہ ہوگا جو آپؐ کے زمانے میں پیش آئے۔ انسان اور انسان کے درمیان ذوق، مزاج، احساس، خواہش، جذبات، داعیات اور مختلف چیزوں کے پسند و ناپسند میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے غم وغصہ، رنج و راحت، نفرت و محبت نیز ایثار و قربانی، دشمنی اور انتقام وغیرہ کے مختلف داعیات رکھے ہیں جو موقع بہ موقع اس کے قول و کردار سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی اختلافات کے یہی وہ داعیات ہیں جن کی وجہ سے افراد، گروہوں اور جماعتوں میں فکر و عمل کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف کبھی تو بر بنائے خلوص ہوتا ہے اور کبھی نفسانیت کی بنیاد پر۔ اختلاف کی ایک وجہ علم و فکر کی قوت میں تفاوت ہے۔ ایک شخص کو اللہ نے ذہن رسا دیا اس کی نگاہ دور تک جاتی ہے وہ معاملات و مسائل کو انتہائی گہرائی میں اتر کر دیکھتا ہے اور ایک رائے قائم کرتا ہے دوسرے کی نگاہ اتنی دوررس نہیں ہوتی۔ لہذا دونوں کے سوچنے اور کرنے کے انداز میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ کون اختلاف مبنی بر خلوص ہے یا نفسانیت کی بنیاد پر ہے اس کو جانچنے کے لئے ہمارے پاس کچھ ٹھوس پیمانے موجود ہیں۔

(۱) وہ کتاب وسنت سے کتنا مطابقت رکھتا ہے یا کتنا مختلف ہے؟

(۲) اس کے عقلی دلائل کیا ہیں؟

(۳) اس کا فائدہ یا نقصان کیا ہے اور، اس سلسلے کے تجربات کیسے ہیں وغیرہ

رسول کی اصل حیثیت

اسلام اپنے معاشرے کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ اسلام کے اساسیات میں

رسولؐ پر ایمان خدا کے بعد دوسرے مقام پر ہے۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ایمان باللہ کا لازمی تقاضا ایمان بالرسول ہے۔کیونکہ ایمان باللہ تو اعتقاد ہےاور ایمان باالرسول عمل بالا ایمان باللہ ہے۔ اس لئے کوئی شخص اگر اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کا قائل ہےاور ایمان بالرسول نہیں رکھتا ہےتو اس کا ایمان نہیں بلکہ نفسانیت کی ایک قسم ہےاور اس طرح گو یا وہ ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے کیونکہ اسے وحی والہام کی دولت میسر نہیں جس کے بغیر خدا کی مرضی معلوم کرنا ناممکن اور اس کے احکام کی بجا آوری ناممکن تر ہے۔اس لئے قرآن نے رسول پر ایمان کو بنیادی حیثیت سے پیش کیا ہےجس کا لب لباب یہ ہے کہ

بہ مصطفےٰ بہ رسا ں خویش کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بو لہبی است

چنانچہ وحی الہیٰ کےاولین مخاطبین سے کہا گیا۔

(۱) کہو میں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا۔

(۲) رسولؐ تم پر گواہ ہیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

(۳) رسولؐ تم کو جو کچھ دیں اس کو لےلو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

(۴) خبردار رسولؐ جس امر کا فیصلہ کر دیں اس میں اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔

(۵) اے نبی آپ کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

(۶) اطاعت کرو اللہ کی ،اللہ کے رسولؐ اور اولی الامر کی اور اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کے طرف پھیر دو۔

(۷) جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بڑی کامیابی حاصل کی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ صریحاً گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

(۸) رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اذن سے ہے۔رسول اللہؐ نے فرمایا ’’خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہےتم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک تمہاری خواہش نفس اس بات کو ماننے نہ لگے جسے میں لےکر آیا ہوں‘‘ (حدیث)

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا ’’خدا کی قسم تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے

جب تک میں تم کو تمہارے ماں باپ عزیز رشتہ دار حتیٰ کے تمہاری اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں''

رسولؐ کی اصل حیثیت مبلغ، معلم، مزکی اور حکیم کی ہے۔

یہ نبی تم ہی میں سے ہیں جو تمہیں کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہارے نفس کو پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

تزکیہ نفس، رسولؐ کی بعثت کے بنیادی اغراض میں داخل ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک یہی بعثت کی واحد غرض ہے۔ رسولؐ ان آلائشوں اور گندگیوں سے پاک کرتا ہے جس کا بوجھ فرد اور سماج کی کمر توڑ دے رہا ہے۔ وہ انسانی نفس میں پائے جانے والے کسی داعیہ کو دبانے اور ختم کرنے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کا تزکیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے قد افلح من زکھا وقد خاب من دسا ھا چاہے وہ غصہ، نفرت وانتقام کا داعیہ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں غصہ ہے تو ظلم کے خلاف، نفرت ہے تو شرک وجہالت سے، انتقام ہے تو خدا اور انسان کے دشمنوں سے۔

ان تعلیمات کی خمیر سے اٹھی امت میں اوّلاً تو کسی اصولی اختلاف کا پیدا ہونا امر محال ہے اور اگر کسی وجہ سے پیدا ہو جائے تو اس کا حل نہ ہونا ناممکن ہے۔ اس لحاظ سے صحابہ کے معاشرہ میں اختلاف یا نزاع تو پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن وہ بھی انسان تھے اس لئے بعض اوقات ان کے درمیان اختلاف رونما ہو جاتا تھا.............

عہد نبوی میں اختلافات کی نوعیت

اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایسے کون کون سے واقعات تھے، صحابہ نے اس موقع پر کیا رویہ اختیار کیا اور رسولؐ نے اس نزاع کو کیسے فرو کیا اور آج کی مسلم سوسائٹی اور اسلامی قیادت کو اس سلسلے میں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

میں نے جن اختلافات کو یہاں جمع کیا ہے ان کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

(۱) گھریلو نوعیت کے اختلافات اور آپؐ کا اسوہ۔ جیسے حضرت عائشہ کی آپؐ سے نوک

جھونک؟ آپؐ کا ترک شہد، حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے اختلاف اور آپؐ کا ردعمل۔
ازواج مطہرات اور آپؐ کے درمیان گذارے کی رقم کے مسئلہ میں اختلاف

(۲) کسی دو صحابی میں شخصی نوعیت کا اختلاف اور آپؐ کا اسوہ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان کسی معاملہ پر اختلاف، حضرت ابوبکر کی ایک لڑکے پر ناراضگی جس کے آپ ولی تھے جس نے حضرت عائشہؓ کے سلسلے میں غلط فہمیاں پھیلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ حضرت زینب اور حضرت زید کا اختلاف

(۳) صحابہ کے دو گروہ میں اختلاف اور آپؐ کا اسوہ، انصار و مہاجرین کا جھگڑا۔ اطلاع فاسق سے برپا نزاع، جنگ بدر کے قیدیوں کا مسئلہ عبداللہ بن ابی کی سیہ کاریاں۔ صحابہ کا طرز عمل اور آپؐ کا اسوہ۔

(۴) اعتقادی اور فقہی اختلاف اور آپؐ کا اسوہ: تقدیر کے مسئلہ پر صحابہ کے درمیان بحث، ایک خاص مقام پر نماز پڑھنے کی آپ کی ہدایت اور صحابہ میں اختلاف، تیمم کے مسئلہ پر اختلاف۔

(۵) فنی معاملات میں اختلاف اور آپؐ کا اسوہ، کھجور میں پیوند لگانے کا مسئلہ، جنگ بدر میں اختلاف، جنگ خندق میں نئی تکنیک اختیار کرنے کی کوشش۔

(۶) آپؐ کی حکمت عملی سے اختلاف اور آپؐ کا اسودہ، جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر اختلاف۔ غنائم کے مسئلہ پر رونما اختلاف وغیرہ۔

(۱) رسول اللہؐ کی عائلی زندگی انتہائی خوشگوار اور حد درجہ مثالی تھی۔ اگرچہ آپؐ کے گھر میں ہمیشہ تنگی اور فاقہ رہتا تھا لیکن اس کے باوجود فقر و استغنا کی دلنواز کیفیت طاری رہتی اور ہر آن شکر و صبر کا احساس اجاگر رہتا۔ آپؐ کی ازواج مطہرات ہر حال میں آپؐ کی شریک حال رہتیں اور کوئی ایک لفظ بھی بطور شکایت اپنی زبان پر نہیں لاتیں۔ حضرت خدیجہؓ سے کبھی آپؐ کا کوئی اختلاف ہوا ہو اس کا تاریخ و سیرت کی کتابوں میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن کبھی کبھی آپؐ کے گھر میں بھی اختلاف و نزاع کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً کبھی دو سوکنوں میں طنزیہ بات ہوگئی یا کبھی آپؐ سے براہ راست کچھ نوک جھونک ہوگئی اور کسی بیوی

نے منہ درنہ جواب دے دیا جیسے ایک بار حضرت عائشہؓ اور ایک بار حضرت حفصہؓ نے آپؐ کے سامنے زور زور سے بات کی جس کو سن کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کافی برہم ہوئے اور اپنی اپنی بیٹیوں کو مارنے دوڑے لیکن آپؐ نے بیچ میں پڑ کر ان لوگوں کو بچا لیا اور احسان جتاتے ہوئے کہا ''دیکھا کیسے میں نے اس شخص سے تمہاری حفاظت کی'' لیکن یہ واقعات چونکہ معمولی نوعیت کے تھے اور اس میں وقتی طور پر مزاج میں تیزی پیدا ہو گئی تھی اس لئے یہ فوراً رفع دفع ہو گیا اس میں ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ روز مرہ کے گھریلو زندگی میں جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں اس کی کوئی Serious Notice نہیں لینی چاہئے بلکہ خوش اخلاقی سے ٹال جانا چاہئے۔ اگر ہر چھوٹی بات پر ہم لڑ پڑیں گے تو خاندان کا امن درہم برہم ہو جائے گا اور یہ چھوٹی بات بڑی بات بن جائے گی جو بالآخر تباہ کن ہو گی۔ لیکن آپؐ کی خاندانی زندگی میں چند ایسے واقعات بھی ہیں جو دور رس نتائج کے حامل ہیں جس نے کافی خطرناک رخ اختیار کر لیا تھا۔ ایک واقعہ آپؐ کا ترک شہد ہے دوسرا ازواج مطہرات کا گذارے کے لئے زیادہ رقم کا مطالبہ اور تیسرا حضرت عائشہؓ پر اتہام۔ یہ ایسے نازک معاملات تھے جس کی صفائی کے لئے براہ راست اللہ تعالیٰ کو Intervene کرنا پڑا تا کہ نبی کی حیثیت، اس کی عصمت اور پوزیشن لوگوں پر واضح ہو جائے اور معاملات کی حد متعین ہو جائے۔ آپؐ کا ترک شہد محض اس وجہ سے تھا کہ بعض ازواج نے یہ شکایت کی تھی کہ آپ کے منہ میں شہد کی جو بو آتی ہے وہ اچھی نہیں لگتی جس کی وجہ سے آپ نے شہد کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جبکہ آپؐ کو شہد بے حد مرغوب تھا چونکہ آپؐ کی حیثیت مرجع ہدایت کی ہے چنانچہ امت میں شبہہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ہو نہ شہد ہو کھانا حرام یا مکروہ ہے اس لئے تو آپؐ نے اسے چھوڑا تھا اس طرح غلط فہمی میں لوگ ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیں اور یہ کوئی عجوبہ بات نہیں تھی بلکہ پچھلی قومیں اس طرح کی بعض گمراہیوں میں مبتلا ہو چکی تھیں مثلاً حضرت یعقوبؑ نے ایک بیماری کے باعث اونٹ کا گوشت بطور پرہیز کھانا چھوڑ دیا تو یہودیوں کے ایک بڑے طبقے نے اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کی حیثیت کا احساس دلاتے ہوئے حکم دیا کہ ''اے نبی آپؐ نے کیوں حرام کر

لیا ایک چیز کو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے۔ کیا آپؐ بیویوں کی رضا مندی چاہتے ہیں۔ اللہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے'' ساتھ ہی ازواج مطہرات کی سخت تنبیہ کی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں طلاق دلا کر تم سے بہتر بیویاں عطا کرے گا۔ چونکہ وہ سب صاحب ایمان تھیں اس لئے انہوں نے فوراً اپنی اس روش سے توبہ کیا اور نبیؐ نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے اس قضیہ سے نجات حاصل کی۔ اس طرح بعض ازواج نے زیادہ گذارے کی رقم کا مطالبہ کیا جو اس وقت کی صورتحال میں ایک زیادتی تھی اور جس کا اثر نبیؐ کے مشن پر پڑ سکتا تھا اور آپ ایک شدید خلجان میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو صاف نوٹس دے دیا کہ اگر وہ اپنے مطالبے سے باز نہیں آتیں تو انہیں مالِ دنیا دے کر رخصت کر دیا جائے گا اور ان سے امت کی مائیں ہونے کا اعزاز چھین لیا جائے گا۔ تیسرا واقعہ حضرت عائشہؓ پر اتہام کا تھا جو مذکورہ دونوں واقعہ سے شدید تر تھا۔ یہ ایک قیامت کی گھڑی تھی۔ یہ صرف آپ کا گھریلو معاملہ نہیں تھا بلکہ اس میں پوری اسلامی سوسائٹی کی پاکیزگی طہارت اور عصمت وعفت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ تنہا وہ گھریلو واقعہ تھا جس نے آپؐ کے اعصاب کو بے حد متاثر کیا۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے ملنا ترک کر دیا۔ افواہوں کا بازار گرم تھا۔ اچھے اچھے صحابہ غلط پروپگنڈے کے شکار ہو گئے تھے۔ منافقین کو خوب کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔ غرض ہر کروٹ کانٹا ہی کانٹا تھا۔ اس معاملہ کو بھی قریب ایک ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف خاص سے حل کر دیا اور علیم وخبیر نے حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کا واضح اعلان فرمایا۔

یہ واقعہ جہاں اپنی نوعیت میں اتنا سنگین تھا وہیں اس شر سے خیر کا یہ پہلو برآمد ہوا کہ اس کے ذریعہ بہت سارے معاشرتی قوانین نازل ہوئے جو معاشرہ کے استحکام و پاکیزگی کے لئے انتہائی ضروری تھے۔ ان واقعات کے مطالعہ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہیں

(۱) معمولی واقعات کی زیادہ نوٹس نہیں لینی چاہئے۔

(۲) کسی کی خاطر چاہے وہ کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو خدا کی مقرر کردہ حدوں کو نہیں توڑنا چاہئے اور کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کر لینا چاہئے۔

(۳) دین کے تقاضوں کی تکمیل میں جو چیزیں مزاحم ہوں اسے بر وقت چھوڑ دینے کا عزم رکھنا چاہئیے اوراس سلسلے میں کسی محبت اور تعلق کوراہ کی رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیئے۔

(۴) الزامات اتہامات کی صورت میں صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئیے اور واقف کار لوگوں کوآگے آ کر مسئلہ کی صحیح نوعیت سے آگاہ کرنا چاہئیے تا کہ غلط فہمی دور ہو۔اس سلسلے میں سوسائٹی پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بے سروپا باتوں کواڑانے اور پھیلانے سے پرہیز کرے تا کہ معاشرہ کی عفت وپاکیزگی پرآنچ نہ آئے۔

آپ ؐ کی گھریلو زندگی کا ایک وہ حصہ بھی ہے جس کا تعلق آپ ؐ کی سب سے چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ ؓ اور سب سے چہیتے بھائی اور داماد حضرت علیؓ سے ہے۔کبھی کبھی ان دونوں کے درمیان کہاسُنی ہوجایا کرتی تھی۔ایک بار حضرت فاطمہ ؓ غصہ اور ناراضگی میں اپنے گھر سے نکلیں اور حضورؐ کے پاس آئیں اور حضرت علیؓ کی زیادتیوں کا ذکر کیا،حضرت علیؓ پیچھے پیچھے آئے اوران کی ساری باتیں سنی۔لیکن حضوؐران باتوں سے نہ غصہ ّ ہوئے اورنہ ناراض ہوئے بلکہ دونوں کوسمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔اس طرح ایک دوسرے کوعفو درگذر کی تلقین کی۔حضرت علیؓ کوابوتراب کا لقب اسی طرح کے کسی واقعہ کی یادگار ہے جبکہ وہ ناراض ہوکر گھر سے نکلے اور مسجد نبوی کے خاک صحن پر جا لیٹے۔

رسولؐ نے اس وقت بھی ان کو بڑے پیارے سے پکاراابوتراب کہہ کراٹھایا(یہ لقب انکو بہت پسند آیا)اور سمجھا بجھا کر گھر روانہ کر دیا۔لیکن حضرت فاطمہ ؓ کی حیات میں جب ایک بار انہوں نے دوسری شادی کرنا چاہا تو آپ ؐ کوسخت قلق ہوااورآپ ؐ نے فرمایا''فاطمہ میرے گوشت کا حصہ ہیں کسی نے اگراس کوتکلیف پہنچائی تو اس نے مجھے تکلیف پہنچائی''نیزآپ ؐ نے یہ بھی کہا کہ میں کسی حلال کوحرام نہیں کرتا۔اگر چہ اسلام میں ایک سے زاید بیویاں رکھنے کاایک مرد کوحق حاصل ہےاور قانونی طور پراس میں کوئی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا بشرطیکہ وہ عدل کی شرط پوری کرتا ہولیکن اولاً تو یہاں رسول اللہؐ کی بشریت اورایک باپ کا دل بول رہا تھا دوم اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جائز امور میں اورکسی ایسے کام میں جس کوکرنے نہ کرنے ،دونوں کی اجازت ہوتو اس میں اختلاف ہوسکتا ہے اورایک آدمی شخصی حیثیت میں انفرادی سطح پرروک بھی سکتا ہے۔یہ معاملہ قانونی نہیں اخلاقی ہے۔

رسول اللہؐ کے اس ارشاد کی حیثیت بھی قانونی نہیں اخلاقی تھی۔

(۲) اختلاف کی دوسری قسم وہ ہے جس میں بعض اوقات کسی دو صحابی میں شخصی نوعیت کا جھگڑا ہو گیا۔

اس طرح کے واقعات کئی ہیں جیسے ایک بار حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع برپا ہو گیا، غلطی حضرت ابوبکرؓ کی ہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی انہیں احساس ہوا فوراً انہوں نے معافی مانگی لیکن حضرت عمرؓ اس قدر برہم تھے کہ انہوں نے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ آخرت کی جوابدہی کا شدید احساس رکھنے والے حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے سامنے سارا ماجرا کہہ سنایا اور آب دیدہ ہو کر کہا کہ عمر مجھے معاف نہیں کرتے۔ آپؐ کو حضرت عمرؓ کی ضد پر رنج ہوا اور آپؐ نے کہا جو ابوبکر کو معاف نہیں کرتا اللہ بھی اس کی غلطیوں پر اسے معاف نہیں کرے گا۔ حضرت عمرؓ کو جب رسولؐ پاک کی برہمی کی اطلاع ملی تو ان کا سارا غصہ کافور ہو گیا اور انہوں نے جہاں ایک طرف حضرت ابوبکرؓ کو معاف کر دیا وہیں دوسری طرف اپنی اس حرکت پر معافی طلب کی۔ اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ وہ ہے جبکہ حضرت عائشہؓ پر اتہامات کی طوفانی ہوا چل رہی تھی اور اس میں بعض اچھے صحابی بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ملوث تھے۔ ایک لڑکا جو انتہائی غریب اور بے سہارا تھا حضرت ابوبکرؓ اس کی کفالت کیا کرتے تھے وہ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا چنانچہ اس کی اس حرکت پر آپ کو بہت قلق ہوا اور آپ نے اس کی کفالت بند کر دی۔ یہ عین تقاضائے فطرت تھا۔ لیکن رحیم وکریم خدا کے کمالات ہی دوسرے ہیں وہ جس طرح چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور انتہائی نافرمانوں، ظالموں اور کٹر سے کٹر کافروں، جابروں کو جینے پھلنے پھولنے کا سامان فراہم کرتا ہے اس نے ہدایت دی کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے اور اس کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کیا جائے۔

شخصی نوعیت کے معاملات میں دو واقعات وہ ہیں جو دو میاں بیوی کے درمیان پیش آئے۔ ایک حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا واقعہ اور دوسرا ایک انصاری صحابہ اور صحابیہ کا۔ حضرت زیدؓ کو جب رسول اللہؐ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تو ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور آپؐ کے منانے سمجھانے کے باوجود حضرت زیدؓ نے حضرت زینب کو طلاق دے دیا۔ دوسرا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے ایک انصاری

کی شادی ایک صحابیہ سے ہوگئی لیکن وہ شکل وصورت کے اعتبار سے اچھے نہیں تھے چنانچہ وہ ان کو مطلق پسند نہیں کرتی تھیں جبکہ دوسری طرف ان صحابی کا حال یہ تھا کہ وہ جان ودل سے ان پر فریفتہ تھے اوران کے فراق میں روتے رہتے تھے۔اس موقع پر بھی رسول اللہؐ نے اس عورت سے اپنے شو ہر کے گھر جانے کو کہا اور رشتہ منقطع نہ کرنے کا مشورہ دیا۔انہوں نے دریافت کیا کہ رسول اللہؐ یہ آپؐ کا حکم ہے یا مشورہ۔آپؐ نے فرمایا کہ میرا مشورہ ہے۔تب انہوں نے عرض کیا میں یہ مشورہ مان کر نہیں دیتی۔ان دونوں واقعہ کے بے شمار فنی پہلو ہیں جس پر اگر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو خود یہ ایک طویل مقالہ ہو جائے۔لیکن ہمیں صرف اشارات سے کام لینا ہے۔

(۱) ازدواجی تعلقات کی بہتری فریقین کی رضامندی اور باہمی احترام والفت پر منحصر ہے اگر اس میں کمی ہو تو اس کو قانون سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ایسا کوئی قانون جو جبراً لازماً دونوں کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرے خاندانی نظام درہم برہم کر کے رہے گا۔جس کا اثر اس گھر میں پروردہ نسل پر علیحدگی اختیار کرنے سے زیادہ شدید پڑیگا۔اس لئے اسلام نے خاندانی معاملات میں اکراہ سے گریز کیا ہے۔تعلقات میں اگر بگاڑ پیدا ہو جائے چاہے اس کی جو وجہ بھی ہو تو اس کے اصلاح کی کوشش کی جائے گی جس کے لئے مختلف طریقے قرآن وسنت میں بیان کئے گئے ہیں لیکن اگر فریقین میں سے دونوں یا کوئی ایک مل جل کر رہنا پسند نہ کرے تو ڈنڈے کے زور سے اس کو ایک ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔اسلام کا عائلی نظام اپنی اسی لچک کی وجہ سے اتنا مستحکم ہے ورنہ سختی برتی جائے تو یوروپ کی آوارگی پھیلے گی یا پھر خودکشی اور خودسوزی اور قتل وخون ریزی کی واردات میں اضافہ ہوگا۔

(۲) پہلے واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت نظر آتی ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ کو منہ بولے بیٹے کی قانونی اوراخلاقی حیثیت کو ختم کرنا تھا اس لئے اللہ کے منشا کے تحت ایسا ہوا۔اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ذریعہ سے اس غلط رسم کو توڑا۔فی الواقع عقلی اور قانونی حیثیت سے منہ بولے بیٹے کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن سماج میں چونکہ یہ بات چل پڑی تھی اس لئے لوگ اس کو حقیقی بیٹا جیسا سمجھنے لگے تھے۔نہ کسی عورت کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں ہو جاتی ہے اور بہن کہنے سے بہن ہو جاتی ہے اسی طرح کسی کو بیٹا کہہ دینے سے وہ بیٹا نہیں ہو جاتا ہے۔

اس لئے اس کی کوئی قانونی، شرعی عقلی، عملی اور اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو نہیں توڑا جاتا تو اسلام کے قانون وراثت میں بے شمار پیچیدگی پیدا ہو جاتی پھر اس کا کوئی Basis متعین کرنا مشکل ہو جاتا۔

(۳) رسول ہر وقت اور ہر حال میں رسول ہوتا ہے۔ اس کے تمام احکامات واجب الاطاعت ہوتے ہیں۔ اس سے انکار معصیت ہے یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ پھر ان لوگوں نے آپؐ کی اطاعت کیوں نہیں کی؟ رسول رسول ہونے کے باوجود انسان ہے اور وہ جب اپنی انسانی حیثیت میں مخاطب ہوتا ہے کوئی ضروری نہیں کہ اس کی بات مان لی جائے جبکہ خود اس بات کو اس حیثیت سے پیش نہیں کیا کہ اس امر میں اس کی اطاعت لازمی ہے۔ چنانچہ جب صحابہ نے اطمینان کرلیا کہ یہ بات من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ آپؐ کا مشورہ ہے تو اپنے حالات کے تحت انہوں نے آپؐ کا مشورہ کبھی قبول کیا اور کبھی نہیں کیا۔ یہ دراصل رسولؐ کی نافرمانی نہیں ہے۔ بلکہ اگر واقعہ کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہؐ نے محض مروت میں حضرت زیدؓ سے طلاق نہ دینے کو کہا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آپ کی شادی حضرت زینبؓ سے ہوگی اور آپؐ کے ہاتھوں یہ رسم ٹوٹے گی۔ یہ دوسرے واقعہ کی حیثیت بھی واضح ہے کہ آپ نے محض اظہار خواہش کیا تھا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ اس لئے انکار پر آپؐ نے کسی ناراضگی یا برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ واقعات اسلامی سوسائٹی میں شخصی اور عائلی معاملات میں فرد کے حقوق اور اس کے حدود متعین کرتے ہیں نیز ارباب حل وعقد کو بھی ان کے احترام کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۴) رسول اللہؐ کے زمانے میں بعض اوقات مسلمانوں کے دو گرہوں میں شدید جھڑپ ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی عرب کے عام رواج کے تحت تلواریں نیام سے نکل آتی تھیں۔ یہ انتہائی سخت موقع ہوتا تھا اور آپؐ نے اسے جس حسن وخوبی سے انجام دیا اس میں ہمارے لئے ایک سبق ہے مکہّ کے مسلمان مہاجرؓ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینہ پہنچے۔ مدینہ کے مسلمانوں نے ان کا خوشی خوشی استقبال کیا اور اپنا گھر حتیٰ کہ جس کی دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو اپنے مہاجر بھائی کے حوالے کرنے کا آفر دیا۔ لیکن جہاں ایک طرف یہ کیفیت

تھی وہیں اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھتے ہوئے منافقین کا ایک گروہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اس نے ہر ایسے نازک موقع پر جبکہ مسلمان کسی آزمائشی مرحلے سے گذر رہے تھے اپنی سیہ کاریوں سے اسلامی جماعت کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آیا۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی تھا یہ وہ شخص تھا جس کو لوگوں نے رسول اللہؐ کے مدینے آنے کے چند روز قبل اپنا بادشاہ بنانا چاہا تھا اور اس کی تاج پوشی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ لیکن آپؐ کے مدینے پہنچتے ہی وہاں کا Power Equation بالکل بدل گیا اور اس کے ارمانوں پر منوں مٹی پڑ گئی۔ عبداللہ بن ابی نے اسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اپنی اخلاقی ساکھ قائم رکھنے کے لئے اسلام قبول تو کر لیا تھا لیکن ایمان اس کے دل میں اترا نہیں تھا۔ یہ اس کی محض ایک سیاسی چال تھی۔ چنانچہ اس نے اندر سے Sabotage کرنے کا پروگرام بنایا اور اس طرح کوئی ایسا ہی موقع تھا کہ جب اسلامی فوج ایک مہم سے واپس لوٹ رہی تھی اس نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ایک انصاری اور ایک مہاجر پانی لینے کنویں پر گئے۔ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی مدد کے لئے اپنے اپنے قبیلے کے لوگوں کو آواز دی۔ عبداللہ بن ابی نے فوراً معاملے کا رخ انصار و مہاجرین کی طرف پھیر دیا اور کہا کہ اب یہ ذلیل لوگ ہم پر چڑھ بیٹھے ہیں۔ دراصل ہم نے ہی ان سانپوں کو دودھ پلا کر پالا ہے۔ چلو مدینہ چلیں وہاں عزت دار لوگ ان ذلیل لوگوں کو نکال دینگے۔ یہ خبر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپؐ کو شدید صدمہ ہوا اور آپؐ نے انصار کے کچھ ہوش مند لوگوں کو معاملے کی نزاکت سے آگاہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ تاب نہ لا سکے اور کہا رسول اللہؐ اگر اجازت دیں تو ابن ابی کو قتل کر دوں۔ لیکن آپؐ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ دراصل ابن ابی کے بہت سارے ہمدرد اسلامی جماعت میں پائے جاتے تھے لہذا اس کے خلاف کوئی ایسی کارروائی جو انتقامی نوعیت کی ہوتی اسلامی جماعت کے مفاد میں نہیں تھی۔ ایک بار مدینہ میں ہی عبداللہ بن ابی نے آپؐ کی شان میں منہ در منہ گستاخی کی تھی اور جب آپؐ نے اس کی شکایت سعد بن معاذ سے کیا تو انھوں نے کہا یا رسول اللہؐ آپ اس کے ساتھ نرمی سے کام لیجئے یہ شخص بہت دکھی ہے۔ آپؐ کی آمد سے قبل ہم لوگ اسے اپنا بادشاہ

بنانے والے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کوایسا کرنے سے منع کیا۔ جب اسلامی لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ عبداللہ بن ابی کا بیٹا جوسچا مسلمان تھا تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ تم نے کہا تھا کہ عزت دار لوگ ذلیل لوگوں کو مدینے سے نکال دینگے تو ہم تم کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دینگے۔ ابن ابی نے لوگوں کو آواز دی لیکن انہوں نے کہا جب تک رسول اللہؐ اجازت نہیں دینگے نہ میں تمہیں زندہ چھوڑونگا اور نہ مدینہ میں دا خل ہونے دونگا۔ آپؐ نے ابن ابی کے بیٹے کو باپ کی جان بخشی کی ھدایت کی اور اسے مدینے میں داخلے کی اجازت دے دی۔ اس واقعہ نے عبداللہ بن ابی کی رہی سہی ساکھ کوختم کر دیا اور وہ ذلیل ہوکر رہا۔ اس واقعہ کے بعد حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور کہا کہ اگر میں تمہیں قتل کی اجازت دے دیتا تو معاملہ بالکل برعکس ہوتا۔ اس واقعہ سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلامی قیادت کسی ایسے شخص کے خلاف کاروائی کرتے وقت اپنے Relative weight کو کم محسوس کرتی ہے تو فتنہ کو ہوا دینے کے بجائے اس کے خلاف انتقامی اور تادیبی کاروائی کرنے سے اس وقت تک گریز کرسکتی ہے جب تک لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ واقعہ ایک ہوش منداور معاملہ فہم قیادت کیلئے نشان راہ ہے۔ عبداللہ بن ابی کو آپ نے مدت العمر مہلت دی۔ اس کی ہر چال کی کاٹ کی اور ہر معاملہ میں اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ آپؐ نے حسن تدبیر سے اس کے تمام زہریلے دانت توڑ دیئے اور اس کی تمام اخلاقی حمایت ختم ہوکر رہی۔ حتیٰ کہ جب وہ مرگیا تو آپؐ نے اپنا کرتہ اتار کر دیا اور اس کی نماز جنازہ ادا کی۔ ان تمام واقعات نے منافقین کے دل بیٹھا دیئے اور آپؐ کی اخلاقی ساکھ پوری طرح قائم ہوگئی۔ اس طرح ایک سانپ بغیر مارے مرگیا۔

مسلمانوں میں فساد برپا کرنے اور ان کو لڑانے کی ایک کوشش ایک صاحب جن کا نام عبداللہ بن ابی سرح ابن ابی معیط تھا اس وقت کیا جب رسولؐ نے بنی قریظہ کی طرف ان کو زکوۃ وصول کرنے کے لئے روانہ کیا۔ ان صاحب کی زمانہ جاہلیت میں اس قبیلہ سے لڑائی رہی تھی۔ جب وہ رسول اللہؐ کے قاصد کی حیثیت سے وہاں پہنچے تو لوگ ان کا استقبال کرنے کے لئے اپنی روایتی شان کے ساتھ گھروں سے نکل پڑے ان کو اندیشہ ہوا کہ شاید

لوگ ان کو مارنے آ رہے ہیں چنانچہ یہ راستے سے ہی لوٹ گئے اور رسولؐ سے جا کر عرض کیا کہ ان لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کیا اور وہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ اسلام میں جو زکوۃ نہیں دیتا گویا اس نے خروج کیا چنانچہ آپؐ نے حکم دیا کے اس قبیلے کے خلاف فوجی کاروائی کی جائے۔ اسلامی لشکر روانہ ہی ہونے والا تھا کہ وحی آئی کہ یہ اطلاع غلط ہے۔ اس موقع پر قرآن نے یہ اعلان کیا ''اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو ورنہ تم نادانی میں کوئی ایسی غلطی کر جاؤ گے جس سے بعد میں پشیمانی ہوگی۔'' آج کا مسلم سماج اگر اس اصول کو اپنے پیش نظر رکھے تو وہ بہت سے جھوٹے پروپیگنڈے اور الزام تراشیاں جو بعض اخبارات و رسائل اور اصحاب جبہ و دستار نے شروع کر رکھا ہے آسانی سے ختم ہو جائینگے۔ رسول اللہؐ کا اسوہ معاملات کی تحقیق کر لینے کا ہے۔ حتیٰ کہ مقدمات کا فیصلہ دیتے وقت آپؐ صاف صاف فرمادیا کرتے تھے'' کہ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں لہٰذا اگر کسی نے جھوٹی گواہی دی اور میں نے اس پر اعتماد کر کے کوئی فیصلہ دے دیا تو اس کا وبال اس کے سر ہوگا'' بہر حال اپنی حد تک کسی قضیہ کی پوری تحقیق کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔

اجتماعی نوعیت کا تیسرا واقعہ بدر کے قیدیوں کا ہے صحابہ میں اس امر پر اختلاف تھا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ایک گروہ کی رائے تھی کہ ان کو قتل کر دیا جائے، دوسرے کی رائے یہ تھی کہ احسان کا معاملہ کرتے ہوئے انہیں چھوڑ دیا جائے اور تیسرا گروہ اس حق میں تھا کہ ان سے فدیہ لیا جائے۔ بالآخر یہ بات طے پائی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یاد دہانی کراتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کی لڑائی کا مقصد فدیہ وصول کرنا نہیں ہے اس لئے جب کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو ساری توجہ پہلے ان کی طاقت کو کچلنے پر صرف کرنا چاہئے اور جب جنگ میں لوگ پکڑے جائیں تو ان کے ساتھ متذکرہ تینوں صورتوں میں سے جو صورت جس وقت مناسب حال معلوم ہو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(۴) اختلاف کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کسی اعتقادی یا فقہی معاملہ میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات رونما ہو ایسی صورت میں قرآن و سنت نے چند واضح اصول بیان فرمائے

ہیں۔قرآن نے بتایا کہ قرآنی آیات کی دوقسمیں ہیں ایک محکمات دوسری متشابہات ۔ محکمات ان امور کو کہتے ہیں جو واضح ہیں اور جن کا تعلق ہماری زندگی کے روز مرہ کے معاملات اوراحکامات سے ہیں جس میں امر و نہی وغیرہ آتے ہیں۔متشابہات کا دائرہ انسانی عقل وادراک سے ماورا ہے چونکہ انسان ان حقائق کا دنیا میں شاہد عینی نہیں ہوسکتا اس لئے اس کی صحیح نوعیت اور کیفیت سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں انسان کو ضروری معلومات تو ضرور فراہم کردیئے گئے ہیں لیکن تفصیلات کا علم اس طرح نہیں دیا گیا ہے کہ وہ خود سے اس کو Observe کر سکے لہذا اس سے یہ کہا گیا ہے کہ رسول پر اعتماد کرتے ہوئے ان حقائق واطلاعات کو برحق جانے ۔اسی قسم کا ایک معاملہ تقدیر کا ہے۔اس مسئلہ پر زمانہ قدیم سے لوگ بحث کرتے آرہے ہیں اور جتنا جتنا اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں اتنا ہی گمراہ ہوتے جارہے ہیں۔ ماضی میں بہت ساری قومیں اسی ایک مسئلہ کی غلط تعبیر کی وجہ سے فکر وعمل کے بے شمار گمراہیوں میں مبتلا ہوگئیں ۔ چنانچہ رسولؐ نے اس مسئلہ پر لوگوں کو ان مجمل معلومات پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔اوراس مسئلہ پر بحث ودلائل کے ثبوت میں قرآن کی مختلف آیتوں کو پیش کررہا تھا۔جب آپ نے سنا تو سخت ناراض ہوئے حتیٰ کہ آپ کے چہرے پر انار کے دانوں کی طرح گرہیں (سرخہ) نمایاں ہوگئیں اور آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی وجہ سے ہلاک اور گمراہ ہوئی ہیں ۔تم کتاب اللہ کی آیات کو باہم ٹکراتے ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اس سلسلے میں جتنا علم دیا گیا اس کے دائرے میں رہ کر اس پر غور کریں بے بنیاد اور لا حاصل گفتگو میں نہ الجھیں اور اپنی بے عملی اور کمزوری کے لئے اس کو دلیل نہ بنائیں۔اختلاف کی دوسری نوعیت فقہی ہے۔اس سلسلے میں کئی واقعات ملتے ہیں فقہی اختلافات کے معاملہ میں رسول اللہؐ کے اسوہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے میں شارع نے بڑی لچک رکھی ہے اور چیزوں کے Form سے زیادہ اس کے Spirit کو اہمیت دی ہے۔ایک بار آپؐ نے صحابہ کے ایک گروہ کو ایک مہم پر روانہ کیا اور حکم دیا کہ فلاں مقام پر پہنچ کر عصر کی نماز ادا کریں،عصر کا وقت راستے میں ہوگیا۔صحابہ میں اختلاف رونما ہوا۔ایک نے کہا آپ کے کہنے کی غرض یہ تھی کہ عصر تک اس مقام پر پہنچ

کر نماز ادا کرو چونکہ ہم لوگ وقت پر وہاں نہیں پہنچ رہے ہیں اس لئے نماز کا وقت ہو چلا ہے۔نماز یہیں ادا کر لی جائے۔دوسرے نے کہا کہ نہیں آپ ؐ نے فرمایا کہ عصر کی نماز فلاں مقام پر ادا کرو لہذا ہم لوگ وہیں نماز ادا کرینگے۔اس میں وقت کی قید نہیں ہے۔اس طرح کے دو صحابی سفر کر رہے تھے راستے میں نماز کا وقت ہو گیا لیکن پانی میسر نہیں ہوا تھا اس لئے ان لوگوں نے تیمّم کر کے نماز ادا کی تھوڑی دور جانے کے بعد پانی مل گیا تو ایک نے کہا نماز دہرالی جائے لیکن دوسرا راضی نہ ہوا۔ایک نے نماز دہرالی اور دوسرے نے نہیں دہرایا۔ان دونوں واقعات کی اطلاع جب آپ ؐ کو دی گئی تو آپ ؐ نے دونوں استحسان فرمایا اور شرف قبولیت بخشا۔اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے مزاج میں Rigidity نہیں ہے۔اس کی تائید آپ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اختلاف میری امت میں رحمت ہے۔اگر اختلاف اخلاص کی بنیاد پر ہو تو شریعت میں آسانی پیدا ہوتی ہے متبادل راہیں کھلتی ہیں۔اس میں لچک پیدا ہوتی ہے اور مختلف حالات میں اس کے نفاذ میں آسانی ہوتی ہے۔اسلام آفاقی دین ہے اور قیامت تک کے لئے ہے اس کے لئے لازم ہے کہ شریعت کی اس اسپرٹ کو باقی رکھا جائے اور جائز حدود میں طبائع کے اختلاف کو گوارا کیا جائے۔

(۵) اختلاف کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی فنی معاملہ میں پیدا ہوتا ہے مثلاً آپ ؐ کے زمانے میں لوگ کھجور میں پیوند لگایا کرتے تھے آپ نے اس سے منع فرمایا،لوگوں نے پیوند لگانا چھوڑ دیا نتیجتاً پھل کم آئے جب آپ ؐ سے اس کی شکایت کی گئی تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ امور دنیا ہے یعنی Technical Affair ہیں اور تم مجھ سے اس معاملے میں زیادہ جانتے ہو۔اسی طرح جنگ احد میں پڑاؤ ڈالنے کا معاملہ تھا آپ ؐ نے ایک جگہ پسند کی ایک صحابی جو فن حرب سے پوری طرح واقف تھے عرض کیا کیا یہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ایما پر آپ ؐ نے چُنی ہے،آپ ؐ نے فرمایا نہیں تو انہوں نے اس سے بہتر ایک دوسری جگہ نشاندہی کی اور آپ ؐ نے وہیں چل کر پڑاؤ ڈالا۔جنگ احد میں صحابہ کے درمیان اس امر پر اختلاف تھا کہ آیا قلع بند ہو کر لڑا جائے یا کھلے میدان میں داد شجاعت دی جائے۔اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ

آپؐ اللہ کے اذن سے زرہ پہن کر باہر نکلے جو اس بات کا اعلان تھا کہ دشمن سے میدان میں مقابلہ کیا جائے جنگ خندق کے موقع پر مشرک عرب قبائلوں نے اپنی ساری متحدہ طاقت جھونک دی تھی۔ اتنی بڑی قوت کا مقابلہ روایتی انداز سے مشکل تھا چنانچہ حضرت سلمان فارسی نے ایرانی طرز کی لڑائی کا مشورہ دیا اور خندق کھود کر اپنے دشمن کے بیچ رکاوٹ پیدا کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز میں ندرت تھی۔ چنانچہ آپؐ نے اس کو خوشی خوشی اختیار کرلیا۔ آپؐ کی اس حکمت عملی نے دشمن کو الٹے پاؤں لوٹنے پر مجبور کردیا۔ ان واقعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ Technology کے معاملہ میں آپؐ کا نقطۂ نظر کتنا وسیع تھا اور حسب ضرورت نہ صرف یہ کہ آپؐ نے اسے پسند کیا بلکہ اس کو قبول کیا اس سے فائدہ اٹھایا اور آپؐ کو اپنے جس مشورے میں خامی نظر آئی اس سے فوراً رجوع کیا۔ اس سے آپؐ کی Dynamism کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے اس طرز عمل کی تائید آپ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ حکمت مومن کی گمشدہ پونجی ہے اسے جہاں پاؤ اختیار کرلو۔

(۶) آپؐ کی نبوی زندگی میں دو واقعات ایسے ہوئے جس میں آپؐ کی حکمت عملی سے صحابہ کرام کو شدید اختلاف ہوا۔ ایک صلح حدیبیہ کے موقع پر اور دوسرے جنگ حنین میں غنائم کی تقسیم کے موقع پر۔ صلح حدیبیہ میں بظاہر آپؐ نے بہت دب کر صلح کی تھی حتیٰ کہ صلح نامہ سے اپنے نام کے ساتھ رسول اللہؐ کا لفظ بھی ہٹا دیا۔ مسلمانوں میں اس سے سخت بے چینی اور برہمی پھیلی حضرت عمرؓ تاب نہ لا سکے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں۔ کیا ہم مسلمان نہیں اور جب آپؐ نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگے پھر آپؐ ڈر کر اور دب کر ان ذلیل شرطوں پر کیوں صلح کر رہے ہیں۔ صرف حضرت ابوبکرؓ تھے جن پر اس واقعہ کا کوئی Reaction نہیں ہوا ورنہ ہر صحابی اپنی جگہ سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور ان کا ایمان متزلزل ہوگیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپؐ کے حکم کی لوگوں نے تعمیل نہیں کی۔ جب آپؐ نے کہا احرام کھول دو، سر منڈوالو اور قربانی کرو۔ تو فرط غم میں کسی نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اس وقت آپ کی اہلیہ نے مشورہ دیا کہ آپؐ اس کام میں پہل کریں لوگ آپؐ کی دیکھا دیکھی آپؐ کی اتباع کرینگے۔ آپؐ نے ایسا ہی کیا پھر بعد میں تمام لوگوں نے آپ کی

اتباع کی۔ راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی تو لوگوں کے دل کا غبار اُدھلا اور جب چند مہینوں میں صلح کی برکتیں نمایاں ہونے لگیں تو لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہو گیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی قیادت پر سخت وقت آتا ہے جبکہ اس کے نتیجہ فکر سے جماعت ہم آہنگ نہیں ہوتی اگر قیادت پر اعتبار نہ ہو یا متبعین میں صبر کا مادہ نہ ہو تو جماعت کے بکھر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسے تمام موقعوں پر جہاں ہوشمند قیادت کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے وہیں متبعین کو باوجود عدم اطمینان کے Wait and watch کی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ یہ تنظیمی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا اگر تمہارا امیر کسی بات کا حکم دے رہا ہو تو اس کی سنو اور مانو خواہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند ہو اِلاّ یہ کہ وہ تمہیں کسی معصیت کا حکم دے اس صورت میں نہ سننا ہے نہ ماننا۔

حنین کے معرکہ میں بہت سارا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا۔ آپؐ نے اس مال کا بڑا حصہ مکہ کے بعض سرداروں کو جو حال میں ایمان لائے تھے تالیف قلب کے لئے دے دیا یہ بات بعض انصاری نو جوانوں کو کھلی چنانچہ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اس کی شکایت کی کہ حضوؐر نے انصاف کے ساتھ مال تقسیم نہیں کیا۔ جب آپؐ کو یہ خبر ملی تو آپؐ کو بڑا دکھ ہوا اور کہا خدا موسیٰ پر رحم فرمائے ان کی قوم نے ان کو اس سے بھی زیادہ سخت اذیت دی تھی پھر ارشاد فرمایا اگر نبی نہیں انصاف کرے گا تو کون کرے گا؟ اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور انصار سے دریافت کیا گیا تم لوگوں نے ایسی باتیں کی ہیں؟ معلوم ہوا بعض نو جوانوں نے محض نادانی میں ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس موقع پر آپ نے دل چھو لینے والے انداز میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور سارا غبار آنکھوں کے راستے سے ڈھل کر نکل گیا۔ آپؐ نے اپنے احسانات کا تذکرہ کیا۔ ان کے احسانات کا اعتراف کیا اور پھر عرض کیا اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ تو اونٹ بکریاں لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اپنے نبی محمد ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر لوٹو۔ ان کلمات کو سن کر انصار کی چیخیں نکل گئیں اور وہ بے اختیار ہچکی مار کر رونے لگے اور اس طرح یہ فتنہ فرو ہو گیا۔

آپ کا ذاتی اسوہ

آخر میں ایک شہادت اور ایک اعلان نقل کر کے مضمون کو ختم کر دوں گا جس سے معلوم ہوگا کہ اختلاف اور نزاع تو دور کی بات ہے اس کے ہلکے سے ہلکے اور خفیف سے خفیف احساس کو بھی آپؐ نے اپنی زندگی میں ختم کر دیا اس طرح کہ آپؐ کی ذات سے اولاً تو کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی اور اگر کسی وقت پیدا بھی ہوگئی تو فوراً ختم ہوگئی۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسولؐ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے لئے کوئی انتقام نہیں لیا۔ جب رسول پاکؐ دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے آپؐ کے سر میں سخت درد تھا، بخار کی شدت سے بدن جل رہا تھا۔ اس شدید بیماری اور تکلیف میں آپؐ حضرت فضل بن عباس سے کہتے ہیں کہ فضل! مجھے مسجد لے چلو اور لوگوں سے کہو مسجد میں جمع ہو جائیں۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا:

''لوگو! میں تم سے بہت جلد رخصت ہونے والا ہوں۔ لوگو! جس کسی کی پیٹھ پر بھی میں نے کوڑا مارا ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے میری پیٹھ حاضر ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے دنیا ہی میں بدلہ لے لے، اگر میں نے کسی کو ناحق برا بھلا کہا ہو تو میں حاضر ہوں وہ بھی مجھ سے بدلہ لے اور جس شخص کا میرے ذمہ کوئی بھی مال ہو تو وہ مجھ سے وصول کر لے اور یہ خوف نہ کرے کہ میں بعد میں اس کی کسر نکالوں گا۔ یہ میری شان کے منافی ہے۔ تم میں سب سے زیادہ مجھے وہ آدمی پیارا ہے جو مجھ سے اپنا حق دنیا ہی میں وصول کر لے۔ یا پھر خوشی خوشی معاف کر دے تا کہ میں اپنے رب کے حضورؐ میں خوشی خوشی حاضر ہوں۔

لوگو! تم میں سے جس کسی نے بھی کسی کا حق دبا رکھا ہو وہ اس کا حق لوٹا دے اور دنیا کی رسوائی کا خیال نہ کرے ورنہ پھر آخرت کی رسوائی کے لئے تیار رہے۔ جہاں کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت ناک ہوگی۔

یہ ہے وہ رسول اللہؐ کا اختلافی اور نزاعی معاملہ میں اسوہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو اپنے نبیؐ کی سچی پیروی کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے گناہوں کو معاف فرماتے۔

صلی اللہ علیہ وسلم

حضورؐ بحیثیت مربی

لفظ مربی کا مفہوم

لفظ مربی، عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی مروج ہے۔

فیروز الغات کے مطابق اس کا مطلب پرورش کرنے والا، تربیت کرنے والا۔ سرپرست، پشت پناہ اور حامی ہے حضورؐ نے ایک بار اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے اور آپ کا ایک اہم مشن اچھے اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے۔ تعلیم وتزکیہ ہی مربی کا کام ہوتا ہے۔

چنانچہ حضورؐ کی ذات گرامی ہمارے لئے بہترین نمونہ عمل ہے۔ اور ہمیں براہ راست حضورؐ کی اطاعت و پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

کارنبوت کی تشریح

قرآن پاک نے کارنبوت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (الجمعه ۲)

یعنی وہ اللہ ہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہیں میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے۔ ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(۱) رسول کی بعثت اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ منصب نبوت انہیں اللہ نے عطا کی ہے اس لئے وہ مامور من جانب اللہ ہیں لہذا اس حیثیت کے اعتراف کے ساتھ ہی حضورؐ کی عظمت کا احساس انسان اور ایک مسلمان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ رسول ہونے کے باوجود وہ انسان ہیں اور انسانوں کی تعلیم اصلاح و تربیت کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ وہ امیوں کے اندر بھیجے گئے ہیں۔ عام اصطلاح میں امی اس کو کہتے ہیں جس کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی آبادی میں مبعوث ہوئے ہیں جو علم وشعور کے معاملے میں ناکندہ ہیں لفظ امی کا اطلاق ہر اس فرد اور گروہ پر ہوسکتا ہے جو حقیقت واقعہ کا علم نہ رکھتا ہو اور جس کو ھدایت ورہنمائی کی ضرورت ہو۔ اس اعتبار سے اس اصطلاح کا اطلاق ہندوستانی ماحول ومعاشرے پر ہوسکتا ہے کیونکہ اسلام کے بارے میں ان کا علم نہ کے برابر ہے۔

(۴) رسول کا پہلا کام یتلو علیھم آیتہ ہے۔ یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کی تلاوت کرنا۔ تاکہ لوگوں کو صاف اور سیدھی زبان میں یہ معلوم ہوجائے کہ ان کا رب کون ہے۔ اس نے اس دنیا میں ان کو کس لئے بھیجا اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے۔ بغیر تلاوت آیات ان باتوں کا علم نہیں ہوسکتا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ عرب جن کی زبان عربی تھی باوجود امی ہونے کے وہ محض تلاوت آیات سے سمجھ جاتے تھے کہ ان کا رب ان سے کیا کہہ رہا ہے اور جہاں انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا یا وہ غلط سمجھتے تھے تو حضورؐ سے پوچھتے تھے اور آپؐ اس کی وضاحت فرمادیتے تھے۔ آج کے دور میں تلاوت آیات ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت پڑھنے کے بعد اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کردیں اور جہاں بات سمجھ میں نہ آئے کسی مستند تفسیر کے حوالے سے اس کو واضح کردیں تاکہ عام لوگوں تک قرآنی تعلیمات پہنچ جائیں۔

(۵) رسول کا دوسرا کام یزکیھم ہے۔ یعنی تزکیہ کرنا۔ تزکیہ کا اردو میں مفہوم عام طور پر پاک کرنا، صاف کرنا ہے اسی سے تزکیہ نفس کا لفظ نکلا ہے جس کا مفہوم نفس کو پاک کرنا ہے۔ لیکن قرآنی اصطلاح میں تزکیہ کا مفہوم انسان میں منفی چیزوں کی جگہ اس کی مثبت صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ جیسے سونے کے میل کچیل کو آگ میں ڈال کر اس کو دور کیا جاتا ہے اور پھر اس کو صاف ستھرا کر کے جگمگایا جاتا ہے اس کو ہی تزکیہ کہتے ہیں۔ تزکیہ انسان کی خوابیدہ اور پوشیدہ صلاحیتوں اور خوبیوں کو ابھارنے کا نام ہے۔ اس کو ایک مثبت اور تعمیری جہت فراہم کرنا ہے۔ لہذا تزکیہ بقول مولانا مودودی'' زندگی سنوارنے میں خیالات

،اخلاق ،عادات ، معاشرت ،تمدن ،سیاست ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔'' تزکیہ کا تعلق مقصد زندگی سے بہت گہرا ہے۔ جب آدمی کسی مقصد سے وابستہ ہوتا ہے تو اس کے مطابق خود کو تیار کرتا ہے ۔چنانچہ اپنی زندگی ،قوت وصلاحیت ،اخلاق ومزاج اوردیگر تمام چیزوں کوایک جہت دیتا ہے۔یہی جہت تزکیہ ہے۔

(۶) رسول کا تیسرا کام یعلمہم الکتب والحکمہ ہے۔یعنی کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا ہے ۔اوپر آپ نے دیکھا پہلا کام تو تلاوت آیات ہے جو عمومی ہے۔سب کے لئے ہے۔لیکن تلاوت آیات محض بنیادی باتوں کا اعلان واظہار ہے اصل چیز جواس دین ودعوت کو مان لیں ان کو کتاب کی تعلیم دینا ہے ۔اللہ نے قرآن کو العلم قرار دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ قرآن اصل علم ہے اور مبنی علم ہے کیونکہ یہ جس ذریعہ سے آیا ہے وہ اللہ کی ذات ہے جو علم کا اول وآخر ہے ۔ جب تک اس کی اچھی اور پوری سمجھ نہیں ہوگی اسلامی مزاج ، ماحول اور معاشرے کی تعمیر نہیں ہوسکتی ہے ۔لہذا یہ اہتمام قرآن اور قرآنی علم سے لوگوں کو واقف کرانا اس کے رموز واشارات کی سمجھ پیدا کرنا رسول کا بنیادی کام ہے۔

(۷) علم سے ہی حکمت کے دروازے کھلتے ہیں عام طور پر علم وحکمت ایک ساتھ بولے بھی جاتے ہیں اور قرآن نے علم وحکمت کو ایک ساتھ استعمال بھی کیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں حضورؐ کا جومشن اور مقصد سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو ہر طرح کی بہترین صفات وخصوصیات سے مرصع ہو اور علم وحکمت سے آراستہ ہوکر ایک باشعور، پاکیزہ، مقصدی ،تعمیری ،فلاحی زندگی کا داعی اور ان افکار وکردار پر عامل گروہ ہوتا کہ وہ خیرامت کے منصبی ذمہ داریاں کما حقہ ادا کرسکے۔

ہم سب اس دین کے داعی ایک بامقصد گروہ ہیں ۔ یہ آیات حضورؐ کے مشن وکردار کی بہترین ترجمان ہیں ۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ،قرآن پاک سیرت کی پہلی کتاب ہے ۔اس بات کی تائید حضرت عائشہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ جب کچھ لوگوں نے ان سے حضورؐ کے معمولات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ۔حضورؐ کا سیرت و

کردار وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔لہذا قرآن وسیرت دونوں کی روشنی میں اپنا سفر طے کرنا ہے۔

سیرت پاک پر اعلیٰ علمی کام کی ضرورت

ان اصولی باتوں کے بعد ایک بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضورؐ کی سیرت پر دنیا بھر میں مختلف زبانوں اور مقامات پر ہزاروں کتابیں اور لاکھوں مقالے لکھے گئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہماری مسجدوں، دینی مجلسوں اور دیگر جگہوں پر روزانہ لاکھوں تقاریر ہوتی ہیں مگر مجھے کہنے دیجئے کہ حضورؐ کی سیرت وشخصیت پر اعلیٰ معیاری اور علمی کام بہت کم ہوئے ہیں۔حضورؐ کی ذات گرامی علم وحکمت کا سمندر ہے جہاں سے لوگوں نے ابھی چند ڈول پانی بھی نہیں نکالا ہے پورا کا پورا سمندر تحقیق اور مطالعہ کے لئے دعوت عزم دے رہا ہے۔لہذا جو لوگ اسلامی علوم سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو گہرائی سے حضورؐ کی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس میں علم وحکمت کی جو موتی پوشیدہ ہیں ان سے عام لوگوں کو بہرہ ور کرنا چاہیئے۔حضورؐ تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور رہتی دنیا تک کے لئے نبی ہیں تو آپ کی سیرت وشخصیت ایک دائمی رہنما کی ہے۔لہذا دنیا بھر میں جو حالات ومسائل پیش آئیں گے آپ کی ذات اس میں ہماری رہنمائی کرے گی لہذا یہ علم وتحقیق کا کبھی نہ ختم ہونے والا دفتر ہے جو تمام طرح کے علم ودانش کے ماہرین کو دعوت اصلاح وتحقیق دے رہا ہے۔

قائدین اور متبعین کا رشتہ اور حضور کے ابتدائی ساتھی

اگر آپ دنیا بھر کی تحریکات وانقلابات کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو ایک بات اچھی طرح معلوم ہو جائے گی کہ جب کوئی تحریک برپا ہوتی ہے تو ابتداء اس کو چند لوگوں کے علاوہ بہت کمزور ساتھی ملتے ہیں جیسے جیسے تحریک آگے بڑھتی ہے باصلاحیت اور بااثر لوگ آکر ملتے جاتے ہیں۔ تحریکوں کی اصل پونجی ان کے قائد کی شخصیت اس کا اپنے مقصد سے اٹوٹ لگاؤ اور مخلص ساتھیوں کی جانثاری ہوتی ہے اور اپنے ان ٹوٹے پھوٹے انسانی وسائل کی بہتر رہنمائی اور اس کا استعمال ہوتا ہے۔

ہرانسان میں کچھ نہ کچھ خوبی اور صلاحیت ہوتی ہے۔ایک مقصد سے تعلق ایک معمولی آدمی کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔دراصل ایک شخص کی خوبیوں کی پہچان کر اس کو آگے بڑھانے سے معجزاتی نتیجے سامنے آتے ہیں۔

آپ نے اگر سیرت رسولؐ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مکہ میں حضورؐ کے ساتھ جڑنے والوں میں چند نوجوان تھے۔چند غلام تھے۔چند عورتیں تھیں اور چند باہر سے آئے ہوئے لوگ تھے جو اپنے سماج میں کوئی مقام اور حیثیت نہیں رکھتے تھے۔سماج کے سردار اور کھاتے پیتے لوگوں نے اس دعوت کی مخالفت کی اور اس کو نیچا دکھانے اور ختم کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔حضورؐ کے کمزور ساتھیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دئے۔مگر وہ ان کے ایمانی جذبہ کو دبانے اور مٹانے میں ناکام رہے۔یہی کمزور لوگ جو بظاہر بے بضاعت اور بے وزن مگر ایمان میں فولاد جیسی مضبوطی رکھتے تھے وہی اس دین کا ابتدائی سرمایہ تھے۔حضورؐ کی صحبت و تربیت نے ان کمزور اور بے سہارا لوگوں کو اتنا حوصلہ منداور طاقتور بنا دیا تھا کہ وقت کے جابروں کا کوئی ظلم ان کو مقام عزیمت سے نہیں ہٹا سکا۔آپ اگر قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ نفاق کا معاملہ مدینہ آنے کے بعد سامنے آیا۔مکہ میں کوئی منافق نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے اور جنہوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا ان کی بعض فاش غلطیوں پر بھی ان کو منافق نہیں کہا گیا۔جنگ احد کے زمانے میں ایک بدری صحابی نے جن کے بال بچے مکے میں پھنسے ہوئے تھے حضورؐ کی جنگی تیاریوں کا راز مکہ والے کو اس امید پر بتانا چاہا تا کہ وہ اپنے بال بچوں کو وہاں سے نکال لے آئیں۔اس بات کا پتہ حضورؐ کو چل گیا اور وہ جانکاری ہاتھ آ گئی۔یہ ایسا جرم تھا جس پر ان کی گردن ماری جا سکتی تھی۔اس سے بڑی غداری اور نفاق کیا ہو سکتا تھا مگر چونکہ یہ ایک صحابی تھے بدری تھے اس لئے حضورؐ نے ان کے اخلاص پر شک نہیں کیا اور ان کی اس کمزوری کو ایک بشری کمزوری مانتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔اس واقعہ سے ہمیں ایک بڑا سبق ملتا ہے۔کوئی بھی انسان خواہ کتنا بڑا ہو اور کسی طرح کے نظام تربیت میں ہو بشری کمزوری سے پاک نہیں ہوتا۔لہذا اگر اس کی کسی بشری کمزوری کا پتہ چل جائے تو اس کے تمام سابقہ کارناموں اور خدمات پر پانی پھیر کر اس کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنا اور اس کی صفائی اور وضاحت کے باوجود اس کی کردار کشی کرنا مناسب

نہیں ہے۔اس سے دل ٹوٹتے ہیں اور تحریک اور مقصد کو دھکا لگتا ہے۔قیادت کو چوکنا اور بیدار ضرور رہنا چاہئیے اپنے افراد اور احباب پر نظر بھی رکھنی چاہئے۔اس کی غلطیوں اور خامیوں کی بروقت نوٹس لینا چاہئیے لیکن جب اللہ نے توبہ اور انابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے تو آپ کو بھی اس دروازہ کو کھلا رکھنا چاہئیے اور اپنے ساتھیوں میں اعتماد کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن جتن کرنا چاہئے۔

مدینہ میں منافقین کی بڑی جماعت کھڑی ہوگئی تھی جو اندر اندر پوری تحریک کو تار پیڈو کرنے میں لگی ہوئی تھی حضوؐر کو مختلف احباب کے ذریعہ اور خود وحی الٰہی کے ذریعہ ان کی فتنہ پردازیوں اور سازشوں کی جانکاری دی جارہی تھی ،حضوؐر پوری طرح چوکنا اور بیدار تھے اور ان عناصر پر پوری نظر رکھتے تھے آپ کو ایک ایک منافق کا نام اور اس کی چال کا علم تھا مگر آپ نے کبھی برسرعام یہ نہیں بتایا کہ کون منافق ہے اور اس کی کیا چال ہے۔کچھ لوگ بالکل رنگے ہاتھوں پکڑے گئے مگر حضوؐر نے کبھی ان سے سرزنش نہیں کی اور کبھی اس راز کو کسی اور پر افشاں نہیں کیا۔صرف اس لئے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بے اعتمادی اور عناد کی کیفیت پیدا نہ ہو۔اس حکمت عملی نے بہت سے لوگوں کو سدھرنے کا موقع دیا اور وہ اخلاص کے ساتھ دین میں واپس آگئے۔اپنے ساتھیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم رکھنا تحریک کی کامیابی کی لازمی شرط ہے۔

جیسا میں نے پہلے عرض کیا کہ جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو ابتداء بہت تھوڑے سے لوگ اس کے ساتھ جڑتے ہیں اور ان میں زیادہ تر لوگ سماج کے کم تر طبقات سے اور کم علم وصلاحیت کے لوگ ہوتے ہیں۔لیکن ان میں بڑی خوبیاں ہوتی ہیں۔پہلی حق کو پہچاننے اور قبول کرنے کی صلاحیت، دوسرے اخلاص و جانثاری اور تیسری اطاعت امر۔ان تین خوبیوں کی وجہ سے یہ گروہ اپنی اندرونی کمزوریوں پر بھی قابو پاتا ہے۔اور دن بدن اس کے عمل و کردار اور اخلاق واعمال مثالی بنتے چلے جاتے ہیں۔جانثاری اور اطاعت امر ان کو سیسہ پلائی دیوار بنادیتی ہے جو نہ صرف ان کی تربیت نفس میں مددگار ہوتی ہے بلکہ جو کام بھی ان کو دیا جاتا ہے اس کو پوری تندہی اور اخلاص کے ساتھ اس طرح انجام دیتے ہیں کہ اس میں احسان کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔تحریک وقت ضرورت اور حالت کے لحاظ سے اپنے افراد کو مختلف کام سونپتی ہے اور وہ اخلاص نیت اور جذبہ

احسان سے لبریز ہوکر امیر کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں اور ایک معجزہ نما کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ لوگ عالم، امام، فقیہ، فلسفی، مفتی، حکیم و دانش ور نہیں ہوتے اس کے باوجود چیزوں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور صحیح فیصلہ کر کے صحیح قدم اٹھاتے ہیں اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ بقول شخصے اگر عزم سفر ہوتو راستہ خود رہنمائی کرتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور کیسے جانا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے کہ جب لوگ اللہ کے راستے میں جد وجہد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ضرور بالضرور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضورؐ کا مشن صرف تلاوت آیات نہیں ہے بلکہ تزکیہ نفس اور علم کتاب اور حکمت کی تعلیم ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب حضورؐ جیسا معلم اور مربی انہیں میسر ہے تو ان کو کسی اور سے رہنمائی اور ھدایت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ حضورؐ کے فیضان نظر اور تعلیم و تربیت نے ان کو ہر میدان میں وقت کا امام بنادیا اور وہ لوگ جن کو تاریخ نے بدو، اجڈ اوران پڑھ کہا۔ جہاں تہذیب و تمدن کی کوئی روشنی نہیں پہنچی تھی اور انسانی تاریخ کے لمبے دور میں کبھی کسی نے ان کی جانب جھانکنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس کے بارے میں مشہور انگریز مصنف کارلائل نے The world most unoticed کہا، حضورؐ کی آمد و تربیت کے بعد ایسے ہوئے کہ ایک نئی تاریخ، ایک نئی تہذیب ایک نیا تمدن، ایک نئی قوم، ایک نئی سلطنت، برپا کردی جو تاریخ میں امٹ اور لازوال ہے اور دنیا کی کوئی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ آج کی تاریخ میں وہ کارلائل کے لفظوں میں Most noticed ہوگئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک اپنے مردان کار خود تراش لیتی ہے۔ وہ کسی شخص کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہاں یہ ضرور ہے کہ تحریک کا قائد اپنے ساتھیوں سے گہرا لگاؤ رکھتا ہو اوران کی خوبیوں اور خامیوں کو جانتا ہو نیز اسے یہ بھی معلوم ہو کہ کون کس صلاحیت کا حامل ہے اور کس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ تحریکات کی سب سے بڑی پونجی اخلاص اور اطاعت ہے۔ اپنے ساتھیوں پر اعتماد، ساتھیوں کا اپنے قائد سے محبت، اس کی عزت اور اس کے لئیے جانثاری کا جذبہ۔ اگر یہ چیزیں ہوں تو بڑی سے بڑی روکاوٹ دور کی جاسکتی ہے اور بڑی سے بڑی آزمائش کا صبر وعزیمت سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کسی وجہ سے قائد کی شخصیت پر اعتماد نہ ہو۔ اس سے ہمدردی اور محبت نہ ہوتو باصلاحیت افراد کی ایک بڑی فوج بھی کسی معرکہ کو سر کرنے میں ناکام ہوجائے گی۔ لہذا صرف مامورین کا ہی نہیں قائدین

کوبھی اور قائدین کا بھی ہر آن محاسبہ ہونا چاہیئے اور ہم جتنی سختی سے مامورین کا محاسبہ کرتے ہیں اس سے زیادہ سختی سے قائدین کا محاسبہ ہونا چاہیئے ہر دوصورت میں اخلاص اور اصلاح کا جذبہ گامزن ہونا ضروری ہے ورنہ پھر یہ کردارکشی ہوجائے گی جو تحریک کو نقصان پہنچانے والی ہوگی۔

قائدین کو اپنے مامورین کے لئے ہمیشہ نرمی اور مرحمت کا جذبہ رکھنا چاہیئے ورنہ جو لوگ آپ کے اردگرد جمع ہوتے ہیں وہ بکھر جائیں گے۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا ،کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

حضوؐر کی سیرت کے مطالعہ سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں سے بے حد پیار کرتے تھے یہ آپؐ کی محبت کا تقاضہ ہی تھا کہ آپؐ کے ساتھی آپ سے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے اور آپؐ کے ایک ایک اشارے پر اپنی جان اپنا مال اور اپنی عزیز ترین چیز بھی خوشی خوشی قربان کر دیتے تھے یہ کبھی یک طرفہ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ آپؐ نے متعدد صحابیوں کی زبان سے سنا ہوگا کہ انہوں نے کہا حضوؐر سب سے زیادہ ان سے پیار کرتے ہیں۔ یہ احساس کہ حضوؐر ہم کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں ان کے اندر جذبہ جاں سپری پیدا کرتا تھا جو اخلاص کا مغز ہے۔

خود قرآن نے حضوؐر کے خلق عظیم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ نرم خو واقع ہوئے ہیں ورنہ جو لوگ آپ کے اردگرد جمع ہیں وہ بد دل ہوکر آپ سے الگ ہوجاتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نرم خوئی ایک ایسا نبوی اخلاق ہے جو ہر قائد میں ہونا چاہیئے نہیں تو جو لوگ آپ کے ساتھ آئے ہیں ایک وقت کے بعد بد دل ہوکر آپ سے دور ہوجائیں گے اور تحریک طاقطور بننے کے بجائے کمزور ہوجائے گی۔

موجودہ قیادت کی حیثیت

ہمیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم میں جو امیر اور قائد بنائے گئے ہیں۔ وہ حاکم وقت نہیں ہیں ان کی حیثیت امیر مملکت ، عامل، سول ایڈمنسٹرز پولس کپتان یا عدالتوں کے جج کی نہیں ہے جن کو بزور قوت اپنی بات منوانے کا قانونی اختیار ہوتا ہے۔ نہ ماننے کی صورت میں اسے

سزا دی جاسکتی ہے۔

ہمارے یہاں امارت وقیادت ایک نظم کا نام ہے جو تحریک کے مقصد کو پوار کرنے کے لئے برپا کی گئی ہے۔ یہاں ایمان، اخلاق اور اخلاص سے قوت نافذہ پیدا ہوتی ہے۔ ہم روگردانی کی صورت میں کسی کو سزا نہیں دے سکتے۔ الا یہ کہ ہم اس شخص کو تحریک سے باہر کر دیں۔ کبھی کبھی تحریک کو اخراج کی ناخوشگوار عمل سے گذرنا پڑتا ہے تاہم یہ کوئی اہم استثنائی صورتحال ہوگی اس کو اصول عام نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ لہذا امیر و مامور دونوں کو اپنی حیثیت کا ادراک ہونا چاہئے۔ ہم جو کام کر رہے ہیں وہ خدا واسطے کر رہے ہیں۔ اس کی رضا اور خوشنودی کے لئے کر رہے ہیں خدا کے یہاں وہی اعمال مقبول ہیں جو اخلاص نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ اس ایمان اور اس کے تحت برپا نظم کا تقاضہ ہے کہ جس کسی کو امیر بنایا گیا ہے معروف میں اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی مدد کی جائے نیز اس کو صحیح مشورہ دیا جائے اور مل جل کر اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جس کو آپ نے اپنا مقصد زندگی بنایا ہے۔

اگر اس طرح نظم کا احترام کرتے ہوئے اور مامورین سے محبت و خیر سگالی کا رشتہ قائم کرتے ہوئے کام کیا جائے تو طبائع کے اختلاف کے باوجود ایک مضبوط گروہ تیار کیا جاسکتا ہے جو اپنے جہد و عمل اور قربانی و اطاعت سے ایک نئی دنیا تعمیر کرسکتا ہے۔

حضوؐر نے اپنے صحابہ کی جس طرح تربیت کی اور صحابہ کے ساتھ جس فراخ دلی، نرمی اور حسن اخلاق کا معاملہ کیا وہ تاریخ وسیرت کی کتابوں میں درج ہے اور وہی ہمارے لئے بہترین اسوہ ہے جس کی روشنی میں ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار کی تشکیل نو کرسکتے ہیں۔

قائد کون ہوتا ہے۔ جو ہر چیز میں اور لوگوں سے آگے ہو۔ جس کی طرف لوگ رجوع کریں متاثر ہوں Inspired ہوں۔ قائد کو اپنے ساتھیوں کے سامنے ایک کھلی کتاب ہونا چاہئے اس کی خلوت وجلوت نمایاں اور عیاں ہو۔ لوگ جتنا جتنا قائد کے بارے میں جانیں گے ان سے اس کی محبت اور تعلق اتنی ہی بڑھے گی۔ آپ نے پڑھا ہوگا جنگ خندق کے موقع پر جب حضوؐر اور صحابہ مدینے کی حفاظت کے لئے خندق کھود رہے تھے اس وقت آپ کے ساتھی بھوک سے بے حال اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کر رہے تھے۔ ایک صحابی نے بھوک کا ذکر کرتے ہوئے حضوؐر کو اپنا پیٹ

کھول کر دکھایا جس پر ایک پتھر بندھا تھا۔ حضوؐر نے ان کو اپنا پیٹ کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر صحابی کے آنکھ میں آنسو آ گئے اور ان کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا قائدان سے دو قدم آگے ہے۔ پھر سارا بھوک پیاس بھول کر وہ پورے جوش کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے اور یہ نعرہ بلند کرتے جاتے تھے کہ لاعیش الاعیش الآخرۃ۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے شرف کے معیار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہاں شرف کی بنیاد حسب ونسب، دولت واقتدار اور علم اور رنگ نہیں ہے بلکہ اللہ کا تقویٰ ہے جو تقویٰ میں جتنا بڑا ہے خدا کے نزدیک وہ اتنا ہی عزت دار ہے۔ تاہم اسلام انسان کی حیثیت عرفی کا احترام کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف کسی کو اپنے خاندان، دولت۔ وجاہت اور دیگر خوبیوں پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے اور کسی دوسرے کو اس اعتبار سے حقیر نہیں سمجھنا چاہئے وہیں کسی اور کا بھی اس کی خاندانی اور سماجی حیثیت کو نظر انداز کر کے معاملہ کیا جائے تو پھر لوگ آپؐ کے قریب نہیں آئیں گے اور قریب آ کر دور ہو جائیں گے۔ اس لئے ان کی حیثیت عرفی کا اعتراف اور احترام ضروری ہے۔ مثلاً کوئی کسی برادری اور قوم کا بڑا آدمی ہے تو اس کے مرتبے کے مطابق اس سے پیش آنا چاہئے۔ یہ عام انسانی اخلاق ہے۔ چنانچہ حضوؐر نے فرمایا لوگوں سے ان کے مرتبے کے مطابق پیش آؤ۔ اور آپؐ خود اس کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ کے اس کریمانہ اخلاق کو دیکھ کر بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ہر سماج میں اچھے لوگ ہوتے ہیں جو علم وذہانت اور دیگر خوبیوں میں ممتاز ہوتے ہیں۔ اسلام جس کے اندر جو خوبی ہے اس کا اعتراف کرتا ہے، اس کو قائم رکھتا ہے۔ اس کو بڑھانے کا اہتمام کرتا ہے۔ خود حضوؐر کا ارشاد ہے جو لوگ زمانے جاہلیت میں اچھے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر ہیں۔ اس طرح لوگوں کی اچھائی کا اعتراف کر کے ان کی خوبیوں کو پہچان کر اگر ان کو ذمہ داریاں دی جائینگی تو اس سے تحریک کو تقویت ملے گی اور تحریک آگے بڑھے گی۔

حضور کی مردم شناسی

حضوؐر کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ میں مردم شناسی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی اور آپؐ لوگوں کی صلاحیتوں اور خوبیوں کو جان کر ان کو ذمہ داریاں سپرد کرتے تھے اور آپ نے دیکھا کہ جن

کو جو ذمہ داری دی گئی معلوم ہوا کہ وہ اسی کام کے لئے بنے تھے اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام کر دکھایا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کچھ ایسے بھی صحابی تھے جن کو آپؐ نے کوئی ذمہ داری قبول کرنے سے منع کیا۔ جیسے حضرت ابوذر غفاری سے آپؐ نے کہا اے ابوذر! میں تمہیں کمزور پاتا ہوں، میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، تم دو لوگوں پر بھی ذمہ دار نہ ہونا اور نہ مال یتیم کا ولی بننا۔

حضور کی تربیت کا انداز

حضورؐ نے صحابہ کرام کی جس طرح تربیت کی ہے، اگر آپ اس کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں جادوئی اثر رکھتی ہیں اور تعمیر سیرت میں مددگار ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی کے اچھے کارنامے پر ہمت افزائی کے کلمات کہنا، اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنا اس سے نہ صرف قائد سے اس کا لگاؤ پیدا ہوتا ہے اعتماد اور محبت کی فضا بنتی ہے بلکہ اس کے ساتھیوں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس سے احترام و محبت میں اضافہ ہوتا ہے جیسے حضرت معاذ کو حرام و حلال کا اچھا علم تھا۔ حضرت علی کو وراثت کی اچھی معلومات تھی۔ حضرت ابوعبیدہ میں امانت داری بدرجہ اتم تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس علم فقہ اور تفسیر کے ماہر تھے حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت اچھے قاری کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضورؐ کے اعتراف و تعریف نے ان کے اعتبار کو بلند کر دیا جس نے انہیں اس میدان میں اور کمالات حاصل کرنے کی توفیق دی۔

اسی طرح اپنے ساتھیوں کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں کا اعتراف، ان کے خدمات کو سراہنا اور ان کے حق میں سامنے اور غائبانہ دعائے خیر کرنا ان کی ہمت افزائی کرنا یہ سب ان کے تربیت اور کردار سازی میں میل کا پتھر ثابت ہوتے ہیں۔ اور حضورؐ کی سیرت میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

حضورؐ کی سیرت میں ہمیں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر بے اختیار آپؐ پر ڈھیروں درود بھیجنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک نوجوان آپؐ کے پاس آتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ تمام تر کبیرہ گناہوں میں ملوث ہے اور وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تاہم وہ اسلام لانا چاہتا ہے آپ نے کہا

تم ایک چیز چھوڑ دو باقی سب چیزیں چھوٹ جائیں گی ۔اس نے کہا ہاں ایک چیز چھوڑ سکتا ہوں آپ نے فرمایا جھوٹ بولنا چھوڑ دو اس نے حامی بھرلی۔اس خرابی کے دور ہوتے ہی ساری خرابیاں بتدریج دور ہوگئیں۔

ایک دوسرا نوجوان آتا ہے وہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے ساتھ ہی تمام تر کبیرہ گناہوں کی اجازت بھی چاہتا ہے۔یہاں تک اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نمازیں نہیں پڑھے گا۔آپؐ نے دیگر تمام باتوں پر سکوت اختیار کیا اور یہ کہا کہ جس میں نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں۔نماز قائم کرو ساری برائیاں خود بخود اس کی برکت سے دور ہو جائیں گی۔

ایک اور نوجوان آپؐ کے پاس آتا ہے اور اس نے آپ سے زنا کی اجازت مانگی۔صحابہ اس وقت موجود تھے۔وہ سب بہت برہم ہوئے۔مگر حضورؐ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور سوال کیا کیا تم اپنی ماں کے لئے اس بدکاری کو پسند کروگے۔اس نے کہا نہیں۔پھر آپؐ نے بیٹی، پھوپھی، خالہ کے سلسلے میں دریافت کیا کہ تم اس کو پسند کروگے۔اس نے کہا نہیں۔اللہ کے رسول میری جان آپ پر فدا ہو جائے آپ نے فرمایا دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹی، پھوپھی اور خالہ کے حق میں بدکاری پسند نہیں کریں گے۔پھر آپ نے اپنے دست مبارک کو اس کے دل پر رکھ کر اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ اس کی مغفرت فرما، اس کے دل کی دنیا کو بدل دے اور اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما۔پھر وہ نوجوان اس بدکاری کے خیال سے باز آ گیا۔اس طرح آپؐ نے اس کو رشتوں کے تقدس اور احترام کی تعلیم دی۔

ایک بار ایک بدو مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔لوگوں نے اسے روکنا چاہا۔آپؐ نے منع فرمایا۔جب وہ اپنی حاجت سے فارغ ہوا تو آپ نے فرمایا یہ پیشاب کرنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ نماز، تلاوت اور ذکر کرنے کی جگہ ہے۔یہ اللہ کا گھر ہے۔اس کی سمجھ میں بات آ گئی اور اس نے توبہ کیا۔پھر آپ نے پانی منگوا کر اس نجاست کو دھوڈالا۔

آپ خواتین سے گفتگو کر رہے تھے کہ کسی کا ریاح خارج ہوا۔خواتین شرم سے پانی پانی ہونے لگیں لیکن آپ نے ایسا انداز اختیار کیا گویا آپ نے نہ کچھ سنا اور نہ کچھ محسوس کیا تاکہ ان کو خفت نہیں ہو حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو وضو وطہارت سے لے کر وہ تمام چھوٹے بڑے معاملات

کی تعلیم وتربیت دی جوانفرادی اوراجتماعی زندگی کے لئے ضروری تھے۔اس لئے آپ کودنیا کی کوئی چیزنہیں ملے گی جس میں حضورؐ کی ھدایت، اسوہ اورتعلیم موجودنہ ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین مکمل ہےاورہمیں اس معاملے میں کسی اور کی رہنمائی اور ھدایت کی ضرورت نہیں ہے۔غیرانبیا تو دورخودانبیا سابقہ کی طرف بھی رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ خودحضورؐ کی حدیث ہے آج عیسٰی اورموسیٰ بھی ہوتے وہ بھی آپؐ ہی کی پیروی کرتے۔اس لئے زندگی کے ہرمعاملہ میں اور ہرمسئلہ میں حضورؐ کا اسوہ ہی ہمارے لئےنمونہ ہےاورمعیارخیراورمعیارحق ہےاگرہم سچے دل سے اور خلوص نیت کے ساتھ آپ کی پیروی اختیار کریں گےتو ہماری ذاتی اصلاح بھی ہوگی اورہماری اجتماعیت مضبوط اورکامیاب ہوگی۔

ہمیں حضورؐ کے اسوہ پرعمل کرتے ہوئے تواضع اورانکساری ،عفودرگزر، بردباری، زہد واستغنا اور دوسروں کی عزت نفس کا لحاظ رکھنا چاہئے، حضورؐ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ میں چاہتاہوں کہ میں صبح سےشام اس طرح کروں کہ کسی کے لئے میرے دل میں کوئی کدوورت نہ رہے۔لہذاتم اپنے ساتھیوں کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ بتاؤ جس سے میری رائے خراب ہوجائے۔ایک دوسری حدیث میں آپ نےفرمایامیرےنزدیک تم میں سب سے ناپسندیدہ وہ لوگ ہیں جوچغلی کھاتے ہیں۔دوسروں میں نفرت کا بیج بوتے ہیں اورشریفوں میں عیب ڈھونڈتے ہیں۔

یہی وہ طریقہ تھا جس سے حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کی تربیت کی جس کی وجہ سے ہرصحابی آسمان ہدایت پرجگمگاتے ستارے کی مانند نظر آتے ہیں۔اس سے آپ کوحضورؐ کی مربیانہ حیثیت کااندازہ ہوگیا ہوگا۔ہم سب جواس عہد میں اس تحریک کوبرپاکرنے اٹھے ہیں۔ہمارے لئے حضورؐ کا اسوہ ہی ذریعہ ھدایت اورذریعہ نجات ہے۔اس پرہم جتنی سختی اوردلجمعی سے قائم رہیں گےاپنی بھی اصلاح اچھی طرح کرسکتے ہیں اوراپنے ساتھیوں کی اصلاح بھی کرسکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے دل میں اپنے مقصد سے سچی محبت ہوہم اپنی ذاتی انا کی قربانی دینے کوتیارہوں اورایک دوسرے کیساتھ خیرسگالی کے علاوہ نرمی،محبت اورعفوودرگذرکا معاملہ کرنے کوتیارہوں۔اللہ ہمیں اورآپ کواپنے نبی کی سچی پیروی کی توفیق دے۔(آمین)

باب سوم

سانحہ کربلا: ایک مطالعہ

سانحہ کربلا: تاریخ کا سب سے منفرد اندوھناک باب

سانحہ کربلا تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام کا ایک ایسا المناک اور اندوہناک باب ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ دنیا میں قتل و غارتگری نہیں ہوئی ہے یا معصوموں کا خون نہیں بہا ہے بلکہ ظلم و شقاوت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ قتل و خون کی جو روایت آدم کے ایک بیٹے قابیل نے شروع کی تھی وہ آج تک قائم ہے۔ باپ نے بیٹے کو قتل کیا ہے، بیٹے نے باپ کا گلا گھونٹا ہے۔ ماں نے بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے تو بیویوں نے شوہروں کو زہر بھی دیا ہے۔ انبیاء کو ان کی قوم نے ناحق قتل کیا ہے تو معصوموں کو سرِ دار کھینچا گیا ہے۔ حضرت عثمان کو ان کے گھر والوں کے سامنے عین اس وقت جب وہ تلاوت قرآن پاک میں مشغول تھے شر پسندوں نے ظلماً قتل کر دیا۔ حضرت علیؓ کو صبح کی نماز میں جاتے ہوئے ایک خارجی ابن ملجم نے شہید کر دیا۔ حضرت عمرؓ پر جان لیوا قاتلانہ حملہ ہوا جس کے زخموں کی تاب نہ لا کر وہ شہید ہو گئے۔ حضرت عیسیٰؑ جو قوم بنی اسرائیل کی ہدایت پر معمور کئے گئے تھے۔ جن کا یہ قول آج بھی بائبل میں موجود ہے کہ انہیں بنی اسرائل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے اور جو یہ کہتے ہوئے قتل کئے گئے ہیں کہ ''غیر اسرائیلیوں کو دین کی دعوت دینا اپنے بچوں کی روٹی کتوں کے حوالے کر دینا ہے'' ان کو ان کی قوم کے لوگوں نے نبی نہیں مانا، ان کی پاک باز اور عفت مآب ماں پر الزام لگایا اور اس کی سرکار عالیہ نے ایک خوشی کے دن ایک ڈاکو کو تو معاف کر دیا اور اس کے عوض حضرت عیسیٰؑ کو یہودی اور عیسائی روائت کے بموجب سارے جسم میں کیلیں ٹھونک کر صلیب پر لٹکا دیا۔ لیکن یہ سارے واقعات اس ظلم و شقاوت کی کوئی نظیر نہیں بن سکتے جو حسینؓ اور ان کے خاندان والوں کے

ساتھ میدان کربلا میں پیش آیا۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو قتل کرنے والے شر پسند خارجی اور باغی تھے حضرت عیسیٰؑ کو سولی دینے والے لوگ ان کے ہم قوم تو تھے لیکن ان پر ایمان نہیں لائے تھے لیکن محمد رسول اللہؐ کے نواسے کی جان لینے والے اور اہل بیت کی بستی تاراج کرنے والے سورما محمد رسول اللہؐ کے پیرو تھے۔ چشم فلک نے اپنی آنکھوں سے تاریخ کا یہ طرفہ تماشہ دیکھا کہ کل تک جو لوگ امام حسینؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے آج وہی ان کے سامنے تلوار اور نیزہ لے کر اڑے ہوئے ہیں۔ اور کسی طرح ان کا سر قلم کر دینا چاہتے ہیں۔ جنگ ختم ہوتی ہے اذان دی جاتی ہے، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللّٰهِ کی منادی کی جاتی ہے اور ہر شخص زیادہ سے زیادہ ثواب جمع کرنے کے لئے اسے محبوب ورد جانتا ہے۔ لیکن ہوس مال، جاہ طلبی اور بغیر کسی استحاق کے حکومت کرنے کی لالچ ہے کہ ایمان و عمل کے درمیان ایک جنگ برپا ہے اور بالآخر لوگ اپنے ایمان کا قتل کر دیتے ہیں۔ میں یہاں پر ایک بنیادی سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ سانحہ کربلا کیوں ہوا اور اس کے اسباب و وجوہات کیا تھے؟

سانحہ کربلا مختلف انداز نظر

سانحہ کربلا ایک ایسا جذباتی مسئلہ ہے جس نے ماحول میں اتنی گرمی پیدا کر دی ہے اور اس واقعہ کو لے کر اتنا شور وغوغا کیا گیا ہے کہ خالص علمی انداز اور سنجیدہ ماحول میں اس مسئلہ پر غور کرنا اور کوئی نتیجہ اخذ کرنا سخت مشکل ہے۔ اس واقعہ کی آڑ لے کر مسلمانوں کے ذہنوں میں تفرقہ اور نفرت کا ایسا بیج بو دیا گیا ہے کہ پوری مسلم سوسائیٹی دو دھڑوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک گروہ نے اس واقعہ کو طول دے کر اور اس کا بہانا بنا کر پوری جماعت صحابہ کو مطعون کرنے کا جواز فراہم کر لیا ہے تو دوسرے گروہ نے بھی کسی انصاف اور میانہ روی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اندھی عقیدت کے جوش میں تمام غلط کاموں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ چنانچہ امام معصوم کی

قربانیاں ان دو گروہوں کے جذباتی سیلاب میں اس طرح گم ہو کے رہ گئی ہیں کہ آج کسی شخص کے لئے اس واقعہ کی صحیح نوعیت کا اندازلگانا بھی سخت مشکل ہوگیا ہے۔ آج تاریخ ۱۴رسوسال کی طویل مسافت طے کر چکی ہے۔ ہمارے پاس ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا براہ راست جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے سوائے ان حوالوں کے جو تاریخی کتابوں میں درج ہیں۔ آپ سبھی جانتے ہیں تاریخ اپنے مصنف کے رجحان کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی مورخ نے ایمانداری کے ساتھ کسی واقعہ کو نقل کیا ہے تو اس کے نتیجہ فکر سے اختلاف کرتے ہوئے واقعاتی پہلو کو دھیان میں رکھ کر تاریخ کا ایک زیرک طالب علم صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بھی ایماندار اور غیر جانب دار ہو۔

واقعہ کربلا پر مختلف لوگوں نے مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا ہے۔ کچھ نے اسے کھلے طور پر حق و باطل کی جنگ کہا، تو کسی نے اسے دو شہزادوں کی آویزش بتایا، تو کسی نے امام حسینؓ کی اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا، تو کسی نے یزید کو ظلم و شقاوت کا مظہر جانا۔ کسی نے اسے کوفیوں کی غداری کا نتیجہ قرار دیا، تو کسی نے اس کو بادشاہ سے زیادہ وفادار طالع آزماہوا خواہوں کی جاہ پسندی کا مظہر کہہ کر پکارا اور ابن عربی نے تو خالص درباری مورخ اور اقتدار وقت کے کاسہ لیس دانشوروں کے انداز میں یہاں تک کہہ دیا کہ حسینؓ کو خود ان کے نانا کی تلوار نے قتل کیا یعنی وہ مسلمانوں کے خلیفہ کی بغاوت کے مرتکب تھے اس لئے مارے گئے۔ غرض جتنی منہ اتنی باتیں۔ ہم آج ان واقعات سے اتنی دوری پر ہیں کہ اس سلسلے کے تمام ریکارڈ کا بالکل غیر جذباتی اور سنجیدہ ماحول میں خالص علمی انداز میں بھرپور جائزہ لے سکتے ہیں اور ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔

میں نے اس مقالے میں یہی انداز نظر اختیار کیا ہے اور اپنا نقطہ نظر خالص واقعاتی تناظر میں پیش کیا ہے جس کے حوالے تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں موجود ہیں۔ قارئین سے میری گزارش ہے کہ اگر میری کوئی بات ناگوار گزرے یا میرے مقالہ پر کوئی اعتراض ہو تو ضرور آگاہ کریں۔ کسی مقام پر میں نے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے تو اس کی بھی نشاندہی کریں انشاء

اللہ آپ مجھے ضدی اور ہٹ دھرم نہیں پائیں گے۔ نعوذ باللہ من ذالک میری نیت کسی کو مطعون کرنے کی نہیں ہے اور نہ کسی کو اس کے مقام سے گرانا مقصود ہے۔ جس سے خدا راضی ہو اس سے میں ناراض ہو کر کیا کر سکتا ہوں؟ اس لئے کہ انجام کار سارے معاملات خدا کے حضورؐ پیش ہونے ہیں اور اس کے لئے اس نے ایک یوم حساب بنا رکھا ہے جہاں تمام اختلافی معاملات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ہمیں اس معاملہ سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے کہ ایک صحیح بات لوگوں کے سامنے آئے اور یہ واقعہ آج ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے اس سے ہم واقف ہوں۔ یہ باتیں بطور جملہ معترضہ ہیں اس لئے کہ جیسا میں نے پہلے کہا معاملہ بڑا نازک اور جذباتی ہے اور اکثر آدمی حد انصاف اور حد اعتدال سے آگے نکل جاتا ہے۔

واقعہ کربلا کا پس منظر

حضرت امیر معاویہؓ جس طرح مسلمانوں کے خلیفہ ہوئے یہی بات مسلمانوں کے محل نظر تھی وہ اب تک کی روایت کے موجب مسلمانوں کے منتخب خلیفہ نہیں تھے بلکہ انہوں نے حکومت وسیادت بزور شمشیر حاصل کی تھی، جب حضرت امام حسنؓ نے ان سے صلح کر لی تبھی جا کر وہ مسلمانوں کے بلاشرکت غیرے حکمراں ہوئے۔ لیکن ان کی طرز حکمرانی کو دیکھ کر صحابہ کرام اور دیگر علمائے امت نے باوجود ان کے صحابی رسول ہونے کے ان کے دور حکمرانی کو کبھی خلافت راشدہ یعنی خلافت علی منہاج النبوۃ سے تعبیر نہیں کیا بلکہ انہیں ایک بادشاہ جانا اور مانا۔ چنانچہ عام الجماعہ کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت ہونے کے بعد جب مشہور صحابی رسول اور فاتح عراق حضرت سعد بن ابی وقاص ان سے ملے تو انہوں نے امیر معاویہؓ کو السلام علیکم یا یہا الملک یعنی اے مسلمانوں کے بادشاہ کہہ کر خطاب کیا۔ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ لوگ ان کو بادشاہ سمجھتے تھے بلکہ خود حضرت معاویہ کو اس کا اعتراف تھا۔ المستعاب اور البدایہ والنہایہ میں حضرت معاویہؓ کا قول موجود ہے کہ وہ مسلمانوں میں پہلے بادشاہ ہیں۔ گویا حضرت علیؓ کی خلافت کا خاتمہ مسلمانوں

میں ملوکیت کا آغاز ہے اوراس کا سہرا جناب معاویہؓ کے سر جاتا ہے۔حافظ ابن کثیر کے بقول سنت بھی یہی ہے کہ ان کوخلیفہ کے بجائے بادشاہ کہا جائے کیونکہ نبیؐ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی پھر بادشاہت ہوگی۔اور یہ مدت ربیع الاول ۱۴ھ میں ختم ہوگئی۔جب کہ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

جس طرح ہر بادشاہ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ ہو حضرت معاویہؓ نے لاکھوں جتن سے حاصل کی ہوئی دولت اسلامیہ کو اپنے بیٹے کی طرف منتقل کرنا اپنا فرض منصبی سمجھا۔حالانکہ ان سے پہلے کسی خلیفہ اسلام نے اس کی جسارت نہیں کی تھی۔حضرت عمر اور حضرت علی کے سامنے لوگوں نے ان کے بیٹوں کوخلیفہ بنانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن دونوں نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔حضرت عمرؓ نے سختی سے اس تجویز کی مخالفت کی اور حضرت علیؓ نے نہ اس کی حامی بھری اور نہ انکار کیا بلکہ مسلمانوں کی عام رائے پر چھوڑ دیا۔مگر حضرت معاویہؓ نے اپنے سلف صالحین کے اسوہ کو چھوڑتے ہوئے ہر قیمت پر اپنے بیٹے کو اپنا جانشیں بنانا چاہا۔حالانکہ یہ بات حق ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ اور امام حسن یا امام حسین ابن علیؓ کے مقابلہ میں وہ بالکل فروتر تھا۔

کہتے ہیں حضرت معاویہؓ کو پہلے اس کا کوئی گمان نہ تھا بلکہ کچھ More loyal than the king قسم کے لوگوں نے محض ہوس جاہ ومال کی خاطر ان کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا کیا اور باپ ہونے کے ناطے بیٹے کی فطری محبت میں گرفتار ہوکر انہوں نے وہ قدم اٹھایا جو عظیم سانحہ کربلا کا سبب بنا۔یہ تو اسلام کی سخت جانی کہئے یا اللہ کا وعدہ کے یہ دین زندہ ہے اور ہم آج مسلمان ہیں ورنہ ایک طرح سے اس دین کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش ہی کی گئی تھی۔

سوال یہ ہے کہ یزید کی بیعت خلافت کی مخالفت کیوں کی گئی تھی۔تاریخی کتابوں کے استحضار سے اندازہوتا ہے کہ اس کے دو اسباب تھے۔

(۱) یزید اس منصب کے لائق نہیں تھا۔

(۲) اس سے اسلام میں ایک مذموم بدعت یعنی ملوکیت کی بنیاد پڑتی تھی۔

بعض لوگوں نے یزید کے اخلاق و عادات کے بارے میں خاصہ محتاط انداز اختیار کیا ہے یعنی یہ کہ وہ یقیناً اس دور کے تقوی و اخلاص سے فروتر تھا تو بعضوں نے اس میں خاصہ مبالغہ آرائی سے کام لیا اور دنیا بھر کی تمام قبیح سے قبیح برائیاں اس کے نام منسوب کی ہیں۔ مجھے ان دونوں باتوں میں کوئی صداقت نہیں معلوم ہوتی نہ یہ بات درست ہے کہ یزید محض سیر و شکار کا شوقین تھا اور نماز قدرے دیر سے پڑھتا تھا اور نہ یہ بات کہ وہ تمام گناہ کبیرہ کا مرتکب اور پلندہ تھا۔ یزید کے سلسلے میں ابن خلدون نے ابن اثر کے حوالہ سے زیاد بن سمیہ جو ابوسفیان کی ناجائز اولاد تھی کا ایک قول نقل کیا ہے جو اس نے امیر معاویہؓ کے کارندے کے سامنے بیان کیا 'یزید میں آوارگی، بیہودگی، بددیانتی اور نااہلی ہے۔'' حضرت معاویہ نے احنف قیس سے پوچھا کہ یزید کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے عرض کیا '' مجھے خوف ہے کہ میں جو کہوں گا اس کی تم تصدیق کرو گے اور اللہ کا خوف یہ ہے کہ وہ تکذیب کرے گا اے امیر المومنین! تم یزید کے روزمرہ کے حالات سے بخوبی واقف ہو، اس کے ظاہر و باطن سے آمد و رفت سے کماحقہ آگاہ ہو، اگر تم جانتے ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور امت محمدؐ کی بہتری ہے تو کسی سے مشورہ نہ کرو اور تم اس کے خلاف جانتے ہو تو دنیا کی زیادہ فکر نہ کرو، سفر آخرت قریب ہے۔'' اس بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ یزید کے سلسلے میں عام ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ نے اپنے عمال اور بہی خواہوں کو حکم دیا کہ وہ مملکت اسلامیہ کے دور و نزدیک تمام مقامات پر پھیل جائیں اور لوگوں کے سامنے یزید کی خوبیاں بیان کریں تا کہ لوگ اس کو افضل اور بہتر سمجھنے لگیں اور اس کی خلافت قبول کر لیں۔

ان بیانات کے دیکھنے سے محتاط انداز میں جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ یزید کی زندگی عوام کی نظر میں مشکوک تھی۔ اس کی اخلاقی حالت اطمینان بخش نہیں تھی اور اب تک منصب خلافت کے عالی مقام حاملین جس معیار و مرتبہ کے تھے بلکہ خود حضرت معاویہؓ جس اخلاق و کردار کے حامل فرد

تھے ان کے مقابلہ میں وہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے عوام وخواص سبھوں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور صرف حکومتی جبر واستبداد ہی ان کو بیعت یزید پر مجبور کر سکا۔

یزید کی بیعت خلافت سے لوگوں کے انکار کی دوسری وجہ اسلامی نظامی خلافت کا خاتمہ، نااہلی اور ملوکیت کی ابتداء تھی جس کو سبھی ہوش مند اور باغیرت مسلمان ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ یہ مذموم رسم اگر ایک بار رائج ہوگئی تو پھر اس کو اتار پھینکنے میں نہ معلوم کتنی صدیاں گذر جائیں گی اور کتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہے گا۔ چنانچہ اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے یزید کی دستار بندی کی خبر سن کر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے مروان والی مدینہ کے سامنے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تم خلافت کو حکومت ہرقل بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل مرجائے اس کی جگہ دوسرا ہرقل قائم ہو، ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام حسینؓ بن علی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت زبیر سبھوں نے اس کلام کی تائید کی۔ حضرت معاویہؓ کی داد ودہش مشہور تھی۔ اور وہ اپنی مقصد براری کے لئے لوگوں پر بے دریغ مال خرچ کرتے تھے تاکہ لوگوں کو اپنا احسان مند رکھیں اور ان کی نظریں نیچی رہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس بطور نذرانہ ایک ہزار درہم ارسال کیا جس کو انہوں نے قبول کرلیا پھر فورا یزید کی ولی عہدی کا تذکرہ کیا تو ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا۔ میں اپنے دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کروں گا۔ کیا معاویہ نے ایک ہزار درہم پر میرے دین کو خریدنے کا قصد کیا ہے؟ یہ کہہ کر انہوں نے درہم واپس کردیئے اور یزید کی ولی عہدی سے انکار کردیا۔

لیکن امیر معاویہؓ تو تہیہ کئے ہوئے تھے چاہے جیسے بھی ہو اپنے بیٹے کو خلیفہ بنا دینا ہے اس لئے انہوں نے تمام ملکت اسلامیہ میں اپنے عمال کو خاص ہدایتیں دیں۔ اپنی بخشش ومدارات کا منہ کھول دیا۔ کسی کو بہلا پھسلا کر کسی کو مال ومنال دے کر کسی کو گورنری اور جاگیر عطا کر کے لوگوں سے ولی عہدی یزید کی بیعت لینا شروع کردیا۔ لیکن یزید کی بیعت اس وقت تک متحقق نہیں ہوسکتی تھی۔

جب تک اہل مدینہ اوراہل مکہ اس کو تسلیم نہیں کر لیتے کیونکہ یہی لوگ اسلامی دنیا کے رہنما اور سربراہ تھے اور اس وقت اہل مدینہ کی قیادت حسینؓ بن علیؓ ،عبد اللہ بن زبیرؓ،عبد اللہ بن ابی بکرؓ کے ہاتھوں میں تھی ۔ چنانچہ ان لوگوں کوراضی کرنے کے لئے حضرت امیر معاویہؓ نے خود مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔ پہلے تو ان صحابیوں نے مدینہ چھوڑ دیا اور مکہ چلے آئے لیکن جب وہ مکہ بھی آ پہنچے تو مجبوراً ان سے ملنے گئے حضرت معاویہؓ نے پھران سے راہ ورسم بڑھائی اور انتہائی لجاجت کے ساتھ اپنے بیٹے کی ولی عہدی قبول کرنے کی درخواست کی ۔

مذکورہ بالا تمام اصحاب نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو اپنا وکیل بنایا جنہوں نے حضرت معاویہؓ کے سامنے تین شرائط رکھیں اور کہا آپ میں سے جس کو چاہیں مان لیں ہم آپ کی پیروی کریں گے۔ ایک یہ کہ رسول اللہؐ نے انتقال فرمایا اور کسی کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا۔لوگ حضرت ابوبکرؓ سے راضی ہوئے اوران کو اپنا امیر بنالیا۔امیر معاویہؓ بولے تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے مجھے اختلاف امت کا اندیشہ ہے۔ جواب دیا سچ کہتے ہو اچھا دوسرا راستہ یہ ہے کہ جیسا ابوبکر نے کیا وہی تم کرو کہ انہوں نے ایک شخص کو قریش سے جوان سے نسبتاً دور تھا اوران کے خاندان سے نہ تھا آپ نے اس کو خلیفہ بنایا۔اس پر معاویہ خاموش رہے تب انہوں نے کہا تو پھر تیسری بات یہ کہ عمر ابن خطاب کی پیروی کرو انہوں نے اپنے بعد چھ آدمیوں کو اہل شوریٰ قرار دے کر انتخاب خلیفہ کا اختیار دیا اوران چھ میں نہ کوئی ان کالڑکا تھا اور نہ کوئی ان کے خاندان کا۔امیر معاویہ نے پوچھا کہ اس کے سوا اور کچھ کہو گے جواب دیا کچھ نہیں۔تب انہوں نے جواب دیا تم لوگ کچھ بھی کہتے جاؤ لیکن میں یزید کو ولی عہد ضرور بناؤں گا۔اللہ کی قسم !اگر کسی نے میری بات نہ مانی تو خیر نہ ہوگی اورانہوں نے افسر پولیس کو بلا کر حکم دیا کہ جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن اڑا دینا۔اس کے بعد وہ لوگ اس مجلس سے اٹھ کر چلے گئے ۔ابن خلدون نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس کے بعد امیر معاویہؓ منبر پر چڑھ گئے تو عوام کے سامنے ان اصحاب کی تعریف کی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ ان لوگوں نے

بیعت کر لی ہے جس کے بعد مکہ اور مدینہ کے لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔

اس طرح حضرت امیر معاویہؓ نے ان حضرات کا مشورہ نہیں مانا اور اپنے بیٹے کو اپنا جانشیں مقرر کر کے اسلام میں ایسی سیاسی بدعت کی بنیاد ڈال دی جس نے ملوکیت کے نظام کو پوری طرح مستحکم کر دیا۔ موجودہ دور کے ایک عظیم محقق نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس کے بعد ملوکیت کا یہ نظام ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کی خلات تک ایک دن کے لئے بھی اس میں تزلزل واقع نہیں ہوا۔ جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لئے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوتا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے۔ لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔''

غرض اس طرح یزید کی بیعت خلافت کا معاملہ متحقق کر کے حضرت معاویہؓ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر سرکاری رائے کا جائزہ لیتے چلنا بھی مفید معلوم ہوتا ہے جو یزید کی بیعت خلافت کے سلسلے میں دی جاتی تھی۔ کسی خلیفہ کے منتخب اور متعین نہ ہونے کی صورت میں لوگ یہ تاثر دیتے تھے کہ مملکت اسلامی میں خون خرابہ ہوگا اور طوائف الملو کی پیدا ہوگی۔ حالانکہ یہ بات دو وجوہات سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے ایک نظری اور دوسری عملی۔ نظری یہ ہے کہ جب اہل مدینہ کے سامنے یہ بات لائی گئی کہ حضرت معاویہ تمہارے مشورے سے اپنا جانشیں مقرر کرنا چاہتے ہیں تا کہ بعد میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو جائے تو سبھوں نے اس رائے کی تائید کی لیکن جب یزید کی ولی عہدی

کا مسئلہ سامنے آیا تو سارے لوگ بھڑک اٹھے۔ یہاں یہ واضح ہے کہ لوگ حضرت معاویہ کو یہ اختیار دینے کو تیار تھے کہ وہ اپنے بعد مسلمانوں کا ایک خلیفہ منتخب کر جائیں جس میں ان کی مرضی شامل ہو۔ لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حضرت معاویہؓ اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ اندازہ تو اسی وقت ہوگیا تھا کہ یزید کی خلافت بغیر خون بہائے قائم نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کہ اگر خلیفہ نہیں منتخب کیا گیا بلکہ نہیں بنایا گیا تو سلطنت اسلامیہ میں خون خرابہ اور طوائف الملو کی پیدا ہوگی ۔ بلکہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یزید کی خلافت مسلمانوں کے لئے ایسی لعنت ثابت ہوئی جس میں جو کچھ نہیں ہونا چاہئے تھا وہ سب کچھ ہوگیا۔ خاندان اہل بیت کا قتل وخون ۔ مدینۃ الرسول کی بے حرمتی اور خانہ کعبہ پر حملہ اب کیا باقی رہ گیا تھا جس کو کوئی شخص امکان میں لاسکتا تھا۔

یزید کی خلافت کے بعد

بہرحال امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید خلیفہ بنا۔ لیکن یہ چند اصحاب بدستور اپنے رویہ پر قائم رہے۔ حضرت امام حسین چونکہ یزید کی ولی عہدی کو ناجائز تصور کرتے تھے اس لئے کھل کر انہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ۔ جس پر ان کو ہر طرح سے ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی گئی بلکہ یزید کے خلیفہ ہوتے ہی ولید بن عقبہ بن ابی سفیان والی مدینہ نے ان کو طلب کیا اور یزید کی بیعت کرنے کو کہا۔ سابق والی مدینہ وہیں موجود تھا اس نے اسے مشورہ دیا کہ امام حسینؓ اگر سیدھی طرح بیعت کرلیں تو ٹھیک ورنہ انہیں گھر نہ لوٹنے دو یا تو گرفتار کرلو یا پھر قتل کردو بلکہ خود یزید نے والی مدینہ کو خط لکھا جس کو دائرۃ المعارف انسائکلو پیڈیا آف اسلام طبری ابن اثر وغیرہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ ''حسینؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بیعت پر مجبور کرو اور پوری سختی کرو یہاں تک کہ یہ لوگ بیعت کرلیں۔ گویا حضرت امام حسینؓ کو اور دیگر مخالفین کو مدینہ میں ہی قتل یا گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ایک تو عقبہ بن سفیان کو امام کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے

کی ہمت نہیں ہوئی دوسرے مدینے میں بغاوت کا شعلہ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔لہذا ایسے موقع سے عبداللہ بن عمر تو مسجد نبوی میں گوشہ نشیں ہو گئے لیکن حضرت امیر معاویہؓ کی وصیت کے موجب جس کو طبری الفخرانی۔ابن خلدون اور اسی کے حوالے سے مولانا شاہ معین الدین ندوی اور مولانا شاہ اکبر نجیب آبادی اور دیگر مورخین نے نقل کیا ہے کہ اہل عراق امام حسینؓ کو تمہارے مقابل کھڑا کریں گے لیکن اس وصیت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ ان سے درگذر کرنا تاہم عبداللہ بن زبیر کے بارے میں کہا کہ وہ لومڑی کی طرح دھوکہ دے کر شیر کی طرح حملہ کرے گا ان کو ہرگز نہ چھوڑنا بلکہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دینا۔لہذ ان حضرات کو اپنی بغاوت کے نتیجے میں یہ احساس تھا کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔اس لئے ان لوگوں نے مدینہ چھوڑ کر مکہ میں پناہ لینی بہتر سمجھی تا کہ یہیں حرم کعبہ کے حدود میں رہ کر محفوظ و مامون رہ سکیں گے۔عبداللہ بن زبیرؓ تو پہلے ہی آ گئے تھے اور حالات بگڑتا ہو ادیکھ کر امام حسینؓ نے بھی وہیں پناہ لینی چاہی اور مکہ پہنچ گئے۔

مکہ کے لوگوں کا محتاط رویہ

امام حسینؓ کا مکہ آنا، یزید کی خلافت کے مخالف قوتوں کے لئے ایک مرکز کی فراہمی تھی۔چنانچہ لوگ جوق درجوق امام حسین کے پاس آنے لگے اور اپنی حمایت کا اظہار کرنے لگے۔ گو کہ مکہ اور مدینہ کی بیشتر آبادی یزید کی خلافت کو پسند نہیں کرتی تھی۔لیکن حال فی الحال حضرت معاویہؓ اور حضرت علی کے درمیان جو خونریز لڑائی ہوئی تھی جس میں مسلمانوں کی تلواروں نے مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔اس لئے لوگ بڑے دل گرفتہ ہو گئے تھے اور اب کوئی قدم پھونک کر اور سمجھ بوجھ کر اٹھانا چاہتے تھے۔اس لئے ان کی خاموش حمایت حضرت امام حسینؓ کو حاصل رہی لیکن کھل کر لوگوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔اسی درمیان کوفہ، جو ایک زمانہ میں حضرت علیؓ کا دارالخلافہ رہا تھا کے لوگوں نے حضرت امام حسینؓ پر پے در پے اصرار کرتے ہوئے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ

کوفہ آ جائیں اور وہ سب لوگ ان کا ساتھ دیں گے اور یزید کی خلافت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

امام حسین کا کوفہ جانا اور کوفہ والوں کا سلوک

حضرت امام حسینؓ کو اگر چہ ان کے تمام ہمدرد دوست، بہی خواہ، معاملہ اندیش اور سمجھدار لوگوں نے مشورہ دیا اور ہر طرح سے سمجھایا لیکن انہوں نے کسی کی بات نہ مانی اور کوفہ والوں کے بلاوے پر ان کی حمایت پر بھروسہ کرتے ہوئے وہاں جانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ حضرت امام حسین نے یہ فیصلہ محض جذباتی انداز میں نہیں کیا تھا بلکہ سوچ سمجھ کر کیا تھا اور اپنی طرف سے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر لی تھیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا جس کی وجہ سے تمام معاملات الٹ گئے۔ کوفیوں نے اٹھارہ ہزار خطوط لکھے تھے اور جناب مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کیا تھا لیکن جب ابن زیاد نے مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو قتل کر دیا تو سارے کوفیوں نے اپنا قبلہ بدل دیا اور وہ جو حضرت امام حسین کو بلا رہے تھے کہ ان کی طرف سے لڑیں گے اور یزید کی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ یزید کے فوجی بن کر آئے اور پورے خاندان اہل بیت کو چند سکوں اور منصبوں کے عوض نہ صرف یہ کہ بڑی بے دردی سے قتل کیا بلکہ نہ معلوم کب کا بدلہ تھا جو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ان کی لاش کو پامال کر کے چکایا۔ انشاء اللہ ان کی اس شقاوت قلبی کا پورا پورا بدلہ اللہ کے آخری فیصلہ میں ان کو ضرور ملے گا۔ میرے نزدیک حضرت امام حسینؓ کا قتل دراصل کوفہ کے جھوٹے ہمدردان علی نے کیا اور کرایا اور اس پورے واقعہ میں وہی سب سے بڑے مجرم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

یہاں پر تاریخ کے ایک سنجیدہ طالب علم کو ایک خلجان محسوس ہوتا ہے کہ جب مکہ میں حضرت امام حسینؓ کے تمام ہمدردوں، بہی خاہوں اور دیگر رشتہ داروں نے کوفہ جانے سے منع کیا بلکہ ان پر اعتبار نہ کرنے کا مشورہ دیا اور ان کے ماضی کے کردار کا حوالہ دے دے کر سمجھایا کہ وہ ضرور ان

کودھوکہ دیں گے جیسا کہ وہ حضرت علی کو دے چکے تھے اوراس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ حکمت علمی بھی بتائی کہ پہلے کوفیوں سے یہ کہا جائے کہ وہ یزید کے گورنر کو اپنے علاقہ سے نکال دیں اور قصر خلافت پر قبضہ کرلیں جب وہ یہ کام کرچکیں تو یہاں سے جائیں ان تمام معقول اور مناسب تجویزوں کو رد کر کے وہ پورے خاندان کے ساتھ کوفہ کیوں گئے؟ جب کہ تمام عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے جانے سے بھی لوگوں نے منع کیا تھا۔ میری رائے میں امام حسینؓ نے جس جلد بازی کا مظاہرہ کیا اس کے مندرجہ ذیل وجوہات رہے ہوں گے۔

(۱) اولاً تو مکہ اور مدینہ میں ایسی فعال حمایت کا یقین نہیں تھا جو ان کی حمایت میں کارگر ثابت ہوتی بلکہ ان کی گرفتاری سے باز رکھتی۔

(۲) دوسرے کوفہ میں جو حمایت کی لہر اٹھ رہی تھی تو امام حسینؓ نے محسوس کیا کہ ان کی موجودگی مزید تقویت پہنچائے گی اور بہت جلد وہاں ایک غالب طاقت بن جائیں گے۔

(۳) تیسرے اپنے پورے خاندان کو لے جانے کا فیصلہ انہوں نے دو وجہوں سے کیا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ ان کی غیر موجودگی میں چونکہ ان کے نقطۂ نظر سے مکہ اور مدینہ کے حالات غیر تشفی بخش تھے اس لئے ان کے اہل خانہ کو گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا دوسرے جب وہ پورے خاندان کے ساتھ کوفہ جائیں گے تو کوفہ والوں کو یہ احساس مضبوط ہوگا کہ حسین محض حکومت کی لالچ میں ان کے پاس نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ ان کو ہم سائے گی کا شرف بخشنے آئے ہیں۔

(۴) ایک اور پہلو جو اکثر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ امام حسینؓ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یزید کی خلافت کے مسئلہ سے نمٹ لیا جائے کیونکہ اگر اس کو استحکام حاصل ہوگا تو خاندانی حکومت کی خباثتیں بنائے دین کو مجروح کرنا شروع کردیں گی اس لئے اپنے مشن کے عملی پہلو پر زیادہ سوچ بچار کئے بغیر انہوں نے جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے ایک بات

ٹھان لی اور کسی کی کچھ نہیں مانی۔ شاید ان کو یہ احساس بھی ہو رہا ہو کہ کوفہ والے اگر ہمارا ساتھ نہیں بھی دیں گے پھر بھی وہ ہم کو دشمنوں کے حوالہ نہیں کریں گے اور کم از کم ان کی تلواریں ہمارے خلاف تو نہیں اٹھیں گی۔ مگر ہوا وہی جس کا لوگوں کو اندیشہ تھا۔ ان تمام واقعات کو جب پوری تفصیلات کے ساتھ ایک سنجیدہ طالب علم پڑھتا ہے جس کا مختصر حال اوپر درج کیا گیا ہے تو بعض اوقات ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ حسینؓ و یزید کی جنگ محض خلافت کی جنگ تھی۔ چونکہ حضرت امام حسین اپنے کو منصب خلافت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے اور یزید کی بیعت کو غلط جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے عملاً بغاوت کی جس کے نتیجہ میں شہید ہوئے اور جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ یزید کے بقول یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ شاید اسی بات کو اس کی گہرائی میں اتر کر نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے یا پھر اقتدار وقت کی جبہ سائی کی خاطر ابن عربی نے یہاں تک لکھ دیا کہ حسینؓ کو خود ان کے نانا کی تلوار نے قتل کیا اور کچھ دوسرے لوگوں کے بقول کربلا کی جنگ دراصل دو شہزادوں کی جنگ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت امام حسین کو مسلم بن عقیل اور ہانی کی شہادت کی خبر ملی اور کوفہ والوں کی غداری کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور انہوں نے اہل محاسبہ کے سامنے تین تجاویز رکھیں۔ یا تو ان کو لوٹنے کی اجازت دی جائے وہ جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں گے۔ یا کسی سرحد پر بھیج دیا جائے باقی عمر جہاد فی سبیل اللہ میں گزار دیں گے یا پھر یزید کے پاس لے جایا جائے وہ دونوں باہم مل کر ایک بات طے کر لیں گے۔ لیکن ابن زیاد نے اپنی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوفیوں کی منافقانہ ہمدردی کا بھانڈہ پھوڑنے کے لئے امام حسینؓ اور ان کے پورے خاندان کو خود انہیں سے قتل کرا دیا۔

میں پھر یہاں ایک سوال چھیڑتا ہوں کہ کیا حضرت امام حسینؓ کو یزید سے پُرخاش صرف اس لئے تھی کہ وہ اپنے کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے کیونکہ وہ حضرت فاطمہؓ کے لال تھے اور رسول

اللہ کے نواسے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہت سی باتوں میں ایک بات ہے جو انہوں نے اپنے کیس کو مضبوط کرنے کے لئے کہی تھی لیکن بنیادی بات یہ نہیں ہے کیونکہ جب امیر معاویہؓ نے مدینہ والوں کے سامنے تجویز بھیجوائی کہ وہ اپنا ایک جانشیں اپنی حیات میں ہی مقرر کردینا چاہتے ہیں تاکہ امت آئندہ انتشار سے محفوظ رہے تو تمام لوگوں نے بیک زبان ان کی اس تجویز سے اتفاق کیا لیکن جب جانشین کی حیثیت سے یزید کا نام آیا تو لوگ بھڑک اٹھے اس لئے بھی کہ وہ اس منصب کا اہل نہیں تھا اور اس لئے بھی کہ اس سے ملوکیت کی بنا پڑتی تھی۔ اس لئے حضرت امام حسینؓ نے اپنا دعویٰ خلافت محض اپنے نسب کی بنیاد پر پیش نہیں کیا بلکہ دراصل خلافت علی منہاج النبوۃ کی بقا کے لئے پیش کیا جس کے لئے وہ اپنے آپ کو زیادہ مستحق اور ذمہ دار جانتے تھے۔ اس لئے کہ یزید کی بیعت خلافت نہ صرف یہ کہ محض ایک غلط فرد کا منصب حکومت پر فائض ہوجانا تھا بلکہ نظم خلافت کا درہم برہم بھی ہوجانا تھا جو ان تمام باتوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کے مترادف تھی جس کو حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک تمام خلفاء راشدین مہدیین نے نہ صرف عزیز رکھا بلکہ ہر قیمت پر قائم وجاری کیا۔

دراصل حضرت امام حسینؓ کی جنگ کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے میں حضرت امام حسین کے خطبوں سے جو انہوں نے مختلف مقامات پر دیئے ہیں اور جو کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے حوالے سے اس پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا جو یزید کی خلافت سے پیدا ہوئیں جس کو ختم کرنے کے لئے حضرت امام حسین نے بغاوت کی نیت کی اور شہادت کا منصب پایا۔

حضرت امام حسین کو جب ابن زیاد کی فوجوں نے گھیر لیا جو تمام کے تمام کوفہ کے باشندہ تھے اور وہ لوگ تھے جنہوں نے امام حسینؓ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی لیکن وقت کا تیور بدلتا دیکھ کر نہ صرف یہ کہ ان کی بیعت اور اپنے عہد سے انکار کردیا بلکہ اب امام حسینؓ اور ان کے گھر والوں سے

لڑنے کے لئے آ گئے تھے اور کسی طرح ان کا سر کاٹ لینا چاہتے تھے تا کہ ابن زیاد کو اپنی وفاداری کا یقین دلا سکیں اور اس طرح اس کے عتاب سے محفوظ رہیں۔

امام حسینؓ کے دو یادگار خطبے

حضرت امام حسینؓ نے اپنے خطبوں میں اپنے آنے کا سبب اپنے مشن کی غرض و غائت اور اپنے مقام و منصب کا اعادہ کر کے ان کو ان ظالمانہ حرکتوں سے بعض رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ظلم وشقاوت کی جس حد کو پہنچ چکے تھے وہاں سے لوٹنے کو تیار نہیں تھے۔ حضرت امام حسینؓ نے کوفی سورماؤں کے سامنے جنہوں نے اپنی وفاداری کی قسم کھائی تھی بلکہ جن کے بار بار کے بلاوے پر ہی وہ وہاں تشریف لائے تھے اپنے آنے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اے اہل کوفہ! خدا کے سامنے اور تمہارے روبرو میرا یہ عذر ہے کہ میں خود یہاں نہیں آیا۔ تمہاری جانب سے بہت سے خطوط اور وفود میرے پاس پہنچے۔ مجھے بار بار دعوت دی گئی کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ آپ آیئے تا کہ آپ کے ذریعہ سے خدا ہمیں راہ راست پر گامزن رکھے۔ اگر اب بھی تمہارا یہی خیال ہے تو میں آ گیا ہوں۔ اگر تم اپنا عہد پورا کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے شہر چلنے کو تیار ہوں اور اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔''

امام حسینؓ نے مقام بیضہ پر جو خطبہ دیا ہے وہ ان کے مشن اور شخصیت کا بھرپور آئینہ دار ہے جس کو ابن اثیر نے اپنی کتاب الحکام جلد چہارم میں پوری تفصیل سے نقل کیا ہے اور اسی حوالہ سے ابن خلدون اور مولانا شاہ معین الدین ندوی نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں دہرایا ہے۔ امام حسین نے فرمایا ''اے لوگو! رسول اللہؐ کا ارشاد ہے جس نے کسی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھا جو خدا کی قائم کی ہوئی حدوں کو توڑتا ہے، محرمات پر عمل کرتا ہے۔ سنت نبویؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا کے بندوں پر ظلم و سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور اسے دیکھنے والے نے کسی قسم کی دست اندازی قولی یا عملی نہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس کے ساتھ ہی شمار کرلے گا۔ دیکھو! یہ لوگ یعنی یزید اور امرائے یزید خدا کی

اطاعت سے منہ موڑ کر شیطان کے تابع ہوئے ہیں۔فتنہ وفساد برپا ہے، حدود الٰہی توڑ دی گئی ہے۔ مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرایا جارہا ہے۔ان حالات میں غیرت میں آنے کا موقع سب سے زیادہ میرے لئے ہے۔تمہارے بہت سے خطوط اور قاصد میرے پاس بیعت کا پیغام لے کر آئے۔تم عہد کر چکے ہو کے نہ تو مجھ سے بے وفائی کروگے نہ مجھے دشمنوں کے حوالے کروگے۔اگر تم اپنی اس بیعت پر قائم رہوگے تو یہ تمہارے لئے راہ ہدایت ہے کیونکہ میں حسینؓ بن علیؓ فاطمہؓ بنت محمدؐ کا لخت جگر ہوں۔ میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے اور میرے اہل وعیال تمہارے اہل وعیال کے ساتھ ہیں۔تم کو میرے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے۔لیکن اگر تم نے ایسا نہیں کیا اور عہد شکنی کی تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوگی۔اس سے پہلے میرے باپ، بھائی اور عم زاد مسلمؓ بن عقیل کے ساتھ بھی ایسا ہی کر چکے ہو۔افسوس کہ تم لوگ مجھے دھوکا دے کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔اپنی دینداری کا حصہ ضائع کر رہے ہو۔یاد رکھو! جو بدعہدی کرے گا، خود اپنے خلاف بدعہدی کرے گا۔عجب نہیں کہ خدا عنقریب مجھے تم سے بے نیاز کر دے (الحکام ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۱۴۔۴۰)

ایک اور موقع پر حضرت امام حسینؓ نے ارشاد فرمایا۔''معاملہ کی جو صورت ہوگئی ہے، تم دیکھ رہے ہو، دنیا نے اپنا رنگ بدل دیا۔لوگوں نے نیکی سے منہ پھیر لیا۔ہولنا کی نے احاطہ کر لیا۔ افسوس! حق پسِ پشت ڈال دیا گیا۔معصیت اور باطل پر علانیہ عمل کیا جارہا ہے۔کوئی نہیں جو ظالم کا ہاتھ پکڑ لے۔وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں بقاء الٰہی کی تمنا کریں۔لیکن میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں۔ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے۔''

امام حسینؓ کا یزید اور امرائے یزید پر متعین الزامات

حضرت امام حسین کے ان خطبات کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین نے یزید کی مخالفت محض کسی نسبی تفاخر کے سبب یا ذاتی طور پر اپنی خلافت کے حصول کے لئے نہیں کیا

بلکہ یزید کی خلافت نے معاملہ کی ساری نوعیت کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ لہذا ان کی غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ اس موقع پر خاموش تماشائی بن کر رہیں بلکہ انہوں نے کوفیوں کے سابقہ کردار کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اس امید پر کہ شاید وہ اپنا طرز عمل بدل چکے ہوں۔ ان کے بلاوے پر گئے اور ہر ممکن طریقہ سے اپنی پوزیشن اور اپنے مشن کو سمجھانے کی کوشش کی ۔ امام حسینؓ نے یزید اور امرائے یزید پر متعین طور پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کئے ۔

(۱) خدا کی فرمابرداری سے گریز اور شیطان کی اطاعت

(۲) سنت نبوی کی مخالفت

(۳) حدود الٰہی کو توڑنا اور فتنہ فساد پھیلانا

(۴) مال غنیمت پر ناجائز قبضہ کرنا

(۵) حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانا اور

(۶) خدا کے بندوں کے ساتھ ظلم و سرکشی کے ساتھ پیش آنا۔

ان حالات میں حضرت امام حسینؓ کے بقول ''غیرت میں آنے کا موقع سب سے زیادہ ان کے لئے تھا''۔ لہذا حضرت امام یہ جانتے ہوئے کہ اس راہ میں جان جانے کا خطرہ ہے پکار اٹھے کہ ''وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں بقائے الٰہی کی تمنا کرے۔ لیکن میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں کیونکہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔'' لہذا وہ خاموش یا غیر منفعل رہ کر اس جرم میں حصہ دار بننا نہیں چاہتے تھے ۔ اور واقعہ کربلا نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مشن میں اتنے مخلص تھے کہ اپنی بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود ایمان اور عمل صالح کی جنگ لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے ۔ اس جنگ میں گو خاندان اہل بیت کی چند عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر تمام لوگوں کو شہید کر دیا گیا اور بظاہر وقت کی یزیدی اور طاغوتی قوت کو میدان کربلا میں کامیابی ملی، لیکن یزیدیت ہمیشہ کے لئے ہار گئی اور اس نے حق کے ساتھ حکمرانی کا سارا استحقاق کھو کر صرف

باطل اور ظلم کو اپنا شعار بنایا۔شاید اسی احساس کے تحت مولانا محمد علی جوہر نے واقعہ کربلا پر اپنے مشہور شعر میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور دورِ حاضر کے مشہور شیعہ رہنما رہبر انقلاب ایران امام خمینی نے کہا ''کربلا کی جنگ تلوار پر خون کی فتح ہے۔'' حضرت امام حسینؓ نے یزید کی ولی عہدی اور اس کی طرز حکومت پر جو تبصرہ کیا وہ محض شخصی نوعیت کا معاملہ نہیں تھا بلکہ حضوؐر سے لے کر خلفائے راشدین کے دور تک ریاست کا جو مزاج اور مقصد تھا اور جس اساسی دستور کے تحت یہ لوگ حکمراں تھے ان میں بنیادی تبدیلی تھی۔ اس کے بعد اسلامی نظام حکومت کی تمام امتیازی علامتیں ختم ہوجاتی اور وہ صرف ایک جسم بے روح ہوکر باقی رہ جاتا بلکہ معاملہ اور بھی شدید اور مشتبہ ہوجاتا ہے کیونکہ ایک کافر اور بے دین حکمراں کسی چیز کو رواج دیتے وقت خدا اور اس کے رسولؐ سے نہ جھوٹی فرماداری کا اظہار کرتا ہے اور نہ اس کے نام پر کسی غلط اور ظالمانہ حکم کو رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب ایک نام نہاد مسلمان اس طرز عمل کا اعادہ کرتا ہے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔کیونکہ اس صورت میں وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر ہی ظلم کو رواج دیتا ہے اس طرح معاملہ کو قبیح اور مشتبہ بنانے کا ذمہ دار ہوتا ہے جس کے بعد اہل حق کو اس کی حمایت یا اظہار حق میں شدید دشواری پیش آتی ہے اور کسی حق پسند کے لئے حق کی تلاش وجستجو سخت دشوار ہوجاتی ہے۔حضرت امام حسینؓ چاہتے تھے کہ معاملہ کی نوعیت واضح ہوجائے اس لئے حکومت کی گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی انہوں نے جان لیا کہ راستہ بدل رہا ہے جس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔لہذا رسولؐ کی گود میں پلنے، فاطمہ زہرا کا دودھ پینے اور علی شیر خدا کی سایہ عاطفت میں پروان چڑھنے والے حسینؓ آخر کیسے سب کچھ دیکھتے، محسوس کرتے اور خاموش رہتے۔ چنانچہ انہوں نے گاڑی کو پھر سے صحیح پٹری پر ڈالنے کے لئے اپنی جان لڑا دینے کا فیصلہ کیا اور ان تمام

نتائج کو جانتے بوجھتے انگیز کر لیا جو اس راہ میں پیش آ ئیں یا آ سکتی تھیں۔

وہ نقطۂ انحراف جس نے اسلام کے نظام اجتماعی کو بدل کر رکھ دیا

سوال یہ ہے کہ وہ نقطۂ انحراف کیا ہے جس کو روکنے کے لئے حسینؓ نے اپنے خاندان کے بچوں تک کو کٹوا دیا۔ اس صدی کے مشہور عالم دین مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے اپنی مشہور تصنیف خلافت وملوکیت میں اور اپنے ایک کتابچہ شہادت امام حسینؓ میں اس نکتہ پر بھر پور روشنی ڈالی ہے جس کو میں نمبر وار پیش کرتا ہوں۔

(۱) انسانی بادشاہی کا آغاز

یزید کی ولی عہدی سے جس انسانی بادشاہی کا آغاز ہوا اس میں خدا کی بادشاہی بالفعل صرف زبانی رہی عملاً اس نے وہی رویہ اختیار کیا جو ہمیشہ سے ہر انسانی بادشاہی کا رہا ہے۔یعنی ملک بادشاہ کا اور شاہی خاندان کا ہے اور وہ مملکت کی جان و مال عزت و آبرو ہر چیز کا مالک و بادشاہ ہے، خدا کا قانون ان کی بادشاہت میں نافذ ہوا بھی تو صرف عوام پر ہوا۔ بادشاہ اور اس کے خاندان امرا اور حکام زیادہ تر اس سے مستثنیٰ ہی رہے۔

(۲) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعطل

اسلامی خلافت کا اصل الاصول یہ ہے کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔مگر انسانی بادشاہت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد حکومت کا مقصد فتح ممالک اور تسخیر علائق اور تحصیل باج وخراج اور عیش دنیا کے سوا کچھ نہ رہا۔حکومت خدا کا دین قائم تو کیا کرتی جن لوگوں نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام لایا بھی تھا ان کو محض حصول مال کی خاطر اور اس دین کی طرف آنے سے روکنے کے لئے ہی بنو امیہ کے دور میں جزیہ تک لگا دیا۔

(۳) موروثی بادشاہت کا آغاز

یزید کی ولی عہدی نے اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اسلام میں خلیفہ کا انتخاب لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ حضرت علیؓ تک قائم رہا۔ امیر معاویہؓ کے معاملہ میں پوزیشن مشتبہ ہوگئی اس لئے صحابی ہونے کے باوجود ان کا شمار خلفائے راشدین میں نہیں کیا گیا۔ لیکن یزید کی ولی عہدی وہ انقلابی کاروائی ثابت ہوئی جس نے اس قاعدے کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس سے خاندانوں کی موروثی بادشاہتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد سے آج تک پھر مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنا نصیب نہیں ہوسکا۔

(۴) شورائی نظام کا خاتمہ

خلافت کا نظام شورائی تھا جن میں اصحاب علم وتقویٰ اور صائب الرائے لوگ پوری جرأت اور حق گوئی کے ساتھ خلیفہ کو مشورہ دیتے تھے لیکن بادشاہت کے قیام کے نتیجہ میں شوریٰ کا یہ طریقہ بدل گیا۔ اب شہزادے اور خوشامدی اہل دربار، صوبوں کے گورنر اور فوجوں کے سپہ سالار ان کی کونسل کے ممبر تھے جن کے بارے میں اگر ان کی قوم سے رائے لی جاتی تو اعتماد کا ایک ووٹ کے مقابلے لعنت کے ہزار ووٹ آتے۔

(۵) آزادی رائے پر قدغن

اسلامی خلافت کا ایک اصول یہ تھا کہ عوام کو خواہ امیر ہو یا غریب، غلام ہو یا آزاد، عورت ہو یا مرد، اظہار رائے کی مکمل آزدی ہوتی تھی لیکن خلافت کے ملکویت میں تبدیل ہوجانے کے بعد عوام سے یہ آزادی چھین لی گئی بلکہ اگر کسی نے حق گوئی کی جرأت کی تو اسے اپنے سر کی کھیتی کٹوا کر ہی حق کی بستی سیراب کرنے کا موقع ملا۔

(۶) خلافت کی خلق اور خدا دونوں کے سامنے جوابدہی سے روگردانی

اسلامی خلافت میں خلیفہ خدا اور خلق کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے لیکن ملوکیت کے قائم ہوتے ہی خلیفہ نہ خدا کے سامنے جوابدہی کا کوئی احساس رکھتا تھا اور نہ عوام کو کسی خاطر میں لاتا تھا۔ وہ قانون سے بالاتر تھا۔ عوام کی عزت وآبرو، اس کی پیٹھ اور اس کا مال بادشاہ اور اس کے اہل کاروں کے لئے حلال تھی۔

(۷) قانون کی حکمرانی کا خاتمہ

اسلامی حکومت خالص قانوں کی حکومت ہے جس میں عام آدمی اور خلیفہ وقت دونوں قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ لیکن ملوکیت میں خلیفہ قانون سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ لہذا اولاً تو اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا اور اگر کوئی ہمت کرتا بھی تو اسے انصاف کا ملنا ایک امر محال تھا۔

(۸) عربی و عجمی تعصّبات کو فروغ

اسلامی نظام خلافت میں مسلمانوں میں حقوق مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات پایا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کے درمیان رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ یہاں سب کی حیثیت برابر ہے۔ اور اگر کسی کو کوئی ترجیح حاصل ہے تو محض سیرت کردار اور اہلیت وصلاحیت کی بنیاد پر۔ لیکن نظام بادشاہی کے قیام کے ساتھ ہی یہ اصول ٹوٹ گیا۔ جب بادشاہی نظام آیا تو عصبیت کے شیاطین ہر گوشے سے سر اٹھانے لگے۔ شاہی خاندان اور ان کے حامی خانوادوں کا مرتبہ سب سے بلند و برتر ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر ترجیحی حقوق حاصل ہو گئے۔ عربی و عجمی کے تعصّبات جاگ اٹھے اور خود عربوں میں قبیلے اور قبیلے کے درمیان کشمکش پیدا ہو گئی۔ ملت اسلامیہ کو اس چیز نے جو نقصان پہنچایا اس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

(۹) بیت المال میں ناجائز تصرف

اسلامی نظام خلافت میں خلیفہ بیت المال کا امین ہوتا ہے۔ حضرت عمر کے بقول وہ اس میں سے اپنی ضروت کے لئے اتنا ہی لے سکتا ہے جتنا ایک یتیم کا ولی اگر غریب ہوتو یتیم کے مال سے لے سکتا ہے لیکن ملوکیت سے بیت المال کی امانت کا تصور ختم ہوگیا اور ناجائز تصرفات کا دروازہ کھل گیا۔

یہ تھے وہ تغیرات جو اسلامی خلافت کو بادشاہی میں تبدیل کرنے سے رونما ہوئے جو بلاشبہہ یزید کی ولی عہدی کے نتیجے میں سامنے آئے۔ اگر چہ ان تمام خرابیوں کو منصۂ شہود پر آنے میں دیر لگی تاہم امام حسینؓ نے اپنی خداداد فراست ایمانی سے محسوس کرلیا تھا کہ آئندہ یہ شجر خبیث کیا پھل دینے والا ہے اس لئے انہوں نے نتائج کی پروا کئے بغیر اپنے خون سے ملوکیت کے سیلاب کو روکنے کے لئے باڑھ باندھنے کی کوشش کی۔ مگر ملوکیت ایک سیل رواں کی طرح حسین اور ان کے اہل خاندان کو بہالے گئی۔ تاہم تاریخ آج بھی اپنی جگہ کھڑی ہے اور زبان حال سے نشان دہی کرری ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے تم غلط سمت مڑے تھے۔ آؤ آج سے پھر اپنا قبلہ درست کرلو۔ حسینؓ کا کردار ایک منارہ نور اور نشان ہدایت ہے۔ ان کا نشان پا صحیح منزل کی طرف رہنمائی کررہا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کون صدق دل سے حسینی مشن کا علم بردار اور حسینی کردار کا حامل ہے اور کون اس لبادے میں کوفی اور خارجی ہے۔

شہادت حسین اور ہمارا طرز عمل

آج حسینؓ کی شہادت مسلمانوں کے دوفرقوں میں باہمی اختلاف کا سبب بنی ہوئی ہے۔ ہر سال محرم کا مہینہ ماحول میں کچھ تلخیاں گھول کر چلا جاتا ہے اور دونوں فرقوں کی خلیج دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ یہ منظر دشمنان اسلام اور مسلمان کے لئے اتنا خوش کن ہے کہ وہ اس کو دیکھنے

کا سال بھر جتن کرتے ہیں اور پھر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس طرح ہر سال حسینؓ کا مشن ہر محرم کے بعد پھر ایک بار پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور یزیدیت مسکراتی رہتی ہے۔ شاید اسی تلخ احساس کا اندازہ کرتے ہوئے اردو کے ایک شاعر نے واقعہ کربلا پر مولانا محمد علی جوہر کے مشہور شعر کی تضمین اس طرح کی ہے کہ ؎

قتل حسین اصل میں فتح یزید ہے
اسلام مردہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور مجھے اس شاعر سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہمارا اجتماعی کردار بالکل اس شعر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ میں اس موقع پر دو باتیں جاننا چاہتا ہوں۔ (۱) آج مسلمانوں میں وہ کون سا فرد یا گروہ ہے جو یزید کا حامی اور خاندان اہل بیت کا دشمن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ محرم کے موقع پر ڈھول پیٹنے، تعزیہ نکالنے، علم بنانے اور ماتم کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا حسینؓ کی قربانیوں کی یاد اسی طرح منائی جاسکتی ہے کہ سلف صالحین کی مقدس جماعت کو بلا استثناء مطعون کیا جائے اور اس کے بغیر خدا کے یہاں کوئی نیکی مقبول نہیں ہوسکتی اور رسولؐ کی بارگاہ میں درود وسلام کا نذرانہ قبول نہیں کیا جائے گا یا شراب اور دیگر منشیات کا استعمال کئے بغیر اور اکھاڑہ نکالنے کے نام پر تمام بدتمیزیوں کا مظاہرہ کئے بنا شہدائے کربلا کی روح کو ایصال ثواب نہیں پہنچایا جاسکتا؟ میرا خیال ہے کہ حسینؓ کے مشن کا اس سے بدترین مذاق اور کوئی نہیں ہوسکتا اور جو لوگ محبّ اہل بیت کہے جاتے ہیں ان کو اپنے طرز عمل کا جائزہ لینا چاہئے اور پوری قوت سے یہ مذموم رسم ختم کرانی چاہئے۔ بلکہ میں ایک بات کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ حسینؓ کے غم میں سینہ کوبی اور گریہ وزاری کا کچھ جواز تو ہوسکتا ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے سنت پر حاملین افراد کس گوشے میں جا چھپتے ہیں جب ان کی جماعت کے لوگ سر بازار ابن زیاد کی شقاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاڑی اور شراب کے نشے میں دھت۔ سڑکوں پر بولڈ ڈانس اور ڈسکو ڈانس کرتے ہوئے اور بے ہنگم فلمی گانوں کی دھن پر ناچتے ہوئے یا حسین اور یا علی کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے پوری ہندوستانی قوم کے سامنے

یہ مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں کہ اس قوم میں اپنے شہدا کے جذبات شہادت کی نہ تو کوئی قدر ہے اور نہ ادنی درجہ کی شرافت اور اخلاقی حس۔ بلکہ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جس طرح ہمارے غیر مسلم بھائی اپنے مذہبی تہواروں کے موقعوں پر اپنی مجلسوں کا رونق بڑھانے کے لئے طوائفوں کا ناچ کراتے ہیں۔ اب سے چند سال قبل پٹنہ میں باضابطہ اوباش قسم کے نوجوانوں نے محرم کے جلوس میں طوائفوں کو نچوایا۔ خدا کی قسم! اگر خاندان اہل بیت کی شہادت کا مذاق اسی طرح اڑایا جاتا رہا تو عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ نام نہاد مسلمانوں کا کوئی گھر استبدا زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہوگا اگر دیدہ عبرت ہو تو دیکھ لو پھر بھیونڈی، جمشید پور، مرادآباد، مئو ناتھ بھنجن اور دیگر مقامات پر ہونے والے واقعات شاید اس قہر خداوندی کا مظہر ہوں۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم ان بیہودہ رسموں اور بدتمیزیوں سے باز آئیں۔ اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔ نقاط اتحاد کو بروئے کار لائیں اور اہل کوفہ نہیں اہل یثرب بنیں۔ اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو بلایا اور خود ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے جس کی وجہ سے نبی کے نواسے نے اصولوں کی خاطر جان دے دی لیکن باطل سے مصالحت نہیں کی اور اہل یثرب نے رسولؐ کو اپنے گھر بلایا اور ان کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا کہا مانا، ان کا کہا کیا اور ان کے چشم و ابرو کے اشارہ پر گھر بار، مکان جائداد، بیوی بچے حتیٰ کہ جان عزیز کی قربانی دے دی تب جا کر اسلام غالب ہوا اور کفر و شرک مٹ گیا۔ ہم اگر صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں تو زبانی دعووں سے اوپر اٹھ کر حسینؓ نے جس اقامت دین کی تحریک چلائی تھی اس کا علم لے کر اٹھیں اور اپنے اخلاق و کردار سے ثابت کر دیں کہ ہم واقعی حضرت امام حسینؓ کے سچے پیرو اور دل سے ان کی قربانیوں کے معترف ہیں تبھی شاید ہمارا دعویٰ محبت اہل بیت خدا کے یہاں باوزن ہوگا ورنہ ہمارا شمار بھی کہیں کوفیوں میں نہ ہو جن کے لئے جہنم مقدر ہو گئی ہے۔

آج حسینؓ کی یاد منانے والے لوگ اور ان کے ہم نوا باطل اقتدار کی جبہ سائی اور جاہ طلبی میں تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دینا چاہتے ہیں اور ہر اس شخص کے درپہ آزار ہیں جو حسینؓ کے مشن کو زندہ کرنا اور ان کے

مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حضرت علی ابتدا سے خلافت کے خواہش مند تھے لیکن جب مسلمانوں نے اپنی آزادانہ رائے سے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کو اپنا خلیفہ بنایا تو انہوں نے نہ منع کیا اور نہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہے اور نہ کوئی فتنہ برپا کیا، بلکہ ان تمام اصحاب کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے جن کے مشوروں اور رایوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ تو تمام اہم امور میں ان سے ضرور مشورہ لیتے اور حضرت علیؓ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے بلکہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کو روانہ ہوئے تو اپنے غائبانہ میں حضرت علی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ پھر حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے میں بھی ان کا یہی طرز عمل رہا۔ جب شورش پسندوں نے حضرت عثمان کو معزول یا قتل کرنا چاہا تو حضرت علیؓ ہی وہ واحد شخص تھے جنہوں نے ہر ممکن طریقہ سے ان کی دفاع کرنی چاہی لیکن جب حالات ان کے قابو سے باہر چلے گئے تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ لوگ جو حضرت علیؓ کو اپنا امام مانتے ہیں۔ امام کے طرز عمل سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ حضرت علیؓ نے اپنے پہلے خلفاء کے خلاف خروج اس لئے نہیں کیا کہ وہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ حکومت کر رہے تھے اور باوجود اپنا حق زیادہ سمجھنے کے عوام کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ان کے تمام کاموں میں شریک وسہیم رہے۔ لیکن جب یزید کی خلافت کے ساتھ باطل کا رنگ چڑھنے لگا تو امام حسینؓ نے یہ اسوہ پیش کیا کہ اس سے نہ کوئی مصالحت ہو سکتی ہے نہ اس بارے میں کوئی مداہنت برتی جا سکتی ہے بلکہ حق کو علی الاعلان پیش کرنا چاہئے اور انہوں نے یہ فرض انجام دیا۔

نئے عہد و پیمان کی ضرورت

اب معاملہ ہمارے ہاتھ ہے اور ہمیں یہ فیصلہ کرنا کہ ہم جن حالات میں جی رہے ہیں اس میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے حال کا رونا روتے ہوئے کہا تھا ۔

کہ قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

آیئے ہم عزم کریں کہ ہم سچے دل سے حسینؓ کے کردار کی پیروی کریں گے اور اسلام کو اس کے اصل پر قائم کرنے کی جدوجہد میں کسی طرح کی قربانی سے گریز نہیں کریں گے اور شہادت حق کے فریضہ کو

ہر قیمت پر ادا کریں گے اور کسی باطل اقتدار کا رعب، خوف یا لالچ ہم کو مرعوب اور خرید نہ سکے گا۔ اگر ہم ایسا کر سکے تبھی ہم حضرت امام حسین کے سچے پیرو اور خاندان اہل بیت کی قربانیوں کے صحیح معترف کہے جا سکتے ہیں ورنہ یہ شور و غوغا خود ہمارے خلاف ایک حجت ہے جو خدا کے آخری فیصلہ میں ہم کو رسوا کر کے چھوڑے گا۔ اللہ ہمیں صحیح دینی شعور عطا کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ کی توفیق عطا کر دے (آمین)

کتابیات

(۱) تاریخ ابن خلدون حصہ دوم

(۲) تاریخ اسلام ۔ شاہ معین الدین ندوی حصہ اول و دوم

(۳) تاریخ اسلام مولانا اختر شاہ خاں نجیب آبادی حصہ دوم

(۴) دائرہ التعارف انسائکلو پیڈیا اسلام جلد سوم

(۵) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ اول ۔ ثروت صولت

(۶) خلافت وملوکیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

(۷) شہادت امام حسین مولان ابوالاعلیٰ مودودی

(۸) حسین بن علی بحوالہ ماہنامہ الاسلام دہلی مولانا آزاد

(۹) ایک جو قمرالہدیٰ

(۱۰) ندائے اسلام شمارہ ۴۱۳ جلد ۴۔ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ محرم مضمون کربلا کا مقصد ۔ حسین مہدی حسینی

(۱۱) ماہنامہ زندگی نوئی دہلی ۔ حضرت علی مرتضی ۔ مولانا ارشادالحق تھانوی

(۱۲) خطبات خمینی

ہندو قوم کے عقائد، سماجی روایات و نفسیات
بہار کی ہندو سماجی اور مذہبی تنظیمیں

ہندو قوم

ہندو قوم نسلی، مذہبی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے ہم نوع (Homogenous) قوم نہیں ہے۔ بلکہ مختلف النوع اور وسیع الاقسام (Hetrogenous) قوم ہے جو باہم مختلف ہی نہیں متضاد خصوصیات رکھتی ہے۔ یہ دراصل ایک جغرافیائی اصطلاح ہے جو دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر آباد لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ اپنی کتاب One's Man world میں رقم طراز ہیں:

"The word. ' Hinduism' itself is a geographical term based upon sanskrit name for the great river that runs across the northern boundaries of India, known as the sindhu. For those living on the other side of river, the entire region to the southeast of sindhu, which the Greeks called Indus,came to be known as the land of Hindus, and the vast spectrum of faiths that flourished here acquired the generic name of Hinduism" (Hinduism: A cycle of challenge and Response pp.129).

یعنی ''ہندوازم ایک جغرافیائی اصطلاح ہے جو ہندوستان کے اتری سرحد پر بہنے والی اس ندی سے مستعار ہے جس کو سنسکرت میں سندھو کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس ندی کے دوسرے کنارے پر رہتے

تھے۔ سندھو کے جنوب مشرق کا پورا خطہ جس کو یونانی انڈس کہتے تھے وہی ہندوؤں کا وطن کہا گیا اور یہاں جو بے شمار عقیدے پروان چڑھے ان سب کو بالعموم ہندوازم کے نام سے جانا جاتا ہے۔''

اس پیراگراف میں ڈاکٹر کرن سنگھ ہندوازم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"In fact,Hinduism calls itself the Sanatan Dharma , the eternal faith, because it is based not upon the teachings of a single preceptor but on the collective wisdom and inspiration of great seers and sages from the very dawn of Indian civilization"

یعنی درحقیقت ہندوازم خود کو سناتن دھرم کہتا ہے جو ایک دائمی عقیدہ ہے۔ یہ کسی ایک دھرم گرو کی تعلیمات پر مبنی نہیں ہے بلکہ عظیم سادھوسنتوں کے مشترکہ حکمت اور ادراک حق کا نتیجہ ہے جو ہندوستانی تہذیب کی ابتدا سے رونما ہوتے رہے ہیں۔''

اس طرح ہندو دھرم ایک خطے سے وابستہ دھرم ہے۔دوسرے یہ کسی ایک گرو کی تعلیمات پر مبنی نہیں ہے اور تیسری اہم بات یہ ہے کہ ابتدائے عہد سے یہ مسلسل حق کی کھوج اور جستجو کا نتیجہ ہے۔

اس طرح عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان سے آنے والے لوگوں نے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر آباد قوم کو ہندو کے نام سے پکارنا شروع کیا اور یہیں سے یہ نام پورے ہندوستان میں پھیلا۔ موجودہ ہندوستان میں جو لوگ مسلمان، عیسائی، یہودی اور پارسی نہیں ہیں یا اسی طرح کی کسی اور مذہب کے پابند نہیں ہیں ان کو ہندو کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بودھ مت، جین مت اور سکھ دھرم اگر چہ الگ مذاہب مانے جاتے ہیں اور ان کا شمار مذہبی اقلیت کے طور پر ہوتا ہے تاہم تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے یہ وسیع تر ہندو قوم کا حصہ تصور کئے جاتے ہیں چنانچہ دستور ہند کی دفعہ (b)(2)25 میں ہندوؤں کے تحت سکھ، جین اور بودھ کو ہندو خانے میں شامل رکھا گیا ہے۔حالانکہ بہت سے غالی سکھوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ڈاکٹر امبیڈکر نے ہندو دھرم

چھوڑ کر بودھ دھرم یہ کہتے ہوئے اختیار کیا کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔اس طرح یہ مذاہب بالعموم ہندو دھرم کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئے تھے،مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی الگ شناخت کھوتے جا رہے ہیں۔اس لئے انہیں ہندو دھرم کے ایک مت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے قبل نہ اس پورے خطہ کا ایک نام تھا اور نہ یہاں رہنے والی قومیں ایک نام سے پکاری جاتی تھیں۔وید، پران،اپنشد،مہابھارت،رامائن کسی بھی کتاب میں ہندو قوم کو ہندو کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔دراصل ہندو لفظ عربی اور فارسی سے مستعار ہے۔قدیم سنسکرت لٹریچر میں یہ لفظ نہیں ملتا ہے۔یہاں کے لوگ نارتھ انڈیا میں آریائی اور ساؤتھ انڈیا میں دراوڑ کہے جاتے تھے آریائی مقامی ہیں یا باہر سے آئے ہیں یہ مابہ النزاع ہے عام رائے یہ ہے کہ آریائی باہر سے آئے ہیں۔باہر سے آنے والے خود کو دیو اور مقامی لوگوں کو اسور کہتے تھے اور ان کے درمیان جو قیام ومقام کی جنگ چھڑی اس کو دیو اور ائسر کے نام سے جانا جاتا تھا۔باہر سے آنے والے لوگوں نے مقامی لوگوں کو شکست دے کر ان کے مین لینڈ پر قبضہ کر لیا۔بعض تاریخ دانوں کی رائے میں دراوڑ اور آدی باسی ہی ملک کے اصل باشندہ ہیں۔

جدید ہندتو وادی مورخ اس بات پر مصر ہیں کہ آریائی اس ملک کے اصلی باشندہ ہیں۔ جب کہ تمام مورخین اور قدیم تاریخی شہادتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ آریائی یونان،ترکستان ایران اور وسط ایشیا سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔آریاؤوں کی ایک نسل یورپ چلی گئی اور دوسری ہندوستان آ گئی۔یورپ میں جرمنی اس کا مرکز بنا آریائی خود کو خالص النسل (Pure race) اور اعلیٰ نسل کا مانتے ہیں اور باقی دنیا کو کم تر سمجھتے ہیں۔چنانچہ ہٹلر نے اسی نسلی برتری کے سبب خود کو ممتاز اور محترم قرار دیا اور اپنا قومی نشان سواستک کو بنایا جو آریاؤوں کا قومی نشان تھا اور جو نازی جھنڈے میں نظر آتا ہے۔ایران کے رضا شاہ پہلوی خود کو آریہ مہر کہتے تھے۔قدیم دساتیر اور باقیات کے حوالے سے اس علاقے اور ان میں آباد قوموں کے جن عقائد وتہذیب کا پتہ چلتا ہے ان میں اصنام پرستی،آواگون نسلی برتری،گاؤ پرستی وغیرہ خاص ہیں۔بہرحال ہندو قوم دنیا کی قدیم ترین قوم ہے جس کی پانچ ہزار سالہ تحریری روایات موجود ہیں۔اس قوم میں بدلنے اور بدلتے ہوئے حالات میں خود کو ڈھال لینے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔تاہم تمام تر اتار چڑھاو کے باوجود یہ قوم اندر

سے بہت مضبوط ہے اقبال نے تمام تر داخلی اور خارجی دباؤ کے باوجود ہندوستانی قوم کے تاریخی استقرار کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری۔ یہ قوم پورے آب وتاب کے ساتھ باقی ہے اور پر اعتماد پیش قدمی کر رہی ہے۔

ہندوستان پر خارجی طور پر سکندر اعظم سے لے کر ترک، مغل، منگول اور انگریز قوموں اور تہذیبوں کا حملہ ہوا اور داخلی طور پر بودھ دھرم، سکھ دھرم اور اس کے علاوہ مختلف پنتھ اور وچار دھارا نے اسکو اندر سے پر بھاوت کرنے کی کوشش کی۔ دو چار صدیوں تک تلاطم چلتا رہا پھر اپنا پر بھاؤ دکھا کر اور خود پر بھاوت ہو کر ایک وسیع سمندر میں سما گئے اور اس وسیع قوم اور ملک کا حصہ بن گئے۔ اس لئے ہندوستانی تہذیب کو ملی جلی سنسکرتی (Mosiac culture) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تقسیم ملک کے باوجود مسلمانوں اور انگریزوں کی آمد سے قبل تاریخ کے کسی دور میں اتنا بڑا علاقہ کبھی ایک مرکزی اقتدار کے تحت نہیں تھا۔ لہذا موجودہ عہد ہندوستان کا سب سے شاندار اور سنہرا عہد ہے۔ ہندو قوم اس وقت خود اعتمادی، جوش حوصلوں امنگوں اور زندگی سے بھرپور دنیا کی ایک بڑی قوت بننے اور عالمی رول کو ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ اپنے عددی قوت، مادی فروغ اور قومی تفاخر سے سرشار اپنے ہندو ہونے پر گرو محسوس کرتی ہے اور قوت واقتدار سے لیس ہو کر اپنی تہذیبی برتری کو قائم کرنے پر مصر ہے۔ اس ملک کی دگر قوموں کو یا تو خود ہی سمو لینا چاہتی ہے یا ان کو حاشیہ پر رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے اور گرو سے کہو ہم ہندو ہیں کا نعرہ لگاتے سنی جاتی ہے۔ بہار ہندی ہارٹ لینڈ کا ایک اہم حصہ ہے اس لئے بہاری سماج وسیاست پر بھی اس کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد نفس موضوع پر آنے سے قبل ہندو سماج وثقافت اس کے عقائد و تہذیب، اندرونی بناوٹ اور نفسیات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے چلنا مناسب ہے تاکہ اس وقت ہندو نیشن کا جو تصور ہے اور ہندو نیشلزم کا ابھار ہے اس کو سمجھنا آسان ہو جائے اور ہم جدید ہندو سماج کی موجودہ صورتحال سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔

ہندو عقائد وتہذیب اور نفسیات

ویسے تو ہندوؤں کے یہاں بہت سے دھرم گرنتھ، دیوی دیوتا، پنتھ اور سمپر دائے، رشی منی، اچارج اور گرُو ہیں جن کے عقاید نہ صرف مختلف بلکہ باہم متضاد ہیں۔ لہذا مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح ان کے عقائد متعین اور معلوم نہیں ہیں۔ یہ نہ تو کسی ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں نہ کسی مخصوص مذہبی کتاب کے پابند ہیں اور نہ کسی خاص پیغمبر کے پیرو ہیں۔ان کے عقائد میں اتنا تنوع اور تضاد ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اس کا احاطہ مشکل ہے۔اس بات کو جدید ہندو مذہب کے ترجمان، دانشور اور سیاست داں ہندوؤں کی اُدارتا وادی اور شہشنوتا کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ Non-conforming Anarchic, ہے غلبہ اور اقتدار کی زبان دوسری ہوتی ہے جہاں خامی بھی خوبی نظر آتی ہے۔،مثال کے طور پر مغربی عورتوں کی عریانی اور آوارگی ان کی آزادی اور خود اختیاری تسلیم کی جاتی ہے اور اس کو ایک معروف قدر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جب کہ یہ اپنے آپ میں ایک ایسا بھٹکاؤ ہے جو اس پورے تصور آزادی کو مجہول بنا دیتی ہے۔ٹھیک اسی طرح کی باتیں ہندو عقائد میں پائی جاتی ہیں۔مگر چونکہ وہ ایک غالب قوم ہے اس لئے اس کا یہ ایمانی جھول بھی اس کی خوبی اور وسعت نظری کی دلیل شمار کی جاتی ہے۔

اکھلیشور نے اپنی کتاب ادھونک بھارتیہ سماج۔ بدلاو کی چنوتیاں جو سمے پرکاشن دہلی سے 1997 میں شائع ہوئی ہے اس کے صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے۔

> ''کسی بھی دھرم میں ایشور اور موکچھ کا عقیدہ اس کے بنیادی کردار کو نردھارت کرتا ہے ہندو دھرم میں کسی ایک سروشکتی مان، سرو ویاپی، اننت، رہسمئی ایشور کا تصور نہیں ہے یہ پری کلپنا تری مورتی کے روپ میں ہے۔ برہما، وشنو اور مہیش۔ برہما تخلیق اور زندگی کا خالق ہے۔ وشنو محافظ ہے اور مہیش وناشک ہے۔ایشور کی اس تری مورتی کا تصور ابتدائی ویدوں کے بعد سامنے آئی کیونکہ ان میں اندر ایشور کے روپ میں ہر جگہ موجود ہے۔ بعد میں ویدوں میں برہما اور شو کا ذکر آتا ہے۔ وشنو کا اس کے بعد اپنیشدوں میں تری مورتی کا باقاعدہ استھاپن

ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد بہت سارے نئے دیوی دیوتاؤں کا اوترن ہوتا ہے۔
یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ویشنو دیوی اور سنتوشی ماں مثال کے لئے حال
میں استھاپت دیویاں ہیں۔''

ہندو دھرم، دھرم کم ایک ثقافت زیادہ ہے۔ جہاں آپ ہزاروں دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہوئے کچھ کو چھوڑتے ہوئے کچھ کو اپناتے ہوئے بلکہ سبھی کا انکار کرتے ہوئے بھی اگر آپ اس سماج کی بناوٹ اور اس ثقافت کو چیلنج نہیں کرتے ہیں تو آپ ہندو تصور کئے جائیں گے چاہے آپ کا جو بھی عقیدہ اور اخلاق ہو اس بنیاد پر بہت سارے مذہبی گروہ ہونے کے باوجود ان کے درمیان کوئی اختلاف و تصادم نہیں ہوتا ہے اور کوئی ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لئے جنگ و جدال پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اگر آپ ان کے سماج و ثقافت کو چیلنج کریں گے او ران کے مادی مفادات پر ضرب پڑے گی تو وہ پھر وہ اس کو برداشت نہیں کریں گے۔

بھارتیہ سماج کی بناوٹ اور اس کے تصورات اور پانچ ہزار سالہ روایات پر روشنی ڈالتے ہوئے اکھلیشو را پنی کتاب کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ ''یہ ٹھیک ہے اس کا ادھار اندھ وشواس تھا اور سارا ادارشنک، دھارمک اور سماجک ترک انومان۔ اٹکل بازی اور پری کلپنا کے آدھار پر بنایا جاتا تھا۔ پھر بھی کھگول اور جیوتش ویدیہ کافی وکست تھی۔ ابھی بھی ہندو پنچانگ بھارت کی کھلول اور جیوتش گیان سے ہی تیار کئے جاتے ہیں۔ جس کے مطابق زمین سورج کے چاروں طرف نہیں سورج زمین کے چاروں طرف گھومتا ہے اور اسی بنیاد پر نچھتروں کی رفتار اور اندازہ بالعموم ٹھیک نکلتا ہے۔

ہندو سماج کی تہذیبی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ آگے لکھتا ہے'' ان میں نرمت پارمپرک رتی رواج پراکرتک پر کریا سے گہرے پر بھاوت ہیں۔ اسی لئے اسے سناتن دھرم کہا جاتا ہے لیکن یہ پرکتی کی طرح سناتن دھرم کا بھی کوئی آدی ہے اور نہ انت۔ اس سبھیتا اور سماج میں ویکتی پر مپر اسے پرے کوئی پہل نہیں کرسکتا۔ بودھی اور گیان پرمپرا گت دائرے کے اندر ہی کریاشیل رہتا ہے۔ ا یسا جیون آسان اور سہج ہوتا ہے۔ اس میں نئے سوچ کی جگہ نہیں ہے۔'' (ص ۱۵)

اس وقت بھارت میں ادھونکتا واد اور پرمپرا کے بیچ سنگھرش چل رہا ہے اس میں انگریزی تعلیم یافتہ دانشور طبقہ ہے جس میں سائنسداں اور پیشے ور لوگ شامل ہیں ان کی ذہنیت پر

روشنی ڈالتے ہوئے اکھیلیشو رلکھتے ہیں۔

''ایسانہیں ہے اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ ،دانش ور طبقہ ،سائنس داں اور پیشہ ور پارمپرک مانسکتا سے مکتی پالیتے ہیں۔ اپنے کام کو وہ بالخصو مادی طور پرزندگی گذارنے کا ذریعہ مانتے ہیں۔

دولت کمانا جس طریقے سے بھی دولت حاصل ہو اس مادی زندگی کا حصہ ہے پر وہ بھی من کی شانتی اور آتما کی مکتی کے لئے پارمپرک دھرم کرم میں ہی وشواس رکھتے ہیں۔

جو سادھارن انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ نوکری چاکری میں ہیں وہ تو صد فی صد پارمپرک اندھ وشواش ادھارت دھرم کرم ،روڈھووں اور رتی رواجوں کا آنکھ موند کر پالن کرتے ہیں وہ صرف زندگی گذارنے کے لئے یا پیسے بنانے کے لئے آفس یا فیکٹری یا ویوسائیک سنستھا نوں میں کام کرنے جاتے ہیں۔ان کو سمجھنے ان سے گیان لینے یا اس کو بہتر بنانے کے لئے نہیں باقی جو قصبوں اور گاؤں کے لوگ ہیں وہ کم تعلیم یافتہ اور انپڑھ ہیں ان کا گیان پارمپرک دنیا تک ہی محدود ہے''(ص۱۹)

فرد اور سماج کے بارے میں ہندو نقطۂ نظر

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے فرد اور سماج کے بارے میں ہندو نقطۂ نظر کو ملا کر ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ اس طرح واضح کیا ہے۔

The Hindu view of the individual and his relation to society can be best brought out by a reference to the synthesis of gradation of(1)the four fold object of life (purusartha)desire and enjoyment (ka'ma) interest (Arth)ethical living(dharma)and the spiritual freedom(moksa) (2) the four fold order of society (verna) the man of learning(Brahmin)of power(ksatriya),of skilled

productivity(vaisya)and of service(sudra)and(3)the four fold succession of stages of life (asrama) student (brahamcharya) household(grihasha) forest recluse(vanprasath) and the free super social man(sannayasis).By means of this three fold discipline the Hindu strives to reach his identity which is to change body into soul and to discover the world's potentiality for virtue and divine happiness from it.(Basic Writings of S.Radha Krishnan, Edited by Robert A Medermott ,Jaico Publishing House Delhi- Fourth Edition 1981 pp 189)

ترجمہ: فرد اور سماج سے تعلق کا ہندو نظریہ اس تدریجی امتزاج کے حوالے سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جو زندگی یعنی پروشارتھ کے چار مقاصد سے واضح ہے۔(۱) خواہش وانبساط جس کو کرم کہتے ہیں دوسرا مادی منفعت جس کو ارتھ کہتے ہیں تیسرا مبنی براخلاق زندگی جس کو دھرم کہتے ہیں اور چوتھا روحانی آزادی جس کو موکچھ کہتے ہیں۔اسی طرح سماج کے بھی چار درجات ہیں جس کو ورن کہتے ہیں(۱) صاحبان علم جن کو برہمن کہتے ہیں ۔(۲) صاحبان اقتدار جن کو شتریہ کہتے ہیں۔(۳) صاحبان ہنر اور پیداواری عامل جن کو دشیہ کہتے ہیں اور(۴) صاحبان خدمت جن کو شودر کہتے ہیں۔

اسی طرح انسانی زندگی کے بھی چار مرحلے ہیں جس کو اشرم کہا جاتا ہے پہلا حصول علم کا مرحلہ جس کو برہم چرج کہتے ہیں۔دوسرا خاندانی نظام جس کو گرہستھ اشرم کہتے ہیں۔تیسرا بنباس جس کو ون پرستھ اشرم کہتے ہیں اور چوتھا ترک تعلقات اور ترک دنیا جس کو سنیاس کہتے ہیں۔

اس طرح ان تین طرفہ طرز عمل سے ایک ہندو اپنی پہچان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ دراصل جسم کو روح میں تبدیل کرنے کا عمل ہے اور علائق دنیا سے نیکی اور خوشی کے حصول کی کوشش ہے۔

ہندو سماج کی داخلی بناوٹ کے نقطۂ نظر سے جیسا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے وید، گیتا اور منوسمرتی کی رو سے وہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ ان دھرم گرنتھوں کے مطابق انسان کی اتپتی برہما کے شریر سے ہوئی ہے۔ برہمن اس سماج کا سب سے اونچا طبقہ ہے جسکی اتپتی برہما کے سر سے ہوئی ہے۔ دوسرے نمبر پر شتریہ ہیں جو اس کے بازو اور سینے سے نکلے ہیں۔ تیسرے درجے پر وشیہ ہیں جو برہما کے پیٹ سے نکلے ہیں اور چوتھے درجے پر شودر ہیں جو اس کے پاؤں سے نکلے ہیں۔

ہندوستانی تاریخ وتہذیب کے مطابق برہمن سب سے اونچا طبقہ ہے اور قابل پرستش ہے۔ جبکہ شودر سب سے نیچا طبقہ ہے جو انتہائی ناپاک اور ذلیل ہے جس کے چھو جانے سے آدمی، کھانا، برتن پانی سب ناپاک ہو جاتا ہے۔ برہمن اس قوم کا دماغ، شتریہ اس کے دست وبازو، ویشو اس کے ان داتا اور شودر اس کے سیوک ہیں۔

جدید ہندو مفکرین ورم اشرم کو شرم وبھاجن (تقسیم محنت) کے طور پر بیان کرتے ہیں لیکن تاریخ میں شودروں کے ساتھ کئے گئے انسانیت سوز مظالم کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستانی سماج میں بہت سے سدھار آئے شودروں کو اس ورن مالا کی جکڑ بندیوں سے نکلنے کا راستہ ملا۔ پہلی بار انہیں انسان تسلیم کیا جانے لگا۔ ان کے اندر بھی بہت سی تحریکیں اٹھیں اور باہر سے بھی اصلاحی کوششیں ہوئیں۔

۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کی اصلاحی تحریکیں

۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی میں بدلتے سیاسی حالات کے تحت ہندو قیادت نے ہوش مندی اور بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام تر مذہبی اور تہذیبی روایات وھدایات کے برعکس ایک جدید معاشرے کی بنیاد ڈالی جس میں شودروں کو تمام تر انسانی حقوق اور مراعات دے کر ان کو ہندو سماج میں بنائے رکھنے کی مہم شروع کی گئی۔ چھوا چھوت کے خاتمے کے لئے باضابطہ قانون سازی کی گئی اور اس کو ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا۔ تعلیم روزگار، سیاست اور دیگر تمام شعبوں میں ان کی شمولیت کے دروازے کھولے گئے۔ اب وہ وزیر، حاکم، چیف منسٹر، گورنر۔ صدر اور چیف

جسٹس بننے لگے۔ناری اتھان ، بیواؤں کی شادی ، بال وواہ پر روک انٹر کاسٹ میرج کی ہمت افزائی۔لڑکیوں کو باپ کی جائداد میں حق ، طلاق کا حق اور دیگر بہت سے قانون بنا کر اس سماج کوایک جدید سماج بنانے کی کوشش کی گئی جو ہنوز جاری ہے۔

ہندوستان کے دستور نے ان اخلاقی کوششوں کومہمیز دیاہے اور اب ان اصلاحی کوششوں میں وید پران ،منوسمرتی ریفرنس بک کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ دستور ہند ہی عملاً تمام جدید ضروریات کے لئےRefrence pointہے۔

اس لئے جدید ہندوقوم کو اگر آپ ان کے سابقہ مذہبی لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے تو شاید ان کو صحیح ڈھنگ سے نہیں سمجھ سکیں گے ۔ اس وقت ہندو نیشن اور ہندو نیشلزم کا پورا تصور مغرب بالخصوص یورپ سے مستعار ہےاور وہ خودکواسی تعریف کے اعتبار سے ڈھالنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ ہندوستان کی اسٹیٹ پالیسی میں جمہوریت،انصاف بھائی چارہ مساوات کو اولیت دی گئی ہے۔نیشلزم کے ساتھ سیکولرزم تکنیکی اور سائنسی طور پر بدلتے سماج اور نئے عالمی نظام کا حصہ بننے کی کوشش ہورہی ہےاور خودکوایک موڈرن فورورڈ لوکنگ نیشن کے طور پر متعارف کرانے کا عمل جاری ہے مذہب ایک آڑ مر اور Protective shield کے طور پر استعمال کیا جارہا ہےاوراس کی منمانی تاویل کر کے خودکو ریلی ونٹ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مذہبی مصلحین دھرم گرو بیوکریسی ،اعلیٰ مڈل کلاس ۔ بزنس ٹائی کون سب اس عمل میں معاون ہیں مذہب کو خالص فلسفیانہ ڈھنگ سے پیش کرنے اور عقلی بھول بھلیوں کے ذریعہ لوگوں کومحصور اور باندھے رکھنے کا عمل جاری ہے۔اگر آپ مشہور دھرم گروؤں کا پروچن سنیں تو وہاں آپ کوکتھاؤں کے ساتھ ایسے ایسے متھیہ درشن ہوں گے کہ آپ کا ذہن چکرا جائے گا۔ یہ سائنس،فلسفلہ اورمتھیہ کی کبھی نہ سمجھ میں آنے والی ایسی پہیلی ہے جوعوام کو یہ تاثر دیتی ہے کہ اس کے فکر وعقیدہ کی بنیاد سائنس ہی ہے۔چونکہ مذہب کا روزمرہ کے معاملات سے کوئی لینا دینانہیں ہےاس لئے اس طرح کے مذہبی تصورات افین کھائے شخص کی طرح اس کومسحور رکھتے ہیں اورکسی اور بات پرسوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے ہیں Commitment & non. commitment کے درمیان اس طرح بات ہوتی ہے کہ یہ بھی سہی ہے وہ بھی سہی اورسب سہی ہے۔وہ ایک کتاب،ایک خداایک پیغمبر کے

ماننے والے نہیں ہیں اس لئے کسی چیز کو رد کرنے یا قبول کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اگر آپ ان سے بات کریں اور کسی بات کی تائید میں قرآن وحدیث کا حوالہ دیں تو وہ فوراً اسی سے ملتی جلتی بات کسی اور حوالے سے آپ کے پاس پیش کردیں گے وہ وید کا انکار بھی کرتے ہیں اور اس کو مانتے بھی ہیں۔ وہ منوسمرتی کو رد بھی کرتے ہیں اور اس پرعمل بھی کرتے ہیں۔ وہ رام کرشن کی پوجا بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی کرتے ہیں۔ ان کے کس بات کو اصل مان کر ان سے بات کی جائے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لہٰذا ہندوؤں کے مذہبی نفسیات کو سمجھنے کے لئے ان کی مادہ پرستانہ، مفاد پرستانہ ذہنیت کا سمجھنا ضروری ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں ہندو تنظیموں کے ابھار اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا چاہئے۔ ہندو مذہباً ہمہ اوست (ایشروادمیں) یقین رکھتے ہیں لہٰذا اسلامی اصطلاح میں مشرک ہیں اور تمدن میں سماجی تفریق اور امتیاز کے قائل ومؤید ہیں۔ یہ ورن آشرم آدھارت سماج میں یقین رکھتے ہیں جو اونچ محل کی سیڑھی کی طرح نیچے سے اوپر تک مختلف پائدان میں بٹی ہوئی ہے جس کا اپنا مستقل ڈھانچہ ہے جس کو توڑنا یا پھلانگنا آسان نہیں ہے۔ ہندو سماج ایک طبقاتی سماج ہے جہاں کاسٹ ایک مستقل کلاس ہے۔ یہ ذات ادھارت سماج ہے۔ لہٰذا ہندو نیشن بہت سارے sub-nation اور Sub. Castes کا مجموعہ ہے جس کے مفادات، ترجیحات، مطالبات خواہشات اور عوامی جد وجہد ایک دوسرے سے مختلف بلکہ مخالف ہیں اور ن سورن کی جنگ اور ریزرویشن کے سلسلے میں اٹھے طوفان اس کی سب سے بڑی علامت ہیں۔ اس وقت ہندو قوم میں بیک وارڈ کاسٹ اور دلت ورگوں کے اتھان کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اتنا سنگھرش ہونے کے باوجود وہ ہندو فولڈ سے باہر نہیں آنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ایک غالب قوم ہونے کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ یہاں تک کہ دلت جن کو گاندی جی ہری جن کہا کرتے تھے ابھی اب اپنے آپ کو برہمن کی طرح ہی ہندو مانتے ہیں اور پورے برہمن کرم کانڈ کی پیروی کرتے ہیں ان کا پوری طرح سے سنسکرتائیزیشن ہو چکا ہے اور وہ نیو برہمن ہوگئے ہیں۔ ہندوؤں میں کاسٹ اور کلاس کی جو جنگ ہے اور ان میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے وہ ہندو قوم کا اندرونی معاملہ ہے اس سے مسلمانوں یا دیگر قوموں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ یہ اپنے قومی کش مکش میں جمہوری تقاضے کے تحت

اپنی عددی قوت کے اضافے کے لئے حسب ضرورت مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر اپنی سیاست کرنا چاہتے ہیں تا کہ ان کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو سکے۔افسوس کی بات ہے کہ مسلمان قوم اور اس کی قیادت اس صوتحال میں بارگین کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے بلکہ ابھرتے اقتدار کے ساتھ ہو کر کچھ شخصی اور گروہی فائدہ تک خود کو محدود کئے ہوئے ہے۔اس کش مکش کے نتیجے میں ہندو سماج زیادہ ڈیموکریٹک اور سم رس ہوتا جا رہا ہے جس سے ہندو تہذیب مضبوط ہوتی ہے اور برہمنی اقدار کو قبول عام حاصل ہو رہا ہے۔اب برہمنیت صرف ذات نہیں ذہنیت بن گئی ہے جو صرف برہمنوں تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے ہندو قوم میں برہمنی ذہنیت فروغ پا رہی ہے۔یہ جدید ہندوستان اور ۲۱ ویں صدی کے ہندوستان کی وہ سماجی سچائی ہے جس پر بہت گہرائی سے سوچ وچار کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاست بہار میں ہندو ذاتوں اور تحریکات کا جائزہ

بہار ہندی ہارٹ لینڈ کا مضبوط قلعہ ہے۔بہار 1912 میں بنگال پریسی ڈنسی سے الگ ہو کر نیا صوبہ بنا اس وقت اڑیسہ بھی اسی کا حصہ تھا۔پھر اڑیسہ 1936 میں بہار سے الگ ہو کر الگ راجیہ بنا اور 2002 میں چھوٹا نا گپور کا حصہ بہار سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا اور وہ جھارکھنڈ کے نام سے الگ ریاست کی تشکیل ہوئی۔اس وقت بہار جو کبھی وسط اور اتری بہار کہا جاتا تھا پر مشتمل ایک ریاست ہے۔

بہار کی سماجی بناوٹ یوپی اور مدھیہ پردیس سے ملتی جلتی ہے۔اس لئے ان ریاستوں میں جو سماجی اور سیاسی ہل چل ہوتی ہے اس کے اثرات ایک دوسرے پر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ذات پات ویسے تو پورے بھارت میں پائی جاتی ہے تاہم ان ریاستوں میں ہندوؤں کی اصل شناخت ذات کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ان کے اندر ذات پات کے نظام میں ایسی Rigidity ہے جس نے ان کو قوم کے اندر قوم بنا دیا ہے۔چھوا چھوت کا تصور ابھی بھی دور دراز کے گاؤں میں جہاں روایتی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور جہاں جدید علم وتہذیب کی روشنی نہیں پہنچی ہے باقی ہے تاہم قصبات اور شہروں میں یہ قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔مگر اونچ نیچ فورورڈ بیکوارڈ کا کافی

احساس ملتا ہے۔ اس کے کچھ سیاسی وجوہات ہیں۔ بیک وارڈ لوگوں کو سماجی، تعلیمی معاملات روزگار اور سیاست میں اس کی وجہ سے جو مراعات حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ذات کی شناخت کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ بہار کے در وبست پر فوروارڈ یعنی برہمن۔ بھومیہار راجپوت او رکائستھ چھائے ہوئے تھے۔ اب ان کے ورچسو میں کمی آئی ہے اور ان کی جگہ گوالے، کرمی، کوئری اور دلت ورگوں کے لوگ فیصلہ کے مقام پر فائز ہیں حکومت انتظامیہ۔ سروسز ایکیڈمکس گویا ہر شعبہ میں ان کی نمائندگی بڑھ رہی ہے اور یہ مضبوط ہو کر ابھر رہے ہیں۔

جدید تعلیم اور ترقی کے نتیجے میں ذات پات ختم ہونے کے بجائے بڑھ رہی ہے اور ان کے اندر عصبیت بھی بڑھی ہے۔ اس کے تین وجوہات ہیں ایک اپنی ذات کی شناخت کے ساتھ اپنی حصہ داری حاصل کرنے کا جذبہ۔ دوسرے شادی بیاہ ابھی بھی 99.9% شادیاں ہندؤں میں اپنی ذات میں ہوتی ہے۔ ذات کے باہر شادی کرنے پر خاندان اور سماج اس کا مقاطعہ کر دیتا ہے۔ تیسرا سیاسی قوت اور استحکام حاصل کرنے کی غرض سے ذات پات کے Institution کو نئی قوت ملی ہے اس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ وہ جاتیاں جو بالکل گم نامی کی زندگی گذار رہی تھیں اور حاشیہ پر تھیں ان کے اندر بھی نئی جاگرتی آئی ہے اور وہ بھی خود کو سنگھٹت کر کے اپنا حق مانگنے کی جدو جہد کر رہی ہیں۔ ان سارے اندرونی تضادات اور کشمکش کے باوجود ہندو سنسکرتی مضبوط ہوئی ہے اور برہمنی دھرم کانڈ اور کرم کانڈ کا وستار ہوا ہے۔ کیونکہ تمام جاتیاں اس کو آئیڈیل مان کر اس کی پیروی کرتی ہیں۔

1911 کی مردم شماری کے مطابق ہندؤں کے چار ورنوں پر مشتمل 205 جاتیاں اور اُپ جاتیاں تھیں People for India project کے مطابق یہ تعداد 261 تھی جس میں ہندو جاتیوں کی تعداد 194 ہے (بحوالہ بہار میں سماجک پروی ورتن کے کچھ آیام پرشن کمار چودھری اشری کانت: وانی پرکاشن نئی دہلی۔ پرتھم سنسکرتی 1001 صفحہ 10)

آریہ سماج بہار میں کافی دنوں سے سرگرم ہے۔ 1878 میں داناپور میں اس کا ایک مرکز قائم ہوا پھر وہ تمام شہروں اور اضلاع میں پھیل گیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی چار دہائیوں تک وہ بہار میں سب سے سرگرم تنظیم تھی۔ آریہ سماج نے بہار میں (زنار تحریک) جنیور آندولن کے ذریعہ ہندؤں کے ان ذاتوں کو جو نچلی ذاتی سمجھی جاتی تھیں اور جس کو سرون ہندو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے

ان کوان کے برابرلانے کی کوشش کی۔ آریہ سماج کے خاص اصولوں میں ویدک دھرم کو پرتسٹھ کرنا ساستر اتھ اور شدھی کرن کے ذریعہ شدروں کو ہندو بنانا تھا۔ ہندوسماج کے اندر پاکھنڈ اور کوریتوں کا وردودھ کرنا ویدوں کا پرچار پرشار، برہمنوں کی اجارہ داری ختم کرنا، جاتی بھید ختم کرنا اس کے لئے جنیو آندولن چلانا وغیرہ مقاصد تھے۔ ہندو مانیتا کے مطابق ہر بچہ شودر پیدا ہوتا ہے اور اس وقت تک شودر رہتا ہے جب تک اس کا جنیو پہنا کر ویدک طریقے سے ناما کرن نہیں ہوجاتا ہے۔ ہر چیز برہمن او ربڑی ذات تک محدود تھی۔ آریہ سماج نے اس کو بیک وارڈ اور دلت ورگوں تک پہنچایا۔ اس کے لئے زبردست لڑائی ہوئی مگر بالآخر یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ اس نے ذات پات کو ختم تو نہیں کیا مگر سماج کو ایک روپ بنانے میں بہت مدد کی۔ ہندوسماج میں چھوت چھات، بیواؤں کی شادی۔ بال وواہ، پردہ سسٹم وغیرہ کو ختم کرنے کے لئے اندولن چلایا اور بہت سے اسکول اور یتیم خانے قائم کیئے۔ آریہ سماج کا اندولن اب ایک تعلیمی تحریک بن گیا ہے اور D.A.V. کے نام سے جس کا پورا نام دیانند اینگلو ویدک ہے 1992 میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد پورے بہار میں سینکروں کی تعداد میں اسکول اور کالج کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ ویدک سکچھا کا پرسار بھی ہوتا ہے اور اس کے واضح اثرات ہندو تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص نئی نسل میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔

بہار میں ایک طرف آزادی کی لڑائی کے لئے لوگ مجتمع ہو رہے تھے دوسری طرف مختلف ذاتوں کی تنظیمیں بن رہی تھیں اور پوری طرح سرگرم تھیں۔ تیسری طرف ذات پات سے اوپر اٹھ کر سماج سدھار کے اندولن چل رہے تھے۔ کانگریس ایک سیاسی پارٹی ہونے کے باوجود سماج سدھار بالخصوص تعلیم کے پھیلاؤ میں بہت سرگرم تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جو بھی ذات پر مبنی تنظیمیں اور تحریکیں تھیں وہ بھی تعلیم اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے سرگرم تھیں۔ انہیں میں ہندوسماج کو مضبوط کرنے اور ان میں اصلاح لانے کی کوشش بھی ہو رہی تھی۔ ان کاموں میں کبیر پنتھیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بالخصوص گاؤں کے سماجی نظام کو متاثر کیا۔

آزادی سے قبل بہار میں بیسویں صدی کی چوتھی دہای یعنی 1933 میں بڑی ذاتیوں کے ظلم سے بچنے اوران کا جواب دینے کی غرض سے کوئری کرمی اور دیگر پسماندہ ذاتوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم تری وینی سنگھ نام سے بنایا گیا شاہ آباد ضلع اس کا مرکز بنا دیکھتے دیکھتے اس نے

سیاسی شکل اختیار کر لی اس نے مذہبی استعماریت، سماجی استعماریت، سیاسی استعماریت اور معاشی استعماریت کے خلاف جدو جہد کی جس کے نتیجے میں قومی اندولن میں بڑی ذاتیوں کا قبضہ کچھ کم ہوا اور درمیانی اور نیچی ذاتوں کو بھی سماجی معاشی اور سیاسی حقوق حاصل کرنے میں مدد ملی۔

آزادی کے بعد بہار کی پوری سماجی اور سیاسی فضا بدل گئی۔ پھر ایک بار ستا کی جنگ شروع ہوئی۔

اس جنگ میں پہلی لڑائی بھومیہاروں اور راجپوتوں کے درمیان ہوئی۔ جس میں بھومیہار غالب رہے۔ بھومیہاروں کے بعد کائستھ اور برہمن اس جنگ میں آگے آئے۔ ستر کی دہائی میں سوشلسٹ موومنٹ کے تحت بیک وارڈ کمیونیٹز کو گول بند کرنے کا عمل شروع ہوا اور ووٹ ہمارا راج تمہارا نہیں چلے گا نہیں چلے گا اور پچھڑا مانگے سو میں ساٹھ کے ذریعہ بیک وارڈ کمیونیٹی کے اقتدار کا بگل بجنے لگا۔ غیر کانگریس واد کے پیچھے اس تحریک کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ہم نے اپنے ہوش میں تین بڑے آندولن دیکھے ہیں۔ ایک جے پی کا اندولن، دوسرا ریزرویشن اور تیسرا رام جنم بھومی اندولن پہلے دو اندولن کے نتیجے میں بہار سمیت پورے اتر بھارت میں بیک وارڈ بالخصوص یادووں کا زور واثر بڑھا اور وہ اقتدار پر قابض ہو گئے تیسرے اندولن کے نتیجے میں بی جے پی کی سیاسی حیثیت بڑھی اور وہ کہیں ازخود اور کہیں کولیش کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہو گئے۔ جے پی اور ریزرویشن موومنٹ میں مسلمانوں کو ساتھ لانے کی کوشش کی گئی جبکہ رام جنم بھومی کی تحریک ان کے خلاف تھی اس اعتبار سے ہندو ذاتوں کو گولبند کرنے کا موقع ملا۔ لہذا رام جنم بھومی اندولن ایک سیاسی اندولن تھا جس کا مذہبی اور جذباتی پہلو تھا اس نے ہندو سماج کو ایک جوٹ کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں ریزرویشن کے دنوں میں لگی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ 1990 کی دہائی میں بہار میں بالخصوص وسط بہار یعنی پٹنہ، جہان آباد، نالندہ گیا وغیرہ اضلاع میں مالے، نکسل واد اور ماؤواد نے زور پکڑا اور اس کے نتیجے میں ابھری ورگ سنگھرش نے بنیادی طور پر دلت اور سرون کے بیچ تھا وہ بڑے کسان اور کھتیہر مزدور کے بیچ کا سنگھرش بن کر ابھرا جس نے کئی غیر ریاستی سیناؤں کو جنم دیا اس میں بھومیہاروں کی رنبیر سینا، کرمیوں کی لورک سینا یادوں کی سینا سن لائٹ سینا سامنے آئی، جن کے درمیان خونی جھڑپیں ہوئیں اور دلتوں کی بستیوں کی بستیاں جلائی گئیں اور ان کے سینکڑوں عورتوں بچوں،

بوڑھوں اورنوجوانوں کوموت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔رنبیر سینا کا سربراہ رامیشور مکھیا ابھی حال میں ہی مارا گیا ہے جس کے نتیجے میں آرہ، پٹنہ وغیرہ میں ان کے لوگوں نے حکومت کو اس قدر مفلوج کردیا تھا کہ گویا بہار میں قانون کی حکومت چند دنوں کے لئے ختم ہوگئی تھی۔

بہار میں اس وقت فرقہ وارانہ اور سماجی لحاظ سے شانتی ہے۔اس وقت ایک نیا سماجک اورراجنیتک سمیکرن بن رہا ہے۔فورورڈ قوت نتیش حکومت کے زیرانتظام اپنی Proxy حکومت چلا رہی ہے اورعددی اعتبار سے دوسرے درجہ کی حیثت میں رہنے پر بظاہر راضی ہے مگر پردے کے پیچھے سے وہ اپنی گروہی مفادکو مستحکم کرنے میں لگی ہے۔دوسری طرف پچھڑا اور مہادلت جاتیوں کو جوڑ کرایک نیا سماجک اورراجنیتک سمیکرن بنایا جارہا ہے۔ لالو یادو اپنی کھوئی زمین حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔کانگریس بھی ہاتھ پاؤں ماررہی ہے مگر اصل لڑائی اس وقت نتیش ، لالو، پاسوان اورمودی کے درمیان ہے اس کا مطلب بیک وارڈ اوردلت اقتدار کے مرکز میں ہیں دیگر ذاتیں اپنے اپنے مفادات کے تحت ان کے پیچھے ہیں۔

میرے علم کی حد تک اس وقت بہار میں کوئی قابل ذکر آندولن نہیں چل رہا ہے۔تاہم بہار میں مختلف تنظیمیں اپنے سماجی ، ثقافتی مذہبی سیاسی اور معاشی ایجنڈے کے تحت کام کررہی ہیں۔ یہ سب اپنی فطرت میں پین انڈیا ارگنائزیشن ہیں مگر بہار میں ان کی مضبوط موجودگی دیکھی جارہی ہے۔تنظیموں کی کارکردگیوں اور اثرات کا اندازہ لگانا فی الوقت مشکل ہے ۔ اس لئے میں یہاں صرف ان کے نام گنوا کر اورکچھ ابھرے ایجنڈے پر بات کرکے اس مضمون کرختم کروں گا۔

سب سے پہلے سنگھ پریوار کی تنظیمیں ہیں جن میں آر اس اس کے علاوبجرنگ دل ، وشو ہند پریشد، درگا واہنی،اے بی وی پی قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ آریہ سماج،رام کرشن مشن، ستیہ سائیں بابا ،مہاویر ٹرسٹ ،مونگیر یوگ سنستھان ،گائتری سماج ، گئو رکھچا اندولن ، کبیر پنتھی ، ٹھاکر انوکول چند، جئے گرودیو،نرکاری اندولن ،رجنیش کی اوشوتحریک ،مہاویرسواسنستھان ،جین دھرم والوں کی تنظیم ، بودھ دردشن ، مارواری سواسنتھان اور یوا منچ بابا امئے گروپ ، بن باسی سیوا اندولن ، برہم رشی سماج ، مہارانہ پرتاب اورویرکنورسنگھٹن ، باما ساہ سماج ، چترگپت سماج ، وشو سماج ، دلت اتھان

اندولن، بھارت سیوا شرم سنگھ، بھارت سیوک سماج، بنگالی چتنا پنچ، پتا نجلی یوگ پیٹھ اور شری شری روی شنکر کی آرٹ آف لیونگ، اداسین سمپر دائے۔ پرجا پتا برہما کماری آشرم اس کے علاوہ مراری باپو، آسا رام باپو اور بہت سے یوگ پیٹھ کے دھرم گرو اپنے اپنے اثرات کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ان تمام تنظیموں میں لاکھوں ہندو سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور دل کھول کر چندہ دیتے ہیں لہٰذ اا یک مٹھ، بیٹھ اور گروؤں کے پاس اربوں کی دولت ہے۔ ہندو سماج میں جاگرتی پیدا کرنے کے لئے مختلف تنظیموں کے ذریعہ چلائے جا رہے مذہبی ٹی وی چینلس بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس وقت ہندو سماج میں تعلیم اور ناری اتھان پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔ ہندوؤں میں اس وقت دو متوازن تحریکیں چل رہی ہیں ایک ذات ادھارت تنظیمیں ہیں جن کا مقصد اپنی ذات کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سیاسی معاشی مراعات دلا کر ان کے سماجی ترقی کو مستحکم کرنا ہے۔ اور دوسری طرف ذات توڑ و سماج جوڑو کی تحریک ہے جس کی کمان سنگھ پریوار کے ہاتھ میں ہے جس کا مقصد ہندو تہذیب اور ثقافت کو غالب کر کے بھارت کو ہندو راشٹر بنانا ہے۔

آزادی کے بعد بہار کو جو سیاسی قیادت ملی ہے وہ نہ صرف ذات پات کو بڑھانے والی تھی بلکہ اس کی سوچ محدود تھی اس نے جوراج تنتر بنایا اور جو بیورو کریسی سامنے آئی اس نے انگریزوں کی طرح حکومت کی اور اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی جس کے نتیجے میں کمزور طبقات کا استحصال اور ان کے ساتھ ناانصافی اسی طرح قائم رہی اور ریاست کی ترقی کی رفتار سست رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ بھرشٹا چار، کام چوری، خودغرضی، چور بازاری، کالا بازاری ملاوٹ، جمع خوری، رشوت خوری وغیرہ کو فروغ حاصل ہوا، قانون کی حکمرانی اور انصاف عنقا ہونے لگا اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی حکمرانی کو تقویت ملی۔ حکومت فورورڈ کی ہو یا بیک وارڈ کی کم وبیش ایک جیسی صورتحال پائی جاتی ہے اس وقت ریاست کے طول وعرض پر جرائم پیشہ لوگ پوری قوت کے ساتھ براجمان ہیں۔

ایسی صورت میں ایک نئے بہار کا سپنا دیوانے کا خواب لگتا ہے۔ مگر بہار کی نئی نسل جوش اور ذہانت سے بھری ہے اگر اس کو صحیح قیادت مل جائے تو بہار کو بہت آگے لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے اخیر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تمام تر خرابیوں کے باوجود ہندوؤں کی سیاسی اور ثقافتی قیادت

زیادہ سمجھدار ، بالغ نظر اور Pragmatic ہے جب کہ مسلم قیادت اس کے مقابلے میں سطحی، جذباتی اور بہت کمزور ہے۔اس لئے ہندوؤں کی سماجی حالات،، مسلمانوں کے مقابلے بہتر ہےاور وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں اس میں جدید تعلیم کا اہم رول ہے۔

اس وقت ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی تنظیموں جن میں مٹھ اور آشرم سب شامل ہیں کا خاص مقصد ہندوؤں میں احساس کمتری کم کرنا، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا، انسانی وسائل کو مجتمع کرنا اور فروغ دینا ہے۔ ایسی ریتی رواجوں سے چھٹکارا حاصل کرنا جو فرد اور سماج کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اندھ وشواس کم کرنا، ہندو مذہبی اقدار اور اس کے دھرم کا نڈا اور کرم کانڈ کو مقبول بنانا، ہندو کلچر اور روایات کو مشتہر اور مقبول بنانا ،عیسائی مشینریوں کی طرح تعلیم صحت اور آفات ارضی اور سماوی کے وقت ریلیف اور باز آبادکاری کرنا خدمت خلق کے جامع منصوبے کے تحت اسکول، اسپتال، اناتھالیہ، ودھوا آشرم، وردھا آشرم مختلف موذی امراض میں مبتلا لوگوں جیسے جزام، کینسر اور نا قابل علاج امراض کے مریضوں کی دیکھ بھال کے مراکز قائم کرنا، وید، گیتا، رامائن جیسی مذہبی کتابوں کے پرچار پر زور دینا اس کے لئے تمام ذرائع ابلاغ استعمال کرنا ،فلموں اور ٹی وی سیریل کے ذریعہ اور سماجی اقدار اعمال کو لوگوں تک پرکشش اور آرٹسٹکس طریقے سے پہنچانا۔ آرٹ ، کلچر، ناچ گانا اور دیگر ذرایعوں سے نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچنا ۔مغربی اقدار، تعلیم اور ٹکنولوجی سے تال میل پیدا کرتے ہوئے معاشری ترقی کو ترجیح دینا اور خود کو ایک مقبول عام غالب کلچر بنانے کی کوشش کرنا جس میں یہ لوگ فی الوقت بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

جدید ہندو سماج کا غیر جذباتی تجزیاتی اور معروضی مطالعہ نہ صرف اس سماج کو صحیح طریقے سے سمجھنے میں مددگار رہوگا بلکہ اس سے ربط پیدا کرنے میں بھی مددگار رہوگا جو میرے خیال میں وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اسلام کی ترسیل کے ذرائع اور اس کی اہمیت

ترسیل اور ابلاغ کی اہمیت

ہر فکر جس کے پاس دنیا کو دینے کے لئے کچھ ہے۔ وہ اپنی اشاعت کے لئے ترسیل وابلاغ چاہتا ہے عہد جدید میں سائنس اور ٹکنولوجی کی بیش بہا ترقی کے سبب نہ صرف ترسیل وابلاغ آسان ہو گیا ہے بلکہ زمان ومکان کی حد بندیاں ختم ہو گئی ہیں۔ دوری اور دیری کا تصور فرسودہ ہو گیا ہے۔ اس لئے کوئی فکر اگر کسی وسیع خطے میں بیک وقت پہنچنا چاہتی ہے تو اسے جدید وسائل وذرائع کا استعمال کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا از بسکہ ضروری ہوگا۔ مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ابلاغ کے قدیم اور روائتی طریقے فرسودہ اور بے اثر ہو گئے ہیں۔ ایسا سوچنا اور ماننا صحیح نہیں ہے۔ انسان نے چاہے جتنی بھی تیز رفتار سواری ایجاد کر لی ہو مگر دو قدموں پر چلنے کی افادیت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس لئے ابلاغ کے روائتی ذریعوں کا معروضی مطالعہ ضروری ہے کیونکہ تاثر اور اثر پذیری میں آج بھی یہ ذرائع مروجہ سائنسی ذرائعوں سے کہیں زیادہ مفید اور موثر ہیں۔ تبدیلئ فکر، اصلاح ذات، تعمیر فکر، تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق میں اس کی اثر پذیری وقت کی کسوٹی پر کھری اتری ہے۔ اس لئے صرف ترسیل نہیں اگر تبدیلی مطمح نظر ہو تو لامحالہ ہمیں ان ذرائعوں کا بہتر استعمال نہ صرف سیکھنا ہوگا بلکہ اس کو وسعت وہمہ گیری عطا کرنی ہوگی۔ اس تمہید کے ساتھ اگر ہم سیرت کی محفلوں اور مجلسوں کا جائزہ لیں تو ایک نئی دنیا کی کھوج کی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم وسعت نظری کا ثبوت دیں۔

میلاد کی مجلس اور سیرت کے جلسے کا سہی استعمال

سیرت کے جلسے اور میلاد کی مجلسیں بالخصوص برصغیر ہند و پاک میں مسلم او راسلامی تہذیب کی علامت بن گئے ہیں۔ مسلمانوں کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی بھی جہاں ہے یعنی دس بیس گھر مسلمان آباد ہیں تو وہاں ہر خوشی اور غم کے موقع پر میلاد کی مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہے یا سیرت کے جلسے ہوتے ہیں جہاں کثرت سے حضورؐ کا ذکر ہوتا ہے اور آپ پر درود وسلام بھیجے جاتے ہیں۔

یہ ایک زبردست ادارہ ہے جس کے ذریعہ بہت سے کام کئے جاسکتے ہیں مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایک اچھاادارہ مسلکی اختلاف کا مرکز بن گیا ہے جس نے مسلمانوں میں مستقل اختلاف ونزاع اکی صورتحال پیدا کردی ہےاور یہ چیز ملت میں بہت سی خرابیوں کا چوردروازہ بن گیا ہے۔

اللہ کے رسول ہی دین ہیں۔اقبال نے کہا بمصطفیٰ برساں خویش کے دین ہما اوست لہذا آپ پر ایمان، آپ کا احترام، آپ سے محبت اور آپ کی اطاعت کے بغیر کوئی شخص مومن ومسلم نہیں ہوسکتا۔اس لئے یہ مسئلہ امت کے کسی طبقے میں کبھی نزاعی رہا ہی نہیں ہے۔بعض لوگوں نے احترام اور محبت کے کچھ خودساختہ علامتیں وضع کر لی ہیں جس کو وہ احترام ومحبت کا پیمانہ مانتے ہیں اور اگر کوئی شخص ان علامتی چیزوں کو تسلیم نہیں کرتا تو اسے منکر ناموس رسالت قرار دے کر لعن طعن کرتے ہیں۔یہ صحیح بات نہیں ہے۔قرآن وحدیث نے احترام ومحبت کا معیار متعین کردیا ہے ہمیں اس کی پابندی کرنی چاہئے۔غلواور تشدد چاہے جس جانب ہو غلط ہے۔لہذا فروعات سے اوپر اٹھ کر مقصد کو سامنے رکھ کر ان مجالس کا اہتمام والتزام بہت سارے فیوض وبرکات کا شاہ دروازہ کھول سکتا ہے۔اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان اداروں میں جو منفی عوامل گھس گئے ہیں جس نے ان کی افادیت کو زائل کردیا ہے۔ان کو پورے شعور اور سنجیدگی کے ساتھ دور کرنے کا اہتمام کریں اور ان کی جگہ مثبت عوامل کو بروئے کار آنے کا موقع دیں۔

حضوؐر نبی پاک ﷺ آدم کے گھرانے کے سب سے ممتاز فرد ہیں۔جامیؔ نے اس سلسلے میں حرف آخر کہہ دیا ہے بعد خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔اب اس کے بعد اور باقی کیا رہ جاتا ہے جس کو کہنے اور سننے کی گنجائش ہے اور اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے۔مجھے نہیں معلوم امت کا کوئی فرد بھی اس حقیقت سے انکار کرتا ہے۔جو اس بدیہی حقیقت کا انکاری ہے وہ ظالم اور جاہل ہے جو مقام محمدؐ سے ناآشنا ہے۔

اس لئے حضوؐر کی ذات کو موضوع بحث بنانے کے بجائے آپ کی دعوت وسنت کو گفتگو کا موضوع بنایا جائے تو بہتر ہوگا۔اللہ کے رسولؐ ساری دنیا کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں آپ کی دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے آپ سارے جہاں کے لئے رحمت ہیں۔یہ بات نہ صرف وہ لوگ نہیں جانتے جو آپ کی شخصیت اور دعوت سے واقف نہیں بلکہ وہ لوگ بھی اس بات کو اس طرح

نہیں سمجھتے جو آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمارے بہت سے واعظین جو اپنی تقریروں میں ان آیتوں کا برملا حوالہ دیتے ہیں وہ بھی اس کی روح سے نا آشنا ہیں اور اپنے شعور وتحت الشعور میں یہ مانتے ہیں کہ حضوؐر صرف مسلمانوں کے نبی ہیں۔ جب کہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ حضوؐر کی نبوت سورج، چاند، ہوا اور پانی کی طرح تمام انسانوں کے لئے عام ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک شخص اس کو مانتا ہے اور دوسرا نہیں مانتا۔ اب یہ ماننے والے کی ذمہ داری ہے کہ حضوؐر کی دعوت وسنت جو آپ کا اسوہ ہے اس کو اپنی عملی زندگی میں اتارے اور اس کی قولی اور عملی شہادت ان تمام لوگوں تک پیش کرے جو ناواقفیت، جہالت غلط فہمی یا غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے حقیقت تک رسائی نہیں پاسکتے ہیں۔ یہ دعوت حکمت کے ساتھ، اچھے پیرائے میں۔ پرسوز طریقے سے اور مدلل انداز میں دی جائے گی تا کہ ذہن ودل دونوں کو اپیل کرے۔ اس کام میں جبر کی نہیں صبر کی ضرورت ہے۔ اور اس وقت تک بات واضح کرتے رہنا ہے جب تک حق پوری طرح روشن اور متحقق نہ ہو جائے اسی کو تذکیر کہتے ہیں۔

مسجد کی اہمیت

اللہ تعلیٰ نے مسلمانوں کو بعض ایسے ادارے عنائت کئے ہیں جس کا اگر صحیح استعمال کیا جائے تو ایک زبردست شعوری انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ مسجد مسلمان معاشرہ کا سب سے مضبوط، ہمہ جہت اور مقدس سماجی ادارہ ہے جہاں پانچ وقت لوگ روزانہ نماز ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جس سماج میں ہر طبقہ کا ہر روز اتنا زبردست سماجی انٹرایکشن ہوتا ہے، اس کو اگر تعلیمی اور تعمیری رخ دیا جائے اور صحیح معنوں میں سماجی بیداری کا ذریعہ بنایا جائے تو وہ کس طرح پورے معاشرے کی اصلاح وتربیت، تہذیب وتزکیہ اور تعمیر وترقی میں معاون ہوسکتا ہے وہ دیکھنے اور پرکھنے کی چیز ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی پانچ دس فیصد مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ یہ تعداد بھی کسی بڑی سماجی تبدیلی کے لئے کافی ہے بشرطیکہ اس ادارے کا شعوری اور تعمیری استعمال کیا جائے۔

جمعہ کی اہمیت

ہر مذہب میں ہفتہ کا ایک دن خاص عبادات کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہودیوں کے

یہاں سنیچر یعنی سبت کا دن،عیسائیوں کے یہاں اتوار کا دن ۔جینیوں کے یہاں منگل کا دن، اسی طرح ہندوؤں اور دیگر لوگوں کے یہاں ہفتہ کا کوئی اور دن خاص ہوتا ہے۔مگر جس کسی کے یہاں بھی جو دن ہے اس کے اعمال میں رسوم وعبادات کا اہتمام تو ہے مگر تعلیم ،تبلیغ اور تذکیر کا اہتمام نہیں ہوتا۔ جبکہ مسلمانوں کے یہاں جمعہ کا دن بہت خاص ہے۔ جمعہ کو ہفتے کی عید کہتے ہیں۔ اس دن تمام مسلمانوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر شہر یا گاؤں کی بڑی مسجد میں جمع ہوں۔ پنج وقتہ نماز تو تمام چھوٹی بڑی مسجد میں ہوتی ہے مگر جمعہ کی نماز بڑی مسجد میں جہاں زیادہ بڑا اجتماع ممکن ہے وہاں پڑھنے کی ہدایت ہے اس کے ذریعہ ایک علاقہ کے تمام لوگوں کو اکٹھا ہونے کا موقع ملتا ہے جس سے چھوٹی چھوٹی آبادیوں کی جانکاری اور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔شہر اور دیہات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔اس موقع پر صرف نماز ہی ادا نہیں کی جاتی بلکہ جو چیز جمعہ کو اہم بناتی ہے وہ نماز سے پہلے کا خطبہ ہوتا ہے۔ظہر کی نماز چار رکعت ہے جبکہ جمعہ کی نماز دو رکعت ہوتی ہے۔لہذا خطبہ کی اہمیت دو رکعت نماز کے برابر ہے۔اس طرح خطبہ سننا اسی طرح واجب ہے جس طرح نماز میں شریک ہونا۔خطبہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تعلیم، تذکیر کے علاوہ وقت اور حالات کے مطابق ضروری ہدایتیں بھی دی جاتی ہیں اور اصلاح وتربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے ہمارے یہاں روایت پرستی کے تحت خطبہ زیادہ تر عربی میں دیا جاتا ہے جس کو سامعین بالکل نہیں سمجھتے جس سے خطبہ کی معنویت کم ہو جاتی ہے۔حمد وثنا درود وسلام کے علاوہ خطبہ مخاطب کی زبان اور مروجہ محاورات واستعارات میں دینا چاہئے تاکہ خطبہ کا مقصد پورا ہو۔پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام پانچ دس فیصد سے زیادہ لوگ نہیں کرتے مگر جمعہ کی نماز چالیس پچاس فیصد مسلمان پڑھتے ہیں۔رمضان کے دنوں میں یہ تعداد ساٹھ ستر فیصد تک ہو جاتی ہے اس لئے جمعہ کے ادارے کا اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو بڑی آسانی سے کوئی پیغام ساٹھ فیصد آبادی تک ایک دن اور ایک وقت میں پہنچائی جاسکتی ہے ۔مگر ہم اتنے بڑے ادارے کا بھی صحیح ڈھنگ سے استعمال نہیں کر پا رہے ہیں جس کی وجہ سے اتنا اہم ادارہ اپنے مقصد اور معنویت کے اعتبار سے کوئی سماجی تبدیلی لانے میں ناکام ہے۔

مسجد میں عورتوں کی آمد کا مسئلہ

مسلمانوں میں ایک بحث ابھی چل رہی ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے اور جماعت میں شریک ہونے کی اجازت دی جانی چاہئے یا نہیں۔ شافعی اور اہل حدیث حضرات کے یہاں مسلکی طور پر اس کی اجازت ہے جبکہ حنفی لوگ اس کے حق میں نہیں ہیں۔ عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے تاہم حالات اور زمانہ کے بگاڑ کی وجہ سے لوگ فتنہ کے اندیشے سے اس کی اجازت دینے سے گریز کرتے ہیں۔ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب عورتیں اسکول کالج، آفس، بازار، کلب اور سنیما ہال میں جاسکتی ہیں تو مسجد میں جانے سے روکنا کہاں تک صحیح ہے۔ روکنا صحیح یا غلط اس سے قطع نظر مسجد ان تمام اداروں سے مختلف ہے جس کے تقدس کا تقاضہ ہے کہ اس کی کھلے عام اجازت نہ دی جائے۔

تاہم اگر حالات پر امن ہوں۔ گھر اور ناموس کی حفاظت یقینی ہو تو جمعہ اور عیدین کے موقع پر عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اسلام کے احکامات جتنے مردوں پر عائد ہوتے ہیں اتنے ہی عورتوں پر عائد ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی عورتوں کو تمام اسلامی کاموں میں تو مقید کر رکھا ہے جبکہ تمام غیر اسلامی کاموں کے لئے وہ آزاد ہیں۔ اس لئے مسلمانوں میں عورتوں میں بے دینی مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے کیونکہ ان کی دینی تعلیم وتربیت کا اس طرح اہتمام نہیں ہوتا جس طرح مردوں کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گھروں میں دین کے نام پر ہر طرح کی روایت پرستی، دقیانوسیت، بدعات وخرافات پائی جاتی ہیں۔ ہماری عورتیں حالات وزمانہ سے بالکل ناواقف ہوتی ہیں ان کے عقل وذہن پر تالے لگے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت، گھر کی اصلاح معاشرے کی بہتری اور ملی امور میں اس طرح حصہ نہیں لے پاتیں جس طرح لینا چاہئے ہم نے آدھی آبادی کو عضو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے ظاہری بات ہے اس صورت میں قوم کی پوری ترقی نہیں ہوسکتی کیونکہ جس قوم کی آدھی آبادی قومی تعمیر میں کوئی اہم کردار ادا نہ کر رہی ہو وہ قوم سو فیصد ترقی کی صورت میں بھی پچاس فیصد ہی ترقی کر پائے گی کیونکہ پچاس فیصد کا کوئی استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ جمعہ کی نماز

میں عورتوں کو بھی شامل ہونے کا موقع دیا جانا چاہئے۔لیکن اس سے پہلے جمعہ کے ادارے کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

عیدین کی اہمیت

اللہ تعلٰی نے مسلمانوں کو دو عید دیا ہے جس میں ۹۹ فیصد مسلمان شریک ہوتے ہیں۔یہ نماز بھی دو رکعت ہوتی ہے۔اس نماز میں بھی خطبہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس کی حیثیت قومی سالانہ اجتماع کی ہے اگر اس کو اس طور پر منایا جائے اور قوم کا سالانہ منصوبہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور پھر اس کو سال بھر پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے تو اس سے کتنا بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔مگر جیسا اقبال نے کہا۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے
یہ امت روایات میں کھو گئی ہے

اس وقت ساری چیزوں کی ماہیت بدل چکی ہے جسم ہے روح نکل چکی ہے۔اس لئے یہ ادارے مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں اور اب کوئی یہ سمجھنے اور ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہے کہ ان اداروں کا ملی تعلیم،تربیت،اصلاح،تعمیر اور ترقی میں کوئی رول ہو سکتا ہے ہمیں اس کے لئے نئے سرے سے امت کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی اور ان اداروں کو مؤثر بنا کر ان کو ملی اصلاح و تعمیر کا ذریعہ بنانا ہوگا۔ورنہ اس کفران نعمت کے پاداش سے ہم بچ نہیں سکتے۔لہذا ضرورت اس کے خلاف فتویٰ بازی کی نہیں ہے بلکہ ضرورت ان اداروں کو بہتر استعمال کی ہے ملت کے تمام باشعور اور سمجھدار لوگوں کو بالخصوص علمائے کرام کو اس جانب توجہ دینی چاہئے اور مسلکی حد بندیوں سے باہر نکل کر ان اداروں کے تعمیری استعمال کی مشق شروع کرنی چاہئے۔

ہفتہ واری اجتماع

اس طرح میلاد کی مجلسیں،سیرت کے جلسے،جمعہ اور عیدین کے خطبہ کے علاوہ اگر ہم ہر بستی اور محلے میں عورتوں،بچوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اور ایک ساتھ جہاں جیسی گنجائش ہو ہفتہ واری اجتماع کا اہتمام کریں جہاں قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی جائے، حدیث اور

سیرت رسول کا مطالعہ کیا جائے اور مسلمانوں میں اخلاق اور اتحاد پر زور دیا جائے تو اصلاح حال میں بہت مدد ملے گی۔

ہفتہ واری گشت

اسی طرح اپنے محلے اور بستی میں گشت لگا کر ہفتہ میں کم از کم ایک روز انفرادی اور اجتماعی ملاقات کا پروگرام بنایا جائے اور اس میں لوگوں کو آسان اور عام فہم زبان میں جو اسلامی لٹریچر موجود ہے اس کو پڑھنے کے لئے دیا جائے تو اس سے بھی دینی معلومات کی ترسیل میں مدد ملے گی اور اتحاد واجتماعیت کی فضا پیدا ہوگی۔

جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال

ان طریقوں کے علاوہ ہم اگر انٹرنیٹ، واٹسپ، انسٹرا گرام۔لنکڈ، یوٹوب، فیس بک اور جو دیگر جدید ذرائع ہیں ان کو ترسیل وتعلیم دین کے لئے مثبت طور پر استعمال کرنا سیکھ لیں تو ربط وتعلق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی آبادی تک بغیر وہاں تک جائے ہوئے ان تک دین کا پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہمیں ترسیل دین کے لئے روایتی اور جدید جو بھی ذرائع میسر ہیں ان کا بیش از بیش استعمال کرتے ہوئے کم وقت میں زیادہ بڑی آبادی تک پہنچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔یہ وقت کی ضرورت اور دین کا مطالبہ بھی ہے۔